COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

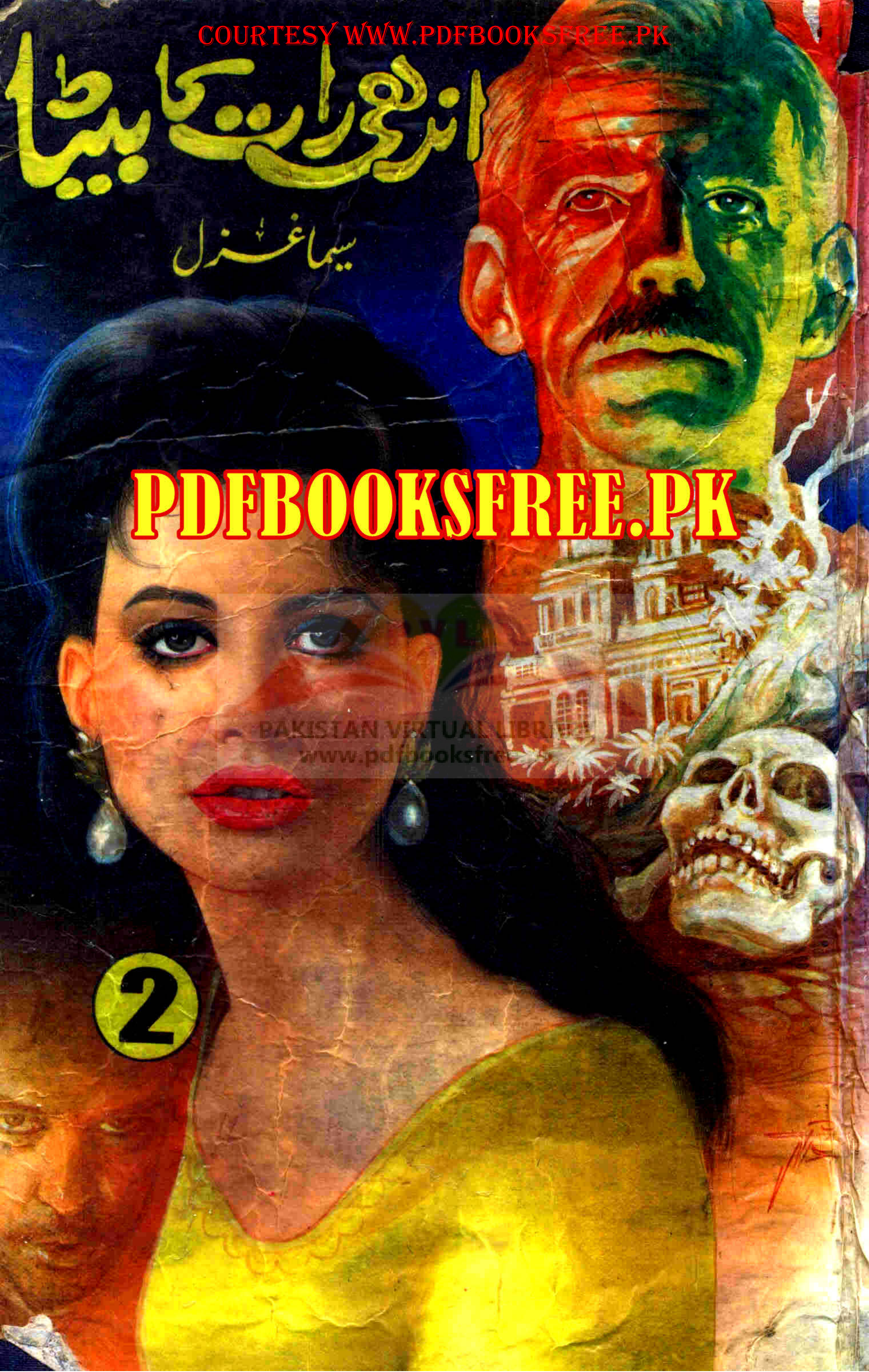

PDFBOOKSFREE.PK
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بار اوّل ——— ۱۹۹۹ء
مطبع ——— یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ——— ہاشمی کمپوزنگ سنٹر، لاہور
قیمت ——— ۱۵۰/- روپے

ISBN 969-8429-51-4

اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال
لاہور فون: ۷۲۲۳۸۵۳

فاریہ جلدی سے سیڑھیاں اتر گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی باہر چلا آیا۔ میں بے حد کنفیوز تھا۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں نے خاموشی سے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔ فاریہ بھی بیٹھ گئی میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گاڑی کا رخ اسپتال کی جانب موڑ لیا۔ آدھے سے زیادہ راستہ خاموشی میں کٹ گیا۔ شاید فاریہ بھی محسوس کر رہی تھی کہ سب کچھ غلط ہو گیا ہے مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اس کا بھی اسے احساس تھا ورنہ وہ ایسی تو نہ تھی کہ ایسے موقع پر خود غرضی دکھاتی۔ میں عجیب سی حالت میں تھا' بولنا چاہتا تھا مگر حلق خشک ہو رہا تھا۔

"اقبال.......... تم.......... تمہیں نہیں آنا چاہیے تھا۔" کچھ دیر بعد فاریہ نے کہا۔

اس کا لہجہ بھیگا ہوا سا محسوس ہوا۔

میں کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ "نہیں میڈم ایسی کوئی بات نہیں۔"

"یا پھر تم اسے اپنے ساتھ لے آتے۔ کوٹھی بہت بڑی ہے اقبال اور وہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ تم ماسی میراں اور سوہنی دونوں کو وہیں لے آؤ۔"

"جی میڈم مگر اس وقت سلطان نہیں مانتا۔ وہ جس اپنائیت سے مجھ سے ناراض ہوتا ہے یا میرے رشتے داروں کا خیال رکھتا ہے' اس سے کچھ کہنا مجھے مشکل لگتا ہے۔ میں پھر کسی وقت آ کر اسے منا لوں گا' مگر میڈم اب میں زیادہ برداشت نہیں کر سکتا مجھے گاؤں جانا ہو گا میڈم' جلد.......... بہت جلد' میں راجو اور اس کے خاندان کو بالکل اسی طرح تباہ کر دوں گا جس طرح اس نے میرا خاندان تباہ کیا ہے۔"

"اقبال' سچ کہتی ہوں' میں اس وقت خود کو تمہاری مجرم محسوس کر رہی ہوں' اگر میں نے پہلے ہی تمہیں جانے دیا ہوتا یا میں چلی گئی ہوتی تو شاید سوہنی اس حال کو نہ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

پہنچتی۔"

"میڈم ہماری قسمت خراب ہے' ہم جتنا خود کو دکھوں کی دلدل سے نکالنے کو ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اتنا ہی اس دلدل میں دھنستے چلے جاتے ہیں۔ اس میں آپ کا قصور نہیں ہے۔"

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ سر جھکائے اپنے ہاتھوں کے ناخن کریدتی رہی۔ گاڑی میں ایک گہرا سناٹا چھا گیا ہم میں اور اسپتال میں فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے ذہن سے تمام سوچوں کو جھٹکنے کی کوشش کی۔ میں نے گاڑی اسپتال کے گیٹ سے اندر لے جا کر سیڑھیوں کے پاس روکی۔ فاریہ دروازہ کھول کر اتر گئی اور میں گاڑی کو آگے بڑھا لے گیا۔ میں نے ایک درخت کے نیچے گاڑی پارک کی اور اسے لاک کر کے خود بھی وہیں پہنچ گیا جہاں فاریہ کھڑی میرے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ہم دونوں سیڑھیاں عبور کر کے اس منزل پر پہنچ گئے جہاں آپریشن تھیٹر تھے اور جہاں ایک آپریشن تھیٹر میں زاریہ کا آپریشن ہو رہا تھا۔

آپریشن تھیٹر کے دروازے کے اوپر سرخ بلب جل رہا تھا اس کا مطلب تھا کہ آپریشن ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ نہ معلوم کیوں میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں ایک کھلی کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور کھڑکی سے نظر آنے والے بیکراں آسمان کو تکنے لگا۔ فاریہ وہاں پڑی ایک کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ ہم سے کچھ فاصلے پر مزید کچھ لوگ کھڑے تھے' ان کی نگاہیں بھی ایک آپریشن تھیٹر کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔

اچانک اس آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا جہاں زاریہ کو لے جایا گیا تھا۔ ڈاکٹر طارق کا چہرہ نظر آتے ہی میں اور فاریہ ایک ساتھ اس کی طرف بڑھے۔ ڈاکٹر طارق کے ہاتھ میں ایک پرچہ تھا جسے اس نے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اقبال صاحب' یہ دو انجکشن اور خون کی بوتل فوراً لے آئیں' خون آپ کو اسپتال کے بلڈ بنک سے مل جائے گا اور انجکشن شاید اسپتال کے باہر سڑک کے دوسری جانب ثنا میڈیکل سٹور پر مل جائیں۔"

میں پرچہ لے کر تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ فاریہ شاید اس سے زاریہ کے متعلق پوچھنے لگی تھی۔ میں نے ڈاکٹر طارق کا جواب سننے کی کوشش نہیں کی' کیوں کہ میں جانتا تھا کہ لمحہ بھر کی دیر کسی بھی مصیبت کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ میں سیدھا بلڈ

بنک گیا' وہاں سے میں نے پرچے پر لکھے ہوئے گروپ کا خون لیا اور اس میڈیکل اسٹور کی طرف بڑھ گیا جہاں سے وہ انجکشن مل سکتے تھے۔ میں نے کیمسٹ کی طرف پرچہ بڑھا دیا اور جیب سے پیسے نکالنے لگا۔

"یہ ٹیبلٹس ہوں گی آپ کے پاس۔"

اچانک ایک مترنم آواز نے مجھے نگاہ اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ میں نے کن انکھیوں سے بولنے والی کی طرف دیکھا۔ وہ بلاشبہ حسین ترین لڑکی تھی اور ایک نسخہ تھامے کیمسٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر میری نگاہ اس کے خوب صورت ہاتھوں پر ٹھہر گئی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر اس شوکیس پر ٹکایا ہوا تھا جہاں کیمسٹ نے میرے مطلوبہ انجکشن رکھے تھے' بس لمحہ بھر کو میری نگاہ اس کے خوب صورت ہاتھوں پر پڑی' گوری اور مخروطی انگلیوں میں خوب صورت انگوٹھیاں اور بڑھے ہوئے ناخنوں پر سرخ رنگ کی نیل پالش اسے مزید خوب صورت بنا رہی تھی۔

"یہ انجکشن جناب" کیمسٹ کی آواز سے میں چونک اٹھا اور میں نے دونوں انجکشن اٹھا لیے۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ جیسے میرے ذہن میں کہیں کانٹا سا چبھ گیا ہے۔ اس لڑکی کی شخصیت میں اچانک ہی کچھ عجیب سی بات محسوس ہوئی تھی۔ جسے میں کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔ اسی الجھن میں' میں نے پیسے ادا کیے اور انجکشن لیے تیزی سے اسپتال کی طرف بڑھ گیا۔ اسپتال کی طرف جاتے ہوئے بھی کوئی مجھے اندر سے دبوچ رہا تھا اور مجھے پلٹ جانے پر مجبور کر رہا تھا مگر یہ وقت ایسا نہ تھا کہ میں اسے یہاں اپنی الجھی ہوئی سوچوں کو سلجھانے میں ضائع کرتا۔ ڈاکٹر طارق نے مجھے جلد آنے کو کہا تھا۔ یہ انجکشن زاریہ کے لیے زندگی جتنا اہم بھی ہو سکتا تھا۔ میں ان تمام کیفیتوں کے باوجود رکا نہیں۔

سیڑھیوں کو پھلانگتا ہوا میں آپریشن تھیٹر کے دروازے پر پہنچ گیا جہاں فاریہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی میری سمت لپکی۔ "اوہ اقبال' اتنی دیر لگا دی۔ ڈاکٹر طارق دو مرتبہ پوچھ چکے ہیں۔"

ابھی اس نے جملہ مکمل کیا تھا کہ آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر طارق باہر آ

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

گئے‘ میں تیزی سے آگے بڑھا اور میں نے ایک تھیلا ان کے حوالے کر دیا جس میں خون اور انجکشن موجود تھے۔ ڈاکٹر طارق کوئی بات کیے بغیر اندر کی طرف پلٹ گئے۔ ان کے چہرے پر شدید گھبراہٹ تھی جس نے مجھے مایوس کر دیا۔ ”یا اللہ خیر کرنا!“ میرے دل سے بے اختیار دعا نکلی۔ فاریہ بھی شاید محسوس کر چکی تھی کہ ڈاکٹر طارق حد سے زیادہ گھبرائے ہوئے تھے۔ وہ بھی سخت بے چین ہو گئی اور اس نے کوریڈور میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ میں پھر کھڑکی میں آ کھڑا ہوا اور اپنے ذہن کو اِدھر اُدھر لگانے لگا تاکہ پریشانی سے بچ سکوں‘ میں جانتا تھا کہ میری پریشانی فاریہ کے حوصلے پست کرے گی۔ میں خواہ مخواہ دور جاتی سڑک سے گزرنے والی گاڑیوں کو گننے لگا‘ اچانک میرے ذہن میں وہی حسین لڑکی آ کھڑی ہوئی‘ جس سے میں کچھ دیر پہلے میڈیکل اسٹور پر ملا تھا اور جسے دیکھنے کے بعد نہ معلوم کیوں میرے ذہن میں کانٹے سے اُگ آئے تھے۔ اس کا خیال آتے ہی میرے وجود میں وہی عجیب سی بے چینی پھیل گئی۔ میں نے آج سے پہلے کبھی اس لڑکی کو نہیں دیکھا تھا مگر پھر بھی کوئی ایسی بات تھی جو مجھے بار بار یہ احساس دلا رہی تھی کہ میں اسے جانتا ہوں۔ میرا ذہن الجھتا جا رہا تھا۔ اس کی مترنم آواز مسلسل میری سماعت میں بھنور سے ڈال رہی تھی۔ اس کا سراپا میری نگاہوں میں گھوم رہا تھا اور میرے اندر کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اچانک اس کے خوب صورت ہاتھوں کی مخروطی انگلیاں میرے ذہن میں چپک سی گئیں۔ ناخنوں پر لگی نیل پالش بار بار میرے دماغ میں ہتھوڑے سے برسا رہی تھی۔

”کیا مصیبت ہے۔“ میں زیرلب بڑبڑایا۔ میں نے اس کے خیال کو جھٹکنا چاہا اور تبھی اچانک میرے بے پناہ شور کرتے وجود میں گہری خاموشی چھا گئی۔ گہری اور پُراسرار خاموشی‘ اور پھر میں اچھل پڑا۔ اس کے ہاتھوں کی خوب صورت انگلیوں میں ایک انگلی کا ناخن نہیں تھا۔ اس نے اس پر بھی نیل پالش لگا کر چھپانے کی کوشش کی تھی اور یہی شاید وہ چیز تھی جس نے میرے وجود میں کانٹے سے چبھائے تھے۔

میں تیزی سے سیڑھیوں کی طرف لپکا۔

”اقبال۔“ مجھے سیڑھیاں اترتے دیکھ کر فاریہ چیخی۔ شاید اس نے بھی میری وحشت کو محسوس کر لیا تھا۔

”میں آ رہا ہوں میڈم..........“ میں نے نیچے اترتے ہوئے جواب دیا مگر ٹھہرا

نہیں۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ وہی لڑکی تھی جس کے بارے میں حمیدہ نے ہمیں بتایا تھا اور جو عذرا بن کر حویلی میں داخل ہوئی اور زاریہ کو زندگی سے دور کر کے غائب ہو گئی تھی۔ مجھے امید تھی کہ وہ مجھے نیچے مل جائے گی مگر پھر بھی میں تیز رفتاری سے اسی میڈیکل اسٹور کی طرف بڑھ گیا۔

حسبِ توقع وہ وہاں نہیں تھی۔

”سنئے.......... وہ جو لڑکی ابھی کچھ دیر پہلے..........“ اور پھر میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ میڈیکل اسٹور والا مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس سے کچھ پوچھنا بیکار ہی تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ اپنے اسٹور پر آنے والے ہر شخص کو جانتا ہو۔ میں کچھ دیر حیران سا کھڑا چاروں طرف دیکھتا رہا۔ پھر کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح اسپتال کی طرف چل پڑا۔ میں اس وقت اپنے آپ کو بری طرح کوس رہا تھا کہ مجھے یہ بات اس وقت یاد کیوں نہ آئی جب میں نے اس کے ہاتھوں کو دیکھا تھا۔ یہ احساس تو مجھے اسی وقت ہو گیا تھا کہ کچھ ہے‘ کیا ہے‘ اس کا احساس بہت بعد میں ہوا۔ اتنی دیر میں تو وہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہو گی۔

میں تھکا تھکا اوپر پہنچا تو فاریہ کو وہاں نہ پا کر حیران رہ گیا۔ سامنے بنچ پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے فاریہ کے متعلق پوچھا۔

”جی وہ اس طرف گئی ہیں۔“ اس نے دائیں جانب اشارہ کیا۔ جس جانب اس شخص نے اشارہ کیا تھا وہاں ایک لائن میں کمرے بنے ہوئے تھے جہاں مریض کو آپریشن کے بعد چند روز تک رکھا جاتا تھا۔ میں نے پلٹ کر اس آپریشن تھیٹر کی طرف دیکھا جہاں زاریہ کو لے جایا گیا تھا۔ وہاں دروازے پر لگا بلب بجھ چکا تھا۔ یہ دیکھتے ہی میں ان کمروں کی طرف بڑھ گیا۔ بلب بجھ جانے کا مطلب تھا کہ زاریہ کا آپریشن ہو چکا ہے۔ میں ہر کمرے میں جھانکتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہاں ایک کمرے کے اندر سے مجھے ڈاکٹر طارق کی آواز آئی۔

میں نے ہلکے سے دروازے پر دستک دی۔

”کم اِن!“ ڈاکٹر طارق نے دستک کا جواب دیا۔

میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ فاریہ‘ زاریہ پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

آنکھوں میں آنسو تھے مگر چہرے پر خوشی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اس لمحے خود کو ہلکا محسوس کیا۔ ڈاکٹر طارق نے مجھے مسکرا کر دیکھا۔ "مبارک ہو مسٹر اقبال' زاریہ اب بالکل ٹھیک ہے' چھ سات گھنٹے میں انہیں ہوش آ جائے گا۔"

"چھ سات گھنٹے.......... یہ بہت طویل عرصہ نہیں ڈاکٹر؟"

"بہت طویل ہے' مگر اقبال صاحب' مسئلہ دماغ کا ہے' ابھی کچھ ہی دیر پہلے میں نے انجکشن دیا ہے تاکہ وہ مکمل طور پر آرام کر سکیں ورنہ یہ ممکن تھا کہ وہ آدھے گھنٹے میں ہوش میں آ جاتیں۔ ایسا ان کی صحت کے لیے ضروری تھا' بلکہ میں تو آپ لوگوں سے یہ بھی درخواست کروں گا کہ ہوش میں آنے کے بعد بھی آپ لوگ ان سے کم ہی بات کیجئے گا۔ میرا خیال ہے کہ انہیں مکمل صحت یاب ہوتے ہوتے مہینہ تو لگ ہی جائے گا۔"

"اوکے طارق.......... ناؤ شی از ویری ویل۔" ڈاکٹر نے جو زاریہ کا معائنہ کر رہے تھے سر اٹھا کر کہا۔

"تھینک یو سر.......... آیئے آپ کو چھوڑ آؤں۔"

"کہاں.......... میں ذرا ایم ایس سے مل کر جاؤں گا۔" انہوں نے اپنا اسٹیتھسکوپ اور ایک چھوٹا بکس اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ بکس بریف کیس سے کچھ بڑا تھا مگر یہ اس بکس سے بالکل مختلف تھا جو عام طور پر ڈاکٹرز کے پاس ہوتے ہیں۔

میں ان دونوں کو باتیں کرتے دیکھ کر خود زاریہ کے قریب چلا گیا۔ زاریہ دنیا و مافیہا سے بے خبر' بالکل بے حس و حرکت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ بالکل سفید ہو رہا تھا۔ میں چند لمحے خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اس دوران میں ڈاکٹر تجمل اجازت لے کر اور فاریہ کو تسلی دے کر چلے گئے۔ پھر ڈاکٹر طارق بھی یہ کہہ کر چلے گئے کہ وہ ایک گھنٹے کے بعد آئیں گے۔ ظاہر ہے وہ بہت تھک چکے تھے۔ فاریہ نے انہیں کہا وہ چاہیں تو آرام کر سکتے ہیں اور یہ کہ فاریہ اور میں زاریہ کے پاس ہیں۔ ڈاکٹر کے جاتے ہی فاریہ میرے قریب آ گئی۔

"اقبال تم کہاں گئے تھے؟" اس کے لہجے میں کھوج تھا۔

تب میں نے اسے ساری بات بتا دی۔ یہ سن کر کہ میں اسے کھو چکا ہوں وہ بہت نڈھال ہو گئی۔ "اوہ.......... ہر بار شکست ہر لمحہ ہار.......... یہ آخر کب تک ہو گا اقبال..........؟"

"آپ مایوس نہ ہوں میڈم۔ خدا ہماری مدد کر رہا ہے اور وہ ہمیں ایک نہ ایک روز ضرور کامیاب کرے گا۔ ہم انسانیت کے لیے کر رہے ہیں جو کچھ کر رہے ہیں۔ وہ یقیناً ہمارا ساتھ دے گا۔"

"خدا کرے اقبال.........." اس نے اپنے ہاتھوں کو اپنی گود میں رکھ لیا اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اس کے انداز میں بے حد تھکاوٹ اور مایوسی تھی۔ پھر اس نے کچھ دیر بعد سر اٹھایا تو خود پر کافی قابو پا چکی تھی۔ "اقبال تم گھر فون کر کے انکل کے بارے میں معلوم کرو کہ وہ آئے یا نہیں' اگر وہ گھر پر نہ ملیں تو.........." یہ کہہ اس نے پرس میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی ڈائری نکالی اور اس میں سے ایک کاغذ پر فون نمبر لکھ کر میری جانب بڑھا دیا۔ "وہ گھر پر نہ ہوں تو اس نمبر پر انسپکٹر قدیر کو فون کرنا۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ کیا ہوا؟"

میں نے کاغذ لے لیا اور اس سے اجازت لے کر نیچے میڈیکل اسٹور پر چلا آیا۔ میڈیکل اسٹور والے نے مجھے پھر اپنے قریب دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔ "جی فرمایئے؟"

"میں فون کروں گا۔"

"جی ضرور!" یہ کہہ کر اس نے فون قریب کر دیا۔

میں نے پہلے کوٹھی کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے ریسور اٹھانے والے خود بیگ صاحب تھے۔

"بیگ صاحب۔ سب ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں.......... بیٹا' زاریہ کیسی ہے؟"

"جی انکل اس کا آج آپریشن تھا۔"

"آپریشن۔ مگر تم لوگوں نے.........."

"آپریشن کامیاب ہو گیا ہے انکل' باقی تفصیل ہم وہیں آ کر بتائیں گے۔ بس آپ خوش ہو جایئے وہ ٹھیک ہو گئی ہے۔" میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔

"اوہ اقبال.......... خیر ٹھیک ہے' تم لوگ کب آؤ گے؟"

"ابھی تو ہم زاریہ کے پاس ہیں۔ ڈاکٹر طارق آرام کرنے گئے ہیں' وہ صبح سے آپریشن میں بزی تھے۔ ان کے آنے کے بعد ہی ہم آ سکیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔ اب

PVL PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے بیٹا۔ میں زاریہ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔" انہوں نے ملتجی انداز میں کہا۔

"میں کوشش کرتا ہوں کہ آپ کو آ کر لے آؤں۔ فاریہ کو بتا دوں کہ آپ پہنچ گئے ہیں!"

"ہاں اور اس سے کہو کہ میں آنا چاہتا ہوں۔"

"جی بہتر۔ میں کچھ دیر میں یا تو فون کروں گا یا پھر آ جاؤں گا۔" پھر میں نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ میں نے جیب سے نوٹ نکال کر میڈیکل اسٹور والے اس لڑکے کی طرف بڑھا دیا۔ جو شاید حساب کتاب کر رہا تھا۔ پھر میں پلٹ کر اسپتال آ گیا۔ فاریہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" اس نے میرے داخل ہوتے ہی پوچھا۔

میں نے اسے بتایا کہ بیگ صاحب گھر آ گئے ہیں تو وہ خوش ہو گئی۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ وہ زاریہ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ فاریہ نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ میں اس سے رخصت ہو کر نیچے آ گیا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور کوٹھی کی سمت چل پڑا۔

کچھ ہی دیر بعد میں بیگ صاحب کو لیے دوبارہ اسپتال آ رہا تھا۔ راستے میں مجھے بیگ صاحب نے بتایا کہ نارکوٹکس کے ریجنل ڈائریکٹر نے انہیں تعاون کا یقین دلایا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ ان کی گواہی کو راز رکھا جائے گا اور انہیں سلطانی گواہ بنا لیا جائے گا انہوں نے اپنے آدمی وصی صاحب کے پیچھے لگا دیے ہیں اور کہا ہے کہ ان کی کوئی شپنگ نہ روکی جائے۔ وہ اس معاملے کو اپنے طور پر ڈیل کریں گے۔

ان کی زبانی یہ سب سن کر مجھے قدرے اطمینان ہو گیا۔ یہ حقیقت تھی کہ زاریہ کے آپریشن اور ریجنل ڈائریکٹر سے بیگ صاحب کی ملاقات نے ہم پر منڈلانے والے خطرات کو کم کر دیا تھا مگر سوہنی کی حالت کو دیکھ کر میں خود کو وہیں کھڑا محسوس کر رہا تھا جہاں اب سے کچھ دن پہلے تھا۔ میرے لیے پریشانیاں کم ہونے کے بجائے بڑھ گئی تھیں۔ خصوصاً ماں کا گاؤں میں رک جانا' میرے لیے بڑی پریشانی کا باعث تھا۔

"بس بیٹا کہاں جا رہے ہو؟" اچانک بیگ صاحب کی آواز نے مجھے سوچوں کے

بھنور سے نکال لیا۔

میں نے بریک دبایا ورنہ میں اسپتال کے گیٹ سے آگے نکل جاتا۔ گاڑی میں نے اندر موڑلی اور مناسب جگہ پارک کر کے ہم دونوں اسپتال کی عمارت کی طرف بڑھ گئے۔ میں نے لفٹ سے جانا مناسب سمجھا کیوں کہ بیگ صاحب خود بھی بیمار تھے' ان کے لیے دو منزل تک سیڑھیاں چڑھنا غیر مناسب تھا۔

چند منٹ بعد ہی ہم اس کمرے میں تھے جہاں زاریہ کو رکھا گیا تھا۔ فاریہ ہمیں دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ بیگ صاحب لپک کر زاریہ کے سرہانے پہنچ گئے۔ "اس کی یہ حالت ہو گئی اور تم لوگوں نے مجھ سے چھپائے رکھا۔" انہوں نے فاریہ سے شکایت کی۔

"انکل آپ بھی تو ٹھیک نہیں تھے' پھر آپ کو بتا کر کیا کرتے' اب دیکھئے نا یہ بالکل ٹھیک ہے' آپریشن کامیاب ہو گیا ہے۔"

"تو پھر یہ.......... یہ بے حس و حرکت کیوں ہے' آنکھیں کیوں نہیں کھولتی.......... بات کیوں نہیں کرتی؟" وہ گھبرائے ہوئے تھے۔

"انکل.......... یہ بے ہوش ہے' اسے ڈاکٹر نے خود بے ہوشی کا انجکشن لگایا ہے تاکہ مکمل طور پر آرام کرے۔ ابھی ہوش میں آئی تو تکلیف محسوس کرے گی۔" فاریہ نے انہیں سمجھایا۔

"تم.......... تم سچ کہہ رہی ہو نا؟"

"جی بیگ صاحب یہ سچ کہہ رہی ہیں۔" دروازے سے ڈاکٹر طارق کی آواز آئی۔

"اوہ ڈاکٹر.......... تم بھی ان لوگوں کی طرح اصل بات مجھ سے چھپاتے ہو۔"

"جی میں مجرم ہوں آپ کا مگر اس وقت خود آپ کی حالت ایسی نہیں تھی مگر اب میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ مس زاریہ بالکل فرسٹ کلاس ہیں۔ آپ بالکل فکر نہ کریں' بس انہیں آرام کی ضرورت ہے' ہوش میں آ جانے کے بعد بھی میں آپ لوگوں سے یہ امید کروں گا کہ آپ لوگ اسے زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے کے لیے تنہا چھوڑ دیں گے۔" ڈاکٹر طارق نے کہا۔

"ڈاکٹر آپ تو آرام کرنے گئے تھے۔" فاریہ نے پوچھا۔

"بس مس فاریہ ہمارا آرام اتنا ہی ہوتا ہے۔ ویسے میں نے ڈاکٹر منیر کو بلوایا ہے'

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

ڈاکٹر منیر میرے کلینک میں کام کرتے ہیں اور میرے بہنوئی بھی ہیں۔ آج وہ رات بھر زاریہ کے پاس رہیں گے اور میں آج رات گھر پر آرام کروں گا۔"

"ڈاکٹر..........!" فاریہ نے وحشت زدہ ہو کر کہا۔

"نہیں مس فاریہ' آپ فکر نہ کریں۔ میں ڈاکٹر منیر پر اتنا ہی اعتماد کرتا ہوں جتنا خود پر' اور میں انہیں تمام معاملہ بھی سمجھا چکا ہوں۔ دراصل اس تمام معاملے کو پوری احتیاط سے ہینڈل کرنا اور دوسرے مسائل سے بھی نمٹنا تنہا میرے بس سے باہر تھا۔ میں ذہنی طور پر خود کو بہت تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اسی لیے میں نے ڈاکٹر منیر کو اپنے اعتماد میں لیا اور اب میں اس معاملے کو باآسانی سنبھال سکتا ہوں۔ جب تک مس زاریہ مکمل طور پر صحت مند نہیں ہو جاتیں میری ذمے داری ختم نہیں ہو گی۔"

"تھینک یو ڈاکٹر' آپ نے میرا جتنا ساتھ دیا ہے میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔" فاریہ نے احسان مندانہ انداز میں جواب دیا۔

ڈاکٹر طارق وہیں بیٹھ گئے اور بیگ صاحب سے باتیں کرنے لگے۔ فاریہ بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ بیگ صاحب سے ان کے معاملے پر گفتگو کے لیے پریشان ہے مگر ڈاکٹر طارق کی موجودگی میں یہ ممکن نہ تھا۔

زاریہ کی بے ہوشی کو تقریباً تین گھنٹے گزر چکے تھے گویا آپریشن ہوئے تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر اسے مسلسل گلوکوز اور خون دے رہے تھے۔ وہ اب تک اسی طرح پڑی تھی' بے حس و حرکت' اس میں گو زندگی کے آثار بالکل نہ تھے مگر وہ مشینیں جن سے نکلنے والے مختلف تار زاریہ کے بدن کے مختلف حصوں میں لگے ہوئے تھے وہ اسے زندہ ثابت کر رہی تھیں۔ اس کے دل کی دھڑکن بہت مدھم تھی مگر چل رہی تھی۔

میں بہ ظاہر زاریہ کو دیکھ رہا تھا مگر میرا ذہن کہیں اور تھا۔ پلنگ پر کروٹ لیے منہ پھیرے سوہنی اب بھی میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ اب مجھے اس کا چہرہ' اس کی آنکھیں' اس کا لہجہ اور اس کا پورا کا پورا سراپا یاد آ رہا تھا۔ یہ کسی حال میں بھی وہ سوہنی نہیں تھی جسے پہلی نگاہ میں دیکھ کر ہی میں دل ہار بیٹھا تھا۔ صغرا کے ساتھ پانی بھرتی ہوئی سوہنی' میرے پیالہ بنے ہاتھوں میں پانی ڈالتی ہوئی سوہنی اس سوہنی سے بہت مختلف اور خوب صورت تھی۔ مجھے سوہنی کی وہ ہنسی یاد آ گئی جب میں ہاتھوں کا پیالہ بنائے پانی پی رہا

تھا اور نگاہیں اوپر اٹھائے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا تو وہ ایک دم حیران سی ہو کر بولی تھی۔ "ہائے تُو اتنا پیاسا تھا؟" اور جب صغرا نے میرا کندھا ہلا کر کہا۔ "بھاء جی بس کر' اتنا پانی پیئے گا تو مر جائے گا۔" تب سوہنی کی چھنکتی ہوئی ہنسی سن کر میں جھینپ گیا تھا۔ اس کا چھنچھناتا ہوا لہجہ میرے پورے وجود میں پائل سی چھنکا گیا تھا۔

مگر اب۔ اس کا لہجہ' اس کا انداز۔ کتنا فرق تھا اس میں اور آج کی سوہنی میں۔ پہلے اس کے لہجے میں چھنکار تھی مگر اب وہ بولی تھی تو یوں لگا تھا جیسے میں بگولوں کی وحشت ناک آوازوں میں چکراتا ہوا اوپر ہی اوپر اٹھتا چلا جا رہا ہوں' اور جیسے ہی یہ آواز معدوم ہو گی میں دھڑام سے زمین پر آ گروں گا اور جب اس نے کہا تھا۔ "اس سے کیوں جھگڑا کرتا ہے بالے' ہم نے جو بھگتا ہماری قسمت میں لکھا تھا" تو اس کی آواز گہرے کنویں سے آتی محسوس ہوئی تھی' وہ خود بھی تو ایک اندھے کنویں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ایک اندھے اور تاریک کنویں میں جس میں سوائے گاڑھے دھویں کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ یہ ساری سوچیں اتنی وحشت ناک تھیں کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

"اقبال.........." فاریہ نے حیرت زدہ لہجے میں مجھے پکارا۔ میں نے خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

وہ میرے قریب چلی آئی۔ "اقبال' کیا بات ہے.......... تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"ج ج.......... جی میڈم .... میں .... ٹھیک ہوں۔" میں نے جواب دیا اور خود پینٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑکی میں آ کھڑا ہوا۔ ہوا میں خنکی تھی' یہ خنکی میرے چہرے سے ٹکرائی تو جیسے مجھے ہوش آ گیا۔ میں نے چند منٹ لمبے لمبے سانس لئے اور تازہ ہوا کو اپنے اندر اتارنے لگا۔ میرے اس عمل نے فوراً ہی مجھ میں توانائی بھر دی۔

"اقبال' میں جانتی ہوں تم بہت پریشان ہو' تمہاری جگہ اگر میں ہوتی تو شاید تم سے زیادہ پریشان ہو چکی ہوتی' تم میں صبر و تحمل کمال کا ہے اقبال۔ جاؤ سوہنی کے پاس جاؤ' وہ تمہارے اس طرح چلے آنے سے ناراض ہو گی اور جسے آدمی پیار کرتا ہو اسے ناراض نہیں کرنا چاہیے"۔ فاریہ نے میرے قریب آ کر سرگوشی میں کہا۔

"نن .... نہیں میڈم۔ میں اس لیے تو پریشان نہیں ہوں۔" میں نے جھوٹ بولا مگر وہ جن نگاہوں سے مجھ دیکھ رہی تھی اس نے مجھے نگاہ جھکانے پر مجبور کر دیا۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"جاؤ' اقبال۔ دیکھو نا اب مجھے ہر طرح سے اطمینان ہے۔ انکل واپس آ گئے ہیں۔ وصی صاحب والا معاملہ قدیر دیکھ رہا ہے۔ زاریہ کا آپریشن کامیاب ہو گیا۔ ڈاکٹر طارق میرا اور زاریہ کا بلکہ انکل کا بھی کتنا خیال کر رہے ہیں۔ اب مجھے ایسی کوئی پریشانی نہیں کہ تم محض میری وجہ سے اس کا خیال نہ کرو۔ وہ جب تک یہاں ہے' تمہاری ذمے داری ہے۔ سلطان کتنا ہی ہمدرد کیوں نہ ہو' سوہنی کا تو کچھ نہیں لگتا نا پھر اسے وہاں اس کے پاس چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔ تم ماسی میراں اور سوہنی کو یہاں لے آؤ۔ میں سوہنی کا علاج ڈاکٹر طارق سے کرواؤں گی اور ماسی میراں کا بھی۔ ہم اسے سرکاری اسپتال کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔ جاؤ اقبال پلیز ورنہ میں بھی اس کی طرف سے پریشان رہوں گی۔ تم انہیں لے کر گھر چلے جانا۔ میں اور انکل ڈاکٹر طارق کے ساتھ گھر چلے جائیں گے۔ ڈاکٹر طارق کہہ چکے ہیں کہ یہاں صرف ڈاکٹر منیر رہیں گے۔ تم جا کر حمیدہ سے کہنا کہ وہ کھانے میں بہت اچھی چیزیں بنائے۔ سوہنی میری مہمان ہے اقبال' جتنا تم نے میرا خیال رکھا ہے میں اتنا ہی سوہنی کا خیال رکھوں گی۔"

فاریہ دھیرے دھیرے بولے جا رہی تھی اور میں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کتنی پُرخلوص' کتنی شفیق لگ رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھ پر شدید گرمی اور حبس کے بعد اچانک ٹھنڈی پھوار سی پڑنے لگی ہو۔ میں کھڑا ہو گیا۔ میری آنکھوں میں گویا آنسو کا قطرہ سا اٹک گیا تھا۔ میں بے ساختہ ہنس دیا۔

"تھینک یو میڈم' تھینک یو' آپ بہت شفیق ہیں۔"

جواباً وہ مسکرائی اور اس نے میرے کندھے پر اپنا نرم و نازک سا ہاتھ رکھ دیا۔

"جاؤ۔"

میں دروازے کی طرف بڑھا۔ پھر اچانک مجھے ڈاکٹر طارق اور بیگ صاحب کا خیال آ گیا۔ میں واپس آیا اور ان دونوں کے قریب پہنچ گیا۔ "اوکے ڈاکٹر' اوکے بیگ صاحب۔" میں نے ان کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے رخصت چاہی۔

"کہاں جا رہے ہو؟" بیگ صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔

"انکل' اقبال کو ذرا کام ہے۔" مجھ سے پہلے فاریہ بول اٹھی۔

بیگ صاحب نے سر ہلایا مگر ان کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ میں ان دونوں سے

مصافحہ کر کے کمرے سے باہر آ گیا۔ کمرے سے باہر آتے ہی گویا میرے پر لگ گئے۔ میں دو سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگتا ہوا نیچے پہنچا اور گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اسپتال سے باہر آ کر گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی تھی۔ میں جلد از جلد سوہنی تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ سورج کی تپش ختم ہو چکی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک بڑھ گیا تھا مگر میں انتہائی مہارت سے گاڑی تیز رفتاری سے چلاتا ہوا کرشن نگر پہنچ گیا۔ سلطان کے گھر کی سیڑھیاں بھی چند ہی چھلانگوں میں عبور کر گیا۔

دروازے پر تالا نہیں تھا۔ میں نے دستک دی۔ چند ہی منٹ بعد دروازہ کھل گیا۔ سامنے سلطان کھڑا تھا۔ "کیوں.......... تُو کیوں واپس آ گیا؟ تجھے تو بڑے کام تھے' اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ اپنوں کا دکھ ہی سن لیتا پھر کیسے وقت مل گیا تجھے؟" اس کے لہجے میں اتنا زہر تھا کہ مجھے اپنا آپ کتنا محسوس ہوا۔

"مجھے اندر نہیں آنے دے گا کیا؟" میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں.......... مجھے بھلا کیا حق ہے کہ میں تجھے اندر آنے یا باہر جانے سے روک سکوں۔ یہ حق تو شاید تُو نے کسی کو بھی نہیں دیا۔" اس نے اسی زہریلے انداز میں جواب دیا اور پلٹ کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔

میں اس کے پیچھے ہی اندر داخل ہو گیا۔ سوہنی فرش پر بچھی دری پر' دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر بھی اس نے جنبش نہ کی بلکہ اسی طرح بیٹھی سپاٹ نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ یوں جیسے میرا اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ میرا جی چاہا کہ میں آگے بڑھ کر اسے جھنجوڑ دوں۔ اس سے پوچھوں کہ اس کی آنکھوں کی وہ بے چینی کہاں گئی جو میں نے آخری بار اس کی آنکھوں میں کوندتی دیکھی تھی۔ اس کی وہ مسکراہٹ کہاں کھو گئی۔ جو میرے ذہن میں آج بھی چاندنی بن کر پھیلی ہوئی ہے۔ میں نے چاہا کہ اسے بتا دوں کہ میں تو آج تک اسی کی یادوں کے سہارے جیتا رہا ہوں پھر اس پر ایسی گہری چپ کیوں طاری ہے' میں اسے سب کچھ بتانا چاہتا تھا مگر میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ میرا حلق خشک ہو گیا تھا۔ الفاظ دھواں بن کر نگاہوں کے سامنے مگر ہونٹوں سے بہت دور اڑ رہے تھے۔ میں کسی روبوٹ کی طرح اس کے سامنے جا بیٹھا۔ وہ اب بھی مجھے ہی تک رہی تھی مگر اس کی نگاہوں میں کچھ بھی نہ تھا' کوئی جذبہ' کوئی احساس یا کوئی تاثر نہ تھا۔ نہ

PVL PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

معلوم کیوں مجھے لگا جیسے میرے سامنے کسی نے سفید بے داغ چادر سی تان دی ہو۔ میں گھبرا سا گیا۔ میں زیادہ دیر اس کے قریب نہ بیٹھ سکا۔ ایک دم ہی کھڑا ہو گیا۔ سلطان کمرے کے ایک کونے میں بیٹھا چولہے پر چائے کی کیتلی رکھ رہا تھا۔

"سلطان' ماسی میراں کہاں ہے؟" میں نے ڈوبتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

سلطان نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور جواب دیے بغیر چائے کے مگے اپنے سامنے رکھنے لگا۔ کمرے میں سوائے برتنوں کے کھنکنے کی آواز کے دوسری آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اتنے گہرے سکوت نے مجھے بے چین کر دیا تھا کہ مجھے اپنی پشت پر پائل کی چھنکار سنائی دی۔ پائل کی وہی چھنکار جو میرے اور سوہنی کے درمیان پہلی کڑی تھی۔ میں بے ساختہ پلٹ گیا۔ تب میری نگاہ سوہنی پر پڑی جو اپنی سمٹی ہوئی ٹانگوں کو پھیلا چکی تھی' اس نے شاید پہلو بھی بدلا تھا کہ اس کی شلوار کا پائنچہ کچھ اوپر سرک گیا تھا اور اس کے خوب صورت پیروں میں پڑی پائل میری نگاہوں میں انگارے سے بھر رہی تھی۔ یہ وہی پائل تھی جو میں نے اپنے پیار کی پہلی نشانی کے طور پر اسے دی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان کی پہلی کڑی آج بھی میرا پیار بنی اس کے پیروں سے لپٹی ہوئی تھی۔

پائل کی اس چھنکار نے میرے اندر طوفان سے اٹھا دیے تھے میرے اوپر چڑھا' اقبال کا خول پل بھر میں اتر گیا' وہ کھنچاؤ' وہ وضع داری دھواں بن کر اڑ گئی اور میں لپک کر اس کے قریب جا بیٹھا۔

"سوہنی.......... تُو مجھے دیکھتی کیوں نہیں' مجھ سے بات کیوں نہیں کرتی سوہنی! دیکھ تو میں وہی بالا ہوں' تیرا اپنا' یاد ہے میں نے تیری آنکھوں میں ایک سپنا سجایا تھا۔ کہاں ہے وہ سپنا.......... کہاں ہے وہ پیار جو میں نے تجھے سونپا تھا سوہنی' میں تو آج تک اس پیار کے سہارے جی رہا تھا' مجھے پیار چاہیے سوہنی مجھے اپنا وہی پیار چاہیے۔" میں بے ساختہ بولتا ہی چلا گیا' مجھے لگا جیسے میرے اندر کے دریاؤں کا بند ٹوٹ گیا ہو۔

"تیرا پیار تو کچا کچنار تھا بالے.......... لمحوں کے پیروں تلے دب کر کچلا گیا۔ وہ سپنا جو تُو نے مجھ میں بسایا تھا' مجھ سے چھین لیا گیا بالے' میرے وجود میں تیرے پیار کی راکھ تو شاید مل جائے مگر وہ پیار.......... تو لٹیرا لوٹ کر لے گیا.......... مجھ میں اب کچھ بھی نہیں بالے۔ کچھ بھی نہیں۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی' یوں جیسے میری موت کا پروانہ پڑھ کر

سنا رہی ہو۔

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ "تُو.......... تُو کیا کہہ رہی ہے سوہنی؟ وہ.......... وہ کون تھا جو میرا سپنا بھی لوٹ کر لے گیا.......... اور.......... تُو نے میرے پیار کی حفاظت بھی نہ کی!" میں نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

"بالے.........." اس نے گہرا سانس لے کر سر دیوار سے ٹیک دیا۔ "اگر کوئی تجھے جکڑ کر' اٹھا لے جائے.......... اور لوٹ لے تو کیا.......... کیا تُو ان امانتوں کو بچا سکتا ہے جو کسی نے تجھے دی ہوں؟"

"سوہنی.......... چپ کر جا.......... چپ کر جا سوہنی۔" میں تڑپ کر کھڑا ہو گیا اور خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور میں دیوار میں مکے برسانے لگا۔ میں دونوں مٹھیوں کو پوری طاقت سے دیوار پر مار رہا تھا اور وہ یونہی بے حس و حرکت بیٹھی سپاٹ نگاہوں سے مجھے تک رہی تھی۔

اگر سلطان نے مجھے پیچھے سے آ کر جکڑ نہ لیا ہوتا تو میں شاید اپنے دونوں ہاتھ زخمی کر چکا ہوتا۔ سلطان نے مجھے کھینچ کر پلنگ پر دھکیل دیا۔ میں بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ سلطان دھیرے دھیرے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا مگر اس نے مجھے خاموش کرانے کی کوشش نہیں کی۔

"تُو بری طرح لٹ چکا ہے بالے' رو لے.......... جی بھر کر رو لے' پھر تُو خالی ہو جائے گا میری طرح.......... پھر تجھے کبھی رونا نہیں آئے گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔" اس نے آنسوؤں اور دکھوں سے بوجھل لہجے میں کہا۔

اور میں روتا رہا.......... روتا رہا' جانے کب تک روتا رہا۔ سلطان نے ٹھیک کہا تھا۔ بہت دیر رونے کے بعد میری آنکھیں خشک ہو گئیں' میرے اندر چکراتے سارے طوفان خاموش ہو گئے۔ میں نے خود کو اندر سے بالکل سپاٹ محسوس کیا' میرے اندر سے دکھ' درد یا غم کا ہر احساس ختم ہو گیا اور عجیب سی بے حسی اور سفاکی پھیل گئی۔ تب مجھے پتہ چلا کہ سوہنی اتنی ساکت اور سپاٹ کیسے ہو گئی' اس کے اندر کے سارے احساسات ختم کیسے ہو گئے۔

مجھ پر گہرا سکوت طاری ہو گیا تو میں اٹھ بیٹھا۔ اب میرے اندر اور باہر ہر طرف

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

گہری خاموشی تھی۔ سلطان اور سوہنی بھی دونوں ہی خاموش تھے۔ چند لمحوں بعد سلطان اٹھا اور پانی کا بھرا ہوا گلاس لا کر میری طرف بڑھا دیا۔ اس لمحے اچانک مجھے سخت پیاس محسوس ہوئی۔ میرا جی چاہا کہ میں دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنالوں اور سوہنی میرے ہاتھوں میں پانی ڈال دے کہ میری پیاس بجھ جائے۔ میں نے گلاس ہاتھ میں تھامتے ہوئے سوہنی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں لحہ بھر کو وہی جذبہ ابھرا اور معدوم ہو گیا۔ شاید وہ سین اسے بھی یاد آ گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

میں ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر گیا' مگر پیاس اب بھی نہ بجھی۔ میں نے اٹھ کر دوبارہ پانی نہ لیا۔ میں جانتا تھا کہ اب یہ پیاس شاید کبھی نہ بجھے گی۔ سلطان چائے کے مگ لیے ہمارے قریب آ گیا۔ اس نے سوہنی کے سامنے دری پر ہی تینوں مگ رکھ دیے۔

"بالے' یہیں آ جا' تُو اوپر بیٹھتا ہے تو ہمیں اپنے چھوٹے ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے۔" سلطان نے دھیرے سے کہا اور میں جلدی سے نیچے دری پر آ بیٹھا۔

ہم تینوں نے خاموشی سے چائے پی۔ میں نے محسوس کیا کہ سوہنی کی حالت کچھ خراب ہوتی جا رہی ہے۔ وہ بار بار پہلو بدلتی اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے دونوں کندھے پکڑ کر دبانے لگتی پھر اچانک اس کے ہونٹوں سے ایک کراہ نکلتی اور وہ دونوں ٹانگیں سکیڑ کر گھٹنوں کو اپنی ٹھوڑی تک لے آتی اور کبھی دونوں ٹانگیں پھیلا کر پیروں کے نیچے دبانے لگتی۔

"سوہنی۔ کیا.......... کیا ہو رہا ہے؟"

"نشہ نہ کرنے سے یہی حالت ہو جاتی ہے اس کی۔ کل میں نے مجبوراً اسے مارفیا کا انجکشن لگایا تھا۔ آج رات کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤں گا۔" سلطان نے کہا تو مجھے زاریہ کی کیفیت یاد آ گئی۔

"نہیں سلطان.......... میری بات غور سے سن۔" یہ کہہ کر میں نے فاریہ کی ساری کہانی اسے سنا دی اور پھر زاریہ کی حالت کے بارے میں بھی اسے سب کچھ بتا دیا۔ میں نے سلطان سے درخواست کی کہ اگر وہ بھی سوہنی اور ماسی میراں کے ساتھ ہی وہاں چلے تو فاریہ کو بڑی ڈھارس ہو جائے گی۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ فاریہ اس سے مدد حاصل کرنے کو پہلے ہی کہہ چکی ہے۔

"مجھے فاریہ نے یہی کہہ کر بھیجا ہے کہ میں سوہنی اور ماسی میراں کو لے کر کوٹھی پہنچ جاؤں.......... تُو بھی ہمارے ساتھ چل سلطان' میرا دل بھی بڑھ جائے گا اور پھر جب تو وہاں ہو گا تو میں گاؤں جا کر ماں کو بھی لے آؤں گا سلطان۔" میں نے اس سے التجا کی۔

"مگر بالے.........."

"کچھ نہیں سلطان.........." میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کیا تُو نہیں چاہتا کہ ان زہر بیچنے والوں کو پھانسی تک پہنچایا جائے' کیا سوہنی کو دیکھنے کے بعد بھی تجھے ان سے نفرت محسوس نہیں ہوئی؟"

"یہ بات نہیں ہے بالے.......... اگر راجو مجھے مل گیا ہوتا' یا اگر مجھے ان دونوں کو ساتھ لے کر نہ نکلنا ہوتا تو میں راجو اور اس کے خاندان کو بھون کر رکھ دیتا مگر ان دونوں کو وہاں سے نکالنے کے لیے ضروری تھا کہ میں چوروں کی طرح واپس آ جاؤں ورنہ.........." اس نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا۔

"تو پھر میرا ساتھ دے سلطان' سوہنی اور زاریہ دونوں ہی ان زہریلے سوداگروں کا شکار ہوئی ہیں۔ فاریہ تنہا ہے سلطان اور بیگ صاحب کے بارے میں' میں تجھے بتا چکا ہوں۔ سلطانی گواہ بننے کے بعد بھی انہیں کچھ نہ کچھ سزا تو بھگتنا ہو گی نا.......... ایسے میں وہ دونوں لڑکیاں کیا کریں گی' کہاں جائیں گی۔ فاریہ کتنی ہی مضبوط سہی' ہے تو ایک عورت ہی نا!"

میری باتیں سن کر سلطان خاموش ہو گیا۔ شاید وہ قائل ہو گیا تھا۔ جو رہی سہی الجھن تھی اسے سوہنی کے اس جملے نے ختم کر دیا کہ بالا ٹھیک کہتا ہے سلطان' ہم ساتھ ہوں گے تو ایک دوسرے کا سہارا بنیں گے۔

سلطان میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ ماسی میراں سرکاری ہسپتال میں ہے۔ مغرب کا وقت گزر چکا تھا۔ کافی دیر ہو گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ فاریہ اور بیگ صاحب گھر پہنچ گئے ہوں گے اور میرے بارے میں پریشان ہو رہے ہوں گے۔ میں نے فوراً ہی ان سے سامان اٹھانے کو کہا۔ سوہنی کا سامان تو بندھا رکھا تھا۔ سلطان نے ضروری چیزیں ایک سوٹ کیس میں رکھ لیں۔ مجھے اس کے ساتھ چلنے سے بڑی ڈھارس ہوئی تھی۔ ہم وہاں سے نکل کر سیدھے سرکاری اسپتال گئے۔ ماسی میراں مجھے دیکھ کر مجھ سے

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

لپٹ کر بری طرح روئی۔ بڑی مشکل سے میں نے اور سوہنی نے اسے سنبھالا۔ ہم نے ڈاکٹروں سے یہ کہہ کر اجازت لے لی کہ ہم ماسی کو بڑے ڈاکٹروں کے پاس لے جائیں گے اور پرائیویٹ علاج کرائیں گے۔

انہوں نے کچھ منہ تو بنایا مگر اسے چھٹی دے دی۔ میں اسپتال پہنچ کر ہی کوٹھی فون کرنا چاہتا تھا مگر فون بزی جا رہا تھا پھر میں ان تینوں کو لے کر کوٹھی کی طرف چل پڑا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم کوٹھی پہنچ گئے۔ میرا اندازہ صحیح تھا۔ فاریہ اور بیگ صاحب وہاں پہنچ چکے تھے اور میری طرف سے سخت پریشان تھے۔

فاریہ سوہنی اور ماسی میراں کو میرے ساتھ دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اس نے فوراً ہی حمیدہ کو بلا کر میرے کمرے کے برابر والا کمرا صاف کرنے کو کہا اور سوہنی وغیرہ کو لے کر اندر چلی گئی۔ جانے سے پہلے اس نے دونوں کا تعارف بیگ صاحب سے بھی کروایا۔ بیگ صاحب یہ سن کر بہت خوش ہوئے کہ سوہنی وغیرہ شہر آ گئے۔

"اقبال، تمہاری والدہ نہیں آئیں؟" ان کے اندر جانے کے بعد بیگ صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے انہیں بتایا کہ وہ کیوں نہیں آئیں اور یہ بھی کہ اب میرا وہاں جانا اور ان کو یہاں لے کر آنا ناگزیر ہو گیا ہے۔

"ہاں اقبال، اب تمہیں چلے جانا چاہیے۔ اب وہ وہاں بالکل تنہا رہ گئی ہوں گی!؟"

"جی بیگ صاحب، اللہ ان کی حفاظت کرنے والا ہے ویسے وہاں ابھی کچھ ہمدرد باقی ہیں۔ پورا گاؤں ہی چوہدری اور اس کے بیٹے سے متنفر ہے۔ مگر سب ہی کو اپنی جان پیاری ہے، کوئی بھی ان کے خوف سے کچھ نہیں کہتا۔"

"ٹھیک ہے اقبال، میری طرف سے تو تمہیں اجازت ہے، تم نے بیٹوں سے بڑھ کر میرا ساتھ دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میرا کوئی بیٹا ہوتا تو وہ بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ جاؤ خدا تمہیں اپنی امان میں رکھے گا اور سنو غیریت نہ برتنا، جتنے پیسوں کی بھی ضرورت ہو فاریہ سے لے لینا بیٹا۔"

"شکریہ بیگ صاحب۔" میں نے احسان مندی سے کہا اور ان سے اجازت لے کر اُس حصے میں چلا آیا جہاں فاریہ وغیرہ بیٹھے تھے۔ یہ ڈرائنگ روم سے آگے اور بیڈ رومز

سے پہلے ایک ہال نما کمرا تھا جسے میٹنگ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ ماسی میراں مجھے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی۔

"بالے کیسا ہے تو.......... تجھے دیکھنے کو تو آنکھیں ترس گئیں۔ سلطان کے آنے سے پہلے تو ہم یہی سمجھے تھے کہ رب نہ کرے تُو اس دنیا میں نہیں رہا۔ راجو وغیرہ نے سارے گاؤں میں یہی اُڑایا ہوا ہے کہ تُو پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ جانے کیسے ان لوگوں نے صغرا کی قبر دیکھ لی تھی۔ پر بالے.......... وہ کیسے مری تھی؟ کیا ہوا تھا تم لوگوں کے ساتھ؟ ہمیں تو پتا ہی نہ چل سکا۔ تیری ماں تو دیوانی ہو گئی، کبھی کچھ کہتی تھی اور کبھی کچھ۔"

تب میں نے ماسی میراں کو تھانے سے فرار سے لے کر یہاں تک پہنچنے تک کی ساری داستان سنا دی۔ وہ دل تھامے ساری داستان سنتی رہی اور روتی رہی۔ سوہنی بھی ٹھوڑی کو گھٹنوں پر ٹکائے، آنکھیں پھاڑے تمام کہانی سن رہی تھی۔ میری کہانی ختم ہوئی تو کمرے میں سوہنی اور ماسی میراں کی سسکیوں کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔ سلطان، بیگ صاحب سے باتیں کر رہا تھا۔ ان دونوں کی آوازیں دھیمی تھیں مگر اس کمرے تک پہنچ رہی تھیں۔ حمیدہ چائے لے آئی۔ ہم لوگ خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ چائے پینے کے بعد فاریہ نے سوہنی اور ماسی میراں کو آرام کرنے کو کہا اور مجھے اشارہ کرتی ہوئی باہر آ گئی۔

ہم کمرے سے باہر آئے تو فاریہ نے سرگوشی کی۔ "اقبال، سلطان سے تمہاری بات ہوئی؟"

"جی میڈم، وہ اب یہیں رہے گا۔ میں اسے تمام بات بتا چکا ہوں۔"

"تمہیں اس پر اعتماد ہے؟"

"جی میڈم، اگر اعتماد نہ ہوتا تو میں اسے گاؤں نہ بھیجتا، اور نہ سوہنی کو تنہا اس کے پاس چھوڑ کر آپ کے ساتھ آتا۔"

"اوہ تھینکس گاڈ۔" فاریہ نے اطمینان بھرا سانس لے کر کہا۔

"میڈم سلطان کے لیے بھی کمرہ صاف کرا دیں۔"

"ہاں میں حمیدہ سے کہتی ہوں۔ تمہارے کمرے کے بالکل سامنے والا کمرا اس کے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

لیے صاف کروا دیتی ہوں۔"

پھر اس کمرے میں آ گئے جہاں بیگ صاحب اور سلطان بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئے اور پھر باتیں کرنے لگے۔ میں نے فاریہ سے زاریہ کے متعلق پوچھا۔ فاریہ نے بتایا کہ اسے شام ساڑھے سات بجے کے قریب ہوش آ گیا تھا۔ وہ بولی تو نہیں مگر اس کی آنکھوں میں بہت سے سوالات تھے۔ وہ مجھے اور انکل کو اپنے قریب دیکھ کر خوش ہوئی تھی اور اس نے بات کرنے کی کوشش بھی کی تھی مگر شاید اس سے بولا نہ گیا۔ ڈاکٹر طارق بھی موجود تھے اور ڈاکٹر منیر بھی آ گئے تھے۔ ڈاکٹرز نے اس کا مکمل معائنہ کیا اسے دوائیں دیں اور اسے مسکن انجکشن لگا دیا۔ جس سے وہ پھر بے خبر سو گئی۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس کے لیے مکمل آرام بے حد ضروری ہے ورنہ اس کی یادداشت متاثر ہو گی۔

فاریہ بے حد خوش تھی۔ اس کے بکھرے ہوئے معاملات تقریباً سمٹ گئے تھے۔ بہادر اور سیماں کو وہ بھول چکی تھی۔ ابھی اس کی ساری توجہ زاریہ کی طرف تھی۔ آج وہ فیکٹری بھی نہیں گئی تھی۔ میں اور فاریہ کل صبح جا کر یعقوب کو لے آنے کا پروگرام بناتے رہے پھر حمیدہ نے کھانا کھانے کے لیے بلایا۔ سوہنی اور ماسی میراں نے سب کے ساتھ کھانا قبول نہ کیا۔ میں جانتا تھا کہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا ان کے بس کی بات بھی نہ تھی۔ فاریہ نے ان دونوں کا کھانا ان کے کمرے ہی میں لگوا دیا۔ میں نے بھی جانے کتنے عرصے بعد سوہنی اور ماسی میراں کے ساتھ کھانا کھایا۔ کچھ دیر بعد فاریہ بھی اپنی پلیٹ اٹھائے ہمارے ساتھ آ بیٹھی۔

مجھے وہ کھانا یاد آ رہا تھا جو مجھے گاؤں کے تھانے میں ماسی میراں اور سوہنی نے پہنچایا تھا۔ وہ گاؤں میں میری آخری کھانا تھا' جو میں نے کھایا' اور اب اتنے برس بعد میں سوہنی اور ماسی میراں کے پاس بیٹھا تھا۔ کاش اماں بھی ہمارے ساتھ ہوتی تو میں کتنا مطمئن ہوتا۔ کھانے کے بعد ہی فاریہ نے حمیدہ کو بھیج کر برابر والی کوٹھی میں رہنے والی لیڈی ڈاکٹر کو بلوا لیا جو فاریہ کی دوست بھی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے ماسی میراں کو اچھی طرح چیک کیا اور دوائیں لکھ کر دے دیں۔ فاریہ نے ڈاکٹر کو سوہنی کے بارے میں بھی بتا دیا کہ اسے نشے کی عادت ہو گئی ہے۔ آج تو اسی کی دوا لینا تھی کل ڈاکٹر طارق اسپتال سے فارغ ہوتے تو انہیں بلا کر سوہنی کا باقاعدہ علاج کرانا تھا مگر آج تو ڈاکٹر طارق گھر جا چکے تھے۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

اس نے دونوں کے لیے دوائیں لکھ دیں۔ فاریہ نے نسخہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

"اقبال یہ دوائیں لے آؤ اور سنو' انکل سے بھی پوچھ لینا شاید انہیں بھی کچھ چاہیے ہو۔"

"جی بہتر!" میں نے دواؤں کا پرچہ لے لیا۔

"یہ رکھ لو۔" فاریہ نے ایک ہزار کا نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"پیسے ہیں میڈم۔"

"پھر بھی' ضرورت تو پڑ سکتی ہے نا اور جو تمہارے پاس ہیں وہ تم اپنی ضرورت کے لیے رکھو۔"

"ایک ہی بات ہے میڈم۔" میں نے انکار کرنا چاہا مگر فاریہ پیسے میری مٹھی میں دبا کر آگے بڑھ گئی۔

میں ڈرائنگ روم میں آیا۔ بیگ صاحب کو بھی دوا چاہیے تھی انہوں نے بھی مجھے پرچا دے دیا۔ میں نے سلطان کو بتا دیا تھا کہ میرے کمرے کے سامنے والا کمرا اس کا ہے اور صاف بھی کر دیا گیا ہے۔

"میں سب کچھ بتا چکا ہوں بیٹا اسے' تم فکر نہ کرو' اب تم اکیلے ہی میرے بیٹے نہیں ہو سلطان میرا دوسرا بیٹا ہے۔" بیگ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے سلطان کی طرف دیکھا۔ وہ بیگ صاحب کے رویے پر بے انتہا خوش نظر آ رہا تھا۔

"میں ابھی آتا ہوں۔" میں نے سلطان سے کہا۔

"میں بھی چلتا ہوں!" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"نہیں سلطان یہ بات اب سے طے ہے کہ اگر میں کوٹھی سے باہر ہوں گا تو تم کوٹھی کے اندر یعنی ان لوگوں کے ساتھ ہی رہو گے۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے بٹھاتے ہوئے کہا۔

"اقبال ٹھیک کہتا ہے سلطان' عذاب ہمارے اردگرد ہی رینگتے رہتے ہیں۔ جیسے ہی موقع مل جائے ہم میں کسی کو بھی ڈس لیتے ہیں۔" بیگ صاحب نے تھکے تھکے انداز میں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

کہا۔

میں ان دونوں سے اجازت لے کر باہر نکل آیا۔ میڈیکل اسٹور یہاں سے کافی فاصلے پر تھا۔ میں نے چوکیدار سے گاڑی کی چابیاں لیں اور گاڑی اسٹارٹ کر کے گیٹ تک لے آیا۔ چوکیدار گیٹ کھول چکا تھا میں گاڑی کو گیٹ سے باہر لیتا چلا گیا۔

رات کے تقریباً گیارہ بج چکے تھے۔ گھروں میں تو روشنی تھی، لوگ جاگ رہے تھے مگر سڑک بے حد سنسان تھی۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں زندگی بڑے بڑے اور اونچے جنگلوں کے پیچھے قید رہتی تھی۔ غریبوں کی بستیاں تو تھیں نہیں جہاں لوگ گھروں کے آگے بیٹھ کر زندگی کے غم بھولنے کے لیے اونچے قہقہے لگاتے ہیں۔ میں جلدی میں نہ تھا، پھر بہت عرصے بعد کچھ ذہنی سکون میسر آیا تھا اس لئے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں گاڑی کو آہستہ رفتار سے چلاتا، سیٹی بجاتا چلا جا رہا تھا۔

اور پھر اچانک ہی میری سیٹی خود بہ خود بند ہو گئی۔ میری نگاہیں سڑک پر پڑی ایک گٹھڑی پر جم گئیں اور میں نے قریب پہنچ کر گاڑی روک دی۔ وہ کوئی عورت تھی۔ سفید ساری میں ملبوس وہ جو بھی تھی سڑک پر بکھری پڑی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں آہستہ رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا ورنہ شاید وہ گاڑی کے نیچے آ کر کچلی جاتی۔ میں نے قریب پہنچ کر اس کا ہاتھ پکڑا۔ میں نبض سے اس کی زندگی کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ عین اسی لمحے کسی نے میری دائیں کنپٹی پر کوئی بھاری چیز دے ماری۔ میری آنکھوں میں ستارے ناچے اور گہرا اندھیرا چھا گیا۔

معلوم نہیں کتنی دیر بعد مجھے ہوش آیا۔ ہوش آتے ہی تو کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا، صرف یہ احساس ہوا کہ میں لیٹا ہوا ہوں پھر اچانک ہی یہ احساس بھی ہو گیا کہ میں کسی کار، ٹرک یا ٹرین میں ہوں کیوں کہ میں مسلسل ہل رہا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے جس چیز پر میں لیٹا ہوا تھا وہ ہل رہی تھی۔ میری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ہاتھ پشت پر لے جا کر باندھ دیے گئے تھے اور میری ٹانگیں بھی آزاد نہیں تھیں۔ میں نے ہلنے جلنے کی کوشش کی مگر مجھے اس بری طرح جکڑا گیا تھا کہ میں پوری قوت لگانے کے باوجود ایک انچ بھی نہ سرک سکا تھا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی یا تو میں ٹرک ٹائپ کی کسی گاڑی میں تھا کہ جہاں میرے سوا کوئی دوسرا نہ تھا، ممکن ہے کہ

وہ لوگ اگلے حصے میں ہوں۔ یا پھر وہ جو بھی تھے انہوں نے آواز نہ نکالنے کی قسم کھائی ہوئی تھی۔

"سنو............ کوئی ہے!" میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد دھیمے سے پوچھا۔

"سب ہیں............ تم خاموش رہو۔" کسی نے غرا کر جواب دیا۔

"مجھے پیاس لگی ہے۔" میں نے لہجہ اونچا کیے بغیر کہا۔

"ہم تمہیں ایسی ہی جگہ لے جا رہے ہیں جہاں تمہیں کوئی پانی ڈالنے والا بھی نہ ہو۔" اسی شخص کی آواز آئی۔ لہجہ بے پناہ سفاک تھا۔ میں نے لہجہ اور آواز پہچاننے کی کوشش کی مگر یوں لگتا تھا جیسے وہ شخص میرے لیے قطعی اجنبی ہو۔

"تو پھر یہاں پر گولی مار دو۔" میں نے کہا۔

"اگر تم دوبارہ بولے تو میں تمہارے مشورے پر عمل کروں گا۔" اسی سفاک لہجے میں جواب ملا۔

میں سمجھ چکا تھا کہ وہ شخص سچ بول رہا ہے۔ میں خاموش ہو گیا۔ اس گفتگو سے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ میں کار کی پچھلی سیٹ پر پڑا ہوں۔ میں نے اپنے کان باہر کی آوازوں پر لگا دیے، میں جاننا چاہتا تھا کہ ہم جس راستے پر سفر کر رہے ہیں، وہ سنسان ہے یا بارونق، بارونق ہونے کی مجھے امید تو نہ تھی کیوں کہ اغوا کر کے لے جانے والے کبھی بارونق سڑکوں سے نہیں گزرتے مگر پھر بھی اس وقت صرف سماعت ہی کام آ سکتی تھی اور میں اس سے کام لینا چاہتا تھا۔ اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ انہوں نے میرے منہ میں کپڑا کیوں نہیں ٹھونسا، حالانکہ اگر میں اغوا کرنے والوں کی جگہ ہوتا تو اس کا خیال رکھتا۔ کیوں کہ میں چاہتا تو شور مچا کر ان لوگوں کے لیے مشکل پیدا کر سکتا تھا۔

مگر بہت جلد مجھے احساس ہو گیا کہ انہوں نے ایسا کر کے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ میرے کانوں میں صرف اور صرف گاڑی کے انجن کی آواز ہی گونجتی رہی تھی کوئی ایسی آواز نہ آئی جس سے مجھے یہ اندازہ ہوتا کہ میرا رابطہ باہر کی دنیا سے قائم ہے۔ نہ کسی گاڑی کے ہارن کی آواز، اور نہ کسی گاڑی کے قریب سے گزرنے کا شور۔

"سنو۔" میں نے دوبارہ بولنے کی کوشش کی۔

"بند کرو اس کا منہ!" اسی شخص کی غراہٹ نے مجھے سہما دیا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

اسی وقت کسی نے میرے جبڑے کو زور سے بھینچا۔ میرے حلق سے چیخ نکلنے والی تھی کہ میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا۔ گاڑی مسلسل چل رہی تھی۔ اب مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ بولنے والا گاڑی میں تنہا نہیں ہے۔ جس نے میرے منہ میں کپڑا ٹھونسا تھا وہ بہت طاقتور لگ رہا تھا۔ اب بھی میرے جبڑے میں سخت تکلیف تھی۔

مجھے ہوش میں آئے تقریباً بیس منٹ ہو چکے تھے مگر ہمارا سفر جاری تھا۔ مجھے فاریہ اور سوہنی وغیرہ کا خیال آ گیا کہ وہ میرے لیے کتنے پریشان ہو رہے ہوں گے' سوہنی تو ممکن ہے ایسی پریشان نہ ہو مگر فاریہ.......... جو تمام حالات سے واقف تھی اور بیگ صاحب' اور سلطان.......... ان تینوں نے مجھے تلاش کرنے کے لیے جانے کیا کیا جتن کیے ہوں۔ نہ معلوم مجھے کوٹھی سے نکلے کتنی دیر ہو گئی۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک گاڑی کی رفتار آہستہ ہو گئی پھر کچھ دیر بعد گاڑی کو بریک لگا دیا گیا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ شاید یہ ہماری منزل آ گئی ہے مگر کافی دیر تک نہ تو دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور نہ ہی ان دونوں میں سے کسی کی آواز۔

میں ابھی اس سکوت پر حیران ہو رہا تھا کہ اچانک میرے کانوں سے ٹرین کی وسل کی آواز ٹکرائی۔ آواز دور سے آئی تھی گویا ہم کسی ریلوے پھاٹک پر کھڑے تھے۔ چند منٹ بعد میرے اس خیال کی اس وقت تصدیق ہو گئی جب زمین ہلی اور ٹرین جس کی رفتار بے حد تیز تھی شور مچاتی ہوئی قریب سے گزری۔ میں نے کان کھڑے کر دیے میں سننا چاہتا تھا کہ گیٹ پر کوئی موجود ہے یا نہیں۔ اصولاً یہاں کسی گیٹ کیپر کو ہونا چاہیے تھا۔ اسی لمحے لوہے کی زنجیر گرنے کی آواز نے مجھے بتا دیا کہ کوئی ہے۔ میں نے چاہا کہ آواز نکالنے کی کوشش کروں مگر یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ بھلا گیٹ کیپر میرے لیے کیا کرے گا۔ اسی وقت گاڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔ آگے بہت کم فاصلے سے کئی موڑ آئے اور میں اندازہ لگاتا رہا کہ ہم دائیں مڑے ہیں یا بائیں مگر شاید یہ سب بے سود تھا۔

میں اس وقت بالکل بے بس تھا اور جو شخص مجھے مارنے کی دھمکی دے چکا تھا اور غالباً گاڑی چلا رہا تھا اس کے لہجے نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ میری کوئی بھی حرکت (اگر میں کر سکتا تو) مجھے بہت مہنگی پڑے گی۔ میں نے خود کو ریلیکس کیا اور بدن ڈھیلا چھوڑ دیا' تاکہ میری توانائی ضائع نہ ہو۔ میرے لیے ان حالات میں یہی بہتر تھا۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

مجھے اندازہ تھا کہ مجھے اغوا کرنے والوں کا تعلق یقیناً بہادر اور سیماں سے ہے' وہ مجھے جہاں بھی لے جاتے' وہاں حالات کو بہرحال میرے سامنے آنا تھا اور ایک اطمینان مجھے یہ تھا کہ وہ لوگ مجھے مارنا نہیں چاہتے اگر ایسا ہوتا تو اس کے لیے اتنا طویل سفر کرنے یا خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ جس طرح میری کنپٹی پر کوئی چیز ماری گئی تھی اسی طرح گولی بھی ماری جا سکتی تھی۔

میں ساکت لیٹا آنے والے حالات کے بارے میں اندازہ لگا رہا تھا کہ اچانک مجھے اس عورت کا خیال آ گیا جسے سڑک پر پڑا دیکھ کر میں نے گاڑی روکی تھی۔ اب تک گاڑی میں کسی عورت کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا تھا' یہ تو ثابت ہو چکا تھا کہ وہ انہی لوگوں کی ساتھی تھی اور مجھے روکنے کے لیے ہی یہ ڈراما کیا گیا تھا۔ اس بات پر بھی مجھے حیرت تھی کہ انہیں کیسے پتا چلا کہ میں اس وقت گھر سے نکلوں گا' اگر ماسی کو لیڈی ڈاکٹر دوائیں لکھ کر نہ دیتی تو شاید میں گھر سے نہ نکلتا۔ یہ قطعی اتفاق تھا کہ مجھے گھر سے نکلنا پڑا اور یہ بھی ...ت تھا کہ میں اس وقت اکیلا تھا ورنہ میرے ساتھ فاریہ بھی ہو سکتی تھی' اور سلطان بھی' یہ اچھا ہی ہوا تھا کہ میں نے سلطان کو وہیں روک دیا تھا ورنہ اس وقت فاریہ اور سوہنی وغیرہ کو دیکھنے والا کون ہوتا؟

میں سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک گاڑی نے ایک موڑ کاٹا اور فوراً ہی رک گئی۔ ذرا دیر بعد مجھے لگا جیسے کوئی بہت بھاری اور بڑا سا گیٹ کھولا گیا ہو۔ کنڈا سا بجنے کی آواز بھی آئی اور دوسرے لمحے گاڑی جھٹکا کھا کر آگے بڑھی۔ تقریباً تین منٹ تک چلنے کے بعد گاڑی رک گئی۔ اگلے دروازے کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی مجھے چوڑیوں کے بجنے کی آواز بھی آئی تھی۔

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ تو گویا وہ عورت بھی کار میں موجود تھی۔

"سب ٹھیک ہے نا؟" ایک آواز آئی۔ آواز ایسی تھی جیسے بولنے والے کا کسی نے گلا دبا رکھا ہو' ایک عجیب سی غرغراہٹ سی تھی آواز میں۔

"ہاں.......... سیٹھ کہاں ہے؟" گاڑی چلانے والے نے پوچھا۔

"اندر ہے۔ اسے تو نکالو۔"

"نہیں جگو' اپن کا کام اسے یہاں تک لانا تھا۔ اپنے سیٹھ کو بولو ہمیں فارغ کرے

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

بس' بہت دور جانا ہے اپن کو۔" گاڑی چلانے والے کی آواز میں اب بھی سفاکی تھی۔

"اسے لے کر اندر چلو' دو منٹ میں تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" پہلی بار نسوانی آواز سنائی دی۔ غالباً یہ وہی عورت تھی جس کی مدد کرنے کے چکر میں پھنس کر میں یہاں پہنچ گیا تھا۔

"میم صاحب' اپن کے سودے میں لاش اٹھانے کا کوئی ذکر نہیں تھا۔" اس نے اکھڑے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"تمہیں بحث کرنے کی بہت عادت ہے؟" اس عورت نے کہا۔ اس کے انداز میں ناراضگی تھی۔

"اپن اتنا ہی کام کرتا ہے جتنا بولا جائے۔ اس پہلوان کو بولو کندھے پر اٹھا کر لے جائے اس کو۔" اس نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں بعد ہی کسی نے میرے دائیں جانب والا دروازہ کھولا اور مجھے بڑی بے دردی سے باہر کی طرف کھینچ لیا۔ میرے دونوں پیر آپس میں بندھے ہوئے تھے اس لیے میں زمین پر پاؤں نہ ٹکا سکا۔ مجھے کھینچنے والے نے مجھے کندھوں پر ڈال لیا اور ایک طرف کو بڑھ گیا۔

"چلو اندر تم بھی۔" اسی عورت کی آواز مجھے اپنی پشت کی جانب سے آئی تھی۔

پھر قدموں کی آواز آئی اور ہم سب چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ کچھ ہی دور چلنے کے بعد ایک دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سے میں سمجھ گیا کہ اب ہم کسی عمارت کے اندر داخل ہو گئے ہیں۔ گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز خاصی اونچی تھی' جو آہستہ ہوتے ہوتے معدوم ہو گئی۔ قدموں کی آواز بھی اب نہیں آ رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ ان سب کے پیروں کے نیچے دبیز قالین ہے۔ یہ سفر بھی خاصا طویل تھا جس شخص نے مجھے کندھے پر اٹھایا ہوا تھا اس کی سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی اور اس کی چال بھی بگڑ چکی تھی۔ گویا وہ مجھے اٹھائے اٹھائے تھک چکا تھا۔

چند منٹ تک مسلسل چلنے کے بعد ہی مجھے اٹھا کر چلنے والا رک گیا۔

"گڈ مارننگ سر!" اسی عورت نے کہا۔

اور میں چونک اٹھا۔ مارننگ۔ گویا صبح ہو چکی تھی۔

"مارننگ!" جواباً کہا گیا۔ "اسے یہاں لٹا دو۔" لہجہ بہت دھیما اور ٹھہرا ٹھہرا سا تھا۔

اس کے اس حکم کے ساتھ ہی مجھے نرم گدے پر ڈال دیا گیا۔

"سیٹھ' ہمارا حساب کر دو۔ ہمیں بہت دور جانا ہے اور رات سے پہلے اپنے اڈے پر پہنچنا ہے۔" وہی آواز سنائی دی جو میں پہلے بھی سن چکا تھا۔

"کیا تم ایک کپ چائے بھی پینا پسند نہیں کرو گے؟" اسی ٹھنڈے اور میٹھے لہجے میں پوچھا گیا۔

"راستے میں پی لیں گے صاب......... پر یہاں دیر تک نہیں رک سکتے۔ اصول نہیں ہے ہمارا۔"

"ٹھیک ہے جگو........" پھر غالباً اشاروں میں کچھ کہا گیا۔ مجھے بریف کیس کھلنے کی آواز آئی جسے میں پہچانتا تھا۔ چند لمحے صرف آہٹیں محسوس ہوتی رہیں۔

"گن لو!" ٹھنڈے لہجے والے نے کہا۔

"بدمعاش کا سب سے پہلا اصول دیانت ہوتا ہے صاب' ہم سے جو کچھ منگوایا' ہم نے دیانت داری سے لا دیا اب جو کچھ تم دو گے اس میں بھی دیانت داری ہی برتو گے۔"

"ہاہا........" وہ ہنسا۔ "دلچسپ بھی ہو؟"

"اجازت ہے؟" اکھڑ شخص نے اس کی ہنسی اور تعریف سے متاثر ہوئے بغیر پوچھا۔

"اوکے' ایز یو لائیک' ویسے میری خواہش تھی کہ ہم دوستوں کی طرح بیٹھ کر ایک کپ چائے پیتے۔"

"ہم دوست ہوتے تو ضرور چائے پیتے صاب۔" پہلے والے شخص نے جواب دیا۔

"مجھے کھرے اور صاف گو لوگ پسند ہیں۔ تم نے مجھے متاثر کیا ہے۔ ہم دوست کس طرح بن سکتے ہیں؟"

"آپ سیٹھ لوگ ہو' ہم اپنی حیثیت کے لوگوں سے دوستی کرتے ہیں۔" پہلے والے نے مختصر جواب دیا اور غالباً وہ رکا نہیں۔ چند لمحوں بعد ہی دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پھر بند ہونے کی آواز کے ساتھ ہی' کسی نے گہرا سانس لیا۔

"جگو اسے مہمان خانے میں پہنچا دو۔" اسی نرم گو آدمی کی آواز آئی۔ "مگر ٹھہرو......... یہ کپڑا نکالو۔"

PVL
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

اور پھر کسی نے میرے حلق میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکال دیا۔ میری جان میں جان آئی مگر حلق بری طرح سوکھ رہا تھا۔ زبان پر جیسے کانٹے سے اُگ آئے تھے۔

"پپ.........پانی.........." بہ مشکل میرے منہ سے نکلا۔

"پانی پلاؤ اسے۔"

پھر پانی کا گلاس کسی نے میرے ہونٹوں سے لگایا تو میں ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر گیا۔ "اور.......... اور دو۔" حلق تر ہوتے ہی مجھ میں توانائی بھر گئی۔

چند لمحوں بعد گلاس پھر میرے ہونٹوں سے لگا دیا گیا۔ میں نے یہ بھی ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

"چچ.......... چچ چچ۔ بہت ظالم تھا وہ شخص.......... اتنے طویل سفر میں پانی بھی نہیں پلایا!" نرم گو شخص نے کہا۔

"پلیز.......... میرے ہاتھ کھول دیں۔ بہت تکلیف ہے۔" میں نے ہمت کر کے کہا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ میری خواہش پوری کرے گا۔

"تم تو ہٹے کٹے مرد ہو۔ پھر تکلیف کیسی..........؟ کافی مضبوط ہے جسم تمہارا۔"

"میں.......... میں آپ کو نہیں جانتا.......... میرا خیال ہے کہ یہ لوگ کسی غلط فہمی کی بناء پر مجھے اٹھا لائے ہیں۔"

"نہیں مسٹر اقبال۔ انہیں کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ وہ صحیح آدمی کو لائے ہیں۔"

اس کے منہ سے اپنا نام سن کر میں حیران رہ گیا۔

"آپ شاید حیران ہو گئے۔ ہونا بھی چاہیے۔ یہ حیرانگی ہی کی بات ہے کہ آپ ہمیں نہیں جانتے مگر ہم آپ کو جانتے ہیں۔ کیوں ہے نا؟"

"میں۔ شاید آپ کو دیکھوں تو پہچان لوں۔"

"نہیں مسٹر اقبال آپ کی یہ خواہش فی الحال پوری نہیں ہو سکتی۔ مجھے کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں۔ رات کو آپ سے ملاقات ہو گی۔"

پھر کچھ دیر خاموشی رہی۔

"انہیں لے جاؤ" چند لمحوں بعد اس نے کہا۔ "اور دیکھو ان کے ہاتھ پاؤں کھول دینا اور کھانا بھی کھلا دینا۔"

مجھے پھر کندھے پر اٹھا لیا گیا۔ کچھ دیر تک یہ سفر جاری رہا۔ شاید چھ سات منٹ تک۔ پھر مجھے گاڑی میں ڈال دیا گیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور ہم پھر کسی نامعلوم سمت روانہ ہو گئے۔ اس بار ہماری منزل زیادہ دور نہیں تھی۔ شاید دس منٹ بعد ہی گاڑی رک گئی۔ گاڑی رکتے ہی دو تین آدمیوں کے قدموں کی آواز قریب آتی محسوس ہوئی۔ دروازہ کھلا۔ کسی نے میرے پیر کھولے۔ میرے دونوں پیروں میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ مجھے آگے کی طرف گھسیٹا گیا اور میرے پاؤں زمین سے ٹکرائے۔ میری سسکاری نکل گئی۔ میرے دونوں پیر سُن تھے۔

"کھڑے ہو جاؤ۔" یہ اسی شخص کی آواز تھی جسے مجھے لانے والے نے جگو کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

"نہیں ہو سکتا.......... میرے پاؤں سُن ہیں۔" میں نے بیچارگی سے کہا۔

مگر اس نے میری بات پر دھیان نہ دیا اور مجھے کھینچ کر کھڑا کر دیا۔ میں لڑکھڑایا مگر مجھے دو آدمیوں نے دونوں طرف سے تھام لیا۔ اسی وقت میری کمر سے کوئی نوکیلی چیز ٹکرائی۔

"سنو مسٹر' میرے ہاتھ میں پستول ہے۔ اور اس میں گولیاں بھی ہیں۔ بالکل خاموشی سے اسی طرف چلتے رہو۔ جہاں لے جایا جا رہا ہے۔"

"میرے خیال میں مَیں نے اب تک کوئی مزاحمت نہیں کی۔" میں نے روکھے انداز میں کہا۔

"اس وقت تمہارے پیر بھی بندھے ہوئے تھے مسٹر۔" اس نے غرا کر جواب دیا۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ ہم چند منٹ چلنے کے بعد رکے۔ کوئی دروازہ کھولا گیا۔ پھر کسی نے مجھے بتایا کہ آگے سیڑھیاں ہیں۔ میں نے سنبھال کر پاؤں آگے بڑھایا ورنہ شاید میں خود پر قابو نہ رکھ پاتا۔ یہ سیڑھیاں کافی تھیں اور نیچے کی طرف جا رہی تھیں' جوں جوں ہم نیچے اتر رہے تھے حبس بڑھتا جا رہا تھا اور ایک عجیب سی بو کا احساس بڑھ رہا تھا۔ میں کچھ اندازہ نہ لگا پایا۔

سیڑھیاں ختم ہوتے ہی مجھے دونوں جانب سے پکڑنے والے آدمیوں نے چھوڑ دیا۔ "اس کی پٹی کھول دو۔" جگو کی آواز آئی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

دوسرے ہی لمحے میری آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی۔ میں نے جونہی آنکھیں کھولیں، گھبرا کر دوبارہ بند کرلیں۔ میری آنکھیں میں جلن سی ہونے لگی تھی۔ چند لمحوں بعد میں نے پھر آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ بہت ہلکی روشنی اوپر کے روشن دان سی اندر آ رہی تھی۔ جس میں تین آدمیوں کے ہیولے میرے سامنے تھے مگر کسی کی بھی شکل نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک شخص ان میں کافی موٹا تھا جو میرے دائیں جانب کھڑا تھا اور اسی کے ہاتھ میں پستول تھا۔

"اے تم اس کا کھانا لے آؤ۔" موٹے آدمی نے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہی جگو ہے۔

دوسرا آدمی تیزی سے باہر کی طرف چلا گیا۔ وہ دونوں یونہی میرے سامنے کھڑے رہے۔ دونوں خاموش تھے۔ میں بار بار پلکیں جھپکا رہا تھا میری آنکھوں میں اب بھی جلن ہو رہی تھی اور اب تو پانی بھی بہنے لگا تھا۔ میرے ہاتھ ابھی تک بندھے ہوئے تھے۔

کچھ دیر بعد پہلا شخص ایک ٹرے ہاتھ میں اٹھائے اندر آ گیا۔ ٹرے اس نے میرے سامنے رکھ دی پھر میری پشت پر جا کر ہاتھ کھولے۔ میری کلائی پر مرچیں سی لگ رہی تھیں۔ شاید رسّی کی وجہ سے کلائی چھل گئی تھی۔ میں کچھ دیر اپنی دونوں کلائیوں کو مسلتا رہا۔

"چلو.........." جگو نے ان دونوں سے کہا اور وہ تینوں اس دروازے کی طرف بڑھ گئے جہاں سے اوپر جانے والی سیڑھیاں شروع ہوتی تھیں۔ میں انہیں جاتا دیکھتا رہا۔ انھوں نے جاتے ہوئے دروازے کو باہر سے تالا ڈال دیا تھا۔

ان تینوں کے باہر جاتے ہی چھت پر لٹکا ہوا بلب روشن ہو گیا۔ شائد لائٹ کا بٹن سیڑھیوں پر ہی کہیں تھا جسے انہوں نے جاتے ہوئے آن کر دیا تھا۔ بلب شاید ساٹھ واٹ کا تھا۔ کیوں کہ روشنی بہت کم تھی۔ میں بھوک سے بے حال تھا روشنی ہوتے ہی میں نے ٹرے اپنی جانب سرکائی ایک پلیٹ میں سبزی تھی اور دو چپاتیاں تھیں۔ مجھ ایسے ہٹے کٹے شخص کے لیے یہ کھانا نہ ہونے کے برابر تھا مگر پھر بھی غنیمت تھا۔ میں نے پانچ منٹ میں سب ختم کر دیا۔ پانی گلاس بھی ٹرے میں ہی رکھا تھا میں نے پانی پیا اور ٹرے ایک جانب سرکا دی۔ اب میں حواسوں میں آ چکا تھا۔ کھانا پیٹ میں پڑا تو احساس ہوا کہ بھوک پیاس اور شدید تھکن سے بہت کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی میں نے

کمرے پر طائرانہ نگاہ ڈالی۔ یہ کسی بہت ہی قدیم عمارت کا کمرا لگتا تھا جس کی چھت بہت اونچی تھی اور چھت سیدھی اور سیمنٹ کی نہ تھی بلکہ تکونی تھی یعنی جس طرح ہٹ کی چھت ہوتی ہے، چھت لکڑیوں کی بلیوں پر ٹکی ہوئی لگتی تھی اور چھت سے ایک بہت لمبا تار لٹکا ہوا تھا۔ اور تار میں یہ بلب روشن تھا۔ بجلی کے اس تار کو ہزاروں کھیاں چمٹی ہوئی تھیں۔ کمرا بے حد ٹھنڈا تھا اور اس میں صرف ایک دری پڑی تھی جس پر میں بیٹھا تھا۔ نہ کوئی فرنیچر تھا نہ ہی کوئی اور چیز، پورا کمرا خالی تھا۔ دیواروں کا پلستر جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا چھت سے شاید گز بھر نیچے دو روشن دان تھے اور ان روشن دانوں پر لوہے کی جالی لگی ہوئی تھی۔ گویا یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا سوائے اس دروازے کے جس سے ہم اندر داخل ہوئے تھے۔

مجھے حیرانگی اس بات کی تھی کہ یہ شخص کون ہے؟ اگر مجھے اغوا کرنے والا بہادر ہے تو وہ سامنے کیوں نہیں آیا؟ اس عورت کی آواز بھی سیماں سے بہت مختلف تھی اور پھر اس عورت نے اس شخص کو "سر" کہہ کر مخاطب کیا تھا جبکہ سیماں بہادر کو انکل کہا کرتی تھی۔ سوالات کا طوفان تھا جو میرے ذہن میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا مگر میں نے سب کچھ ذہن سے جھٹک دیا اور دری پر لیٹ گیا۔ میرے بدن میں بے انتہا درد تھا۔ رات بھر کار کی سیٹ پر سکڑے پڑے رہنے سے میرا اعصاب بے حد متاثر ہوئے تھے۔ میں سب کچھ بھول کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ نیند بہت دیر سے آئی مگر آ گئی۔

پھر میری آنکھ کسی کی ٹھوکر سے کھلی تھی۔ میں اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں پھر اندھیرا تھا۔ ہلکی روشنی میں مجھے تین سائے کھڑے نظر آئے جن میں ایک یقیناً عورت کا سایہ تھا۔

"اوہ۔ اس طرح نہیں جگو۔ آرام سے، مہمانوں سے ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تمہیں!" وہی میٹھا لہجہ سنائی دیا۔

"مسٹر اقبال، کیسے ہیں آپ۔ میرے خیال میں کافی فریش ہو گئے ہوں گے؟"

"جی.......... جی کافی بہتر ہوں۔" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا۔

"مسٹر اقبال، بات مختصر کروں گا۔ مجھے آپ سے چند ضروری کام لینے ہیں، ایسے کام جنہیں آپ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ بہترین معاوضہ اور زندگی کی ضمانت بھی دوں گا۔ نہ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

کام ایسا نہیں جو قانوناً یا اخلاقاً جرم ہو مگر شاید آپ اسے جرم سمجھیں' بہرحال اگر آپ میرے لیے دو کام کر دیں تو میں بڑا احسان مند ہوں گا۔"

"کام کی نوعیت جانے بغیر میں کچھ بھی کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں' اگر آپ کچھ تفصیل سے بتا دیں تو شاید فیصلہ کرنا آسان ہو جائے۔" میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

"گڈ......... ویری گڈ......... اچھی بات ہے' ویسے مجھے امید ہے کہ آپ میری بات مان جائیں گے۔" اگر آپ دوستانہ ماحول میں گفتگو کرنا پسند کریں تو میں آپ کے ساتھ بہتر سلوک کر سکتا ہوں۔" اس نے دونوں ہاتھوں کو سینے پر باندھتے ہوئے کہا۔ وہ ٹانگوں کو ذرا سا پھیلا کر بڑے پراعتماد انداز میں کھڑا تھا۔

"معاف کیجئے گا' میرے چاہنے نہ چاہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا میں ہر حال میں دوستانہ ماحول میں گفتگو کرنا پسند کروں گا' ویسے بھی میں ایسی پوزیشن میں نہیں ہوں کہ غیر دوستانہ رویہ اختیار کر سکوں۔" میں نے جواب دیا۔

"ہوں......... یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ میں پہلے تو کچھ روز آپ کو اپنا مہمان بنانا چاہتا ہوں۔ پلیز اگر آپ قبول کر لیں تو میں اچھی طرح سے میزبان کر سکوں گا' پھر بعد میں......... یعنی کچھ پرابلمس ہیں ان کے حل ہو جانے کے بعد میں آپ کو کام کی نوعیت سے آگاہ کر سکوں گا۔"

"آپ جس میزبانی اور دوستانہ ماحول کی باتیں کر رہے ہیں وہ مجھے یہاں نظر تو نہیں آ رہا......... میں نہ آپ کا نام جانتا ہوں نہ آپ کو پہچانتا ہوں۔ یوں اندھیرے تہہ خانے میں پڑے رہ کر میں جس میزبانی کا مظاہرہ دیکھ رہا ہوں' وہ اپنی نوعیت کی منفرد میزبانی ہے۔"

"میں اسی لیے شرمندہ ہوں اور آپ سے درخواست کر رہا ہوں کہ اگر آپ دل سے میرا مہمان بننا قبول کریں تو میں بھی اس ذہنی اذیت سے آزاد ہو سکوں گا۔ پلیز........."

"میں آپ کا مہمان ہی ہوں مسٹر.........۔" میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا' میں اس کا نام جاننا چاہتا تھا۔

"زید......... مسٹر زید" اس نے جواب دیا اور آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھا دیا۔

اب مجھے اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہونے لگا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس کا ہاتھ اس کی نرم روی کا غماز تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی انتہائی نرم و نازک سی لڑکی سے ہاتھ ملا رہا ہوں۔

"بیٹھیں......... تشریف رکھیں آپ!" اس نے اس انداز میں ہاتھ سے اشارہ کیا جیسے وہ اپنے ڈرائنگ روم میں بچھے کسی قیمتی صوفے کی طرف اشارہ کر رہا ہو۔

میں جھینپا جھینپا سا اس میلی اور مٹی میں اٹی دری پر بیٹھ گیا۔ وہ پھر ہاتھ سینے پر باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کن لوگوں میں پھنس گیا ہوں۔ وہ عورت اور جگو خاموش' سر جھکائے کھڑے تھے۔

"جگو' مسٹر اقبال کو پوری تعظیم کے ساتھ ان کے بیڈ روم میں پہنچا دو۔ ان کا ہر طرح خیال رکھنا تمہاری ذمے داری ہے۔" یہ کہہ کر وہ میری جانب مڑا۔ "اوکے مسٹر اقبال۔ میں ذرا ایک میٹنگ میں جا رہا ہوں۔ رات کا کھانا آپ ہی کے ساتھ کھاؤں گا۔ آپ اس دوران میں نہا دھو کر آرام کر لیجئے گا۔" اتنا کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ عورت اس کے پیچھے چلی گئی۔ جگو وہیں کھڑا رہا۔ میں اس شخص کو جاتے دیکھتا رہا۔ وہ ایک قد آور اور اسمارٹ شخص تھا۔ اس کے جاتے ہی جگو آگے بڑھا۔ لمحہ بھر کو میرا دل دھڑک اٹھا۔

"آئیے سر!" اس نے انتہائی ادب سے کہا۔ میں حیران ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا مگر اس کمرے میں میرے سوا کوئی نہ تھا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں تو سمجھا کہ اس شخص نے شاید میرے لیے کوڈ ورڈ میں کوئی سفاک حکم دیا ہو گا۔

"آئیے سر' آپ کو آپ کا کمرا دکھا دوں۔" اس نے پھر ادب سے کہا۔

میں بے یقینی کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ ہم سیڑھیوں سے ہوتے ہوئے اوپر پہنچ گئے۔ اوپر پہنچ کر میں سکتے میں رہ گیا۔ سیڑھیاں ختم ہوتے ہی اور دروازے سے باہر نکلتے ہی مجھے لگا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ وہ اتنی ہی خوابناک جگہ تھی۔ یہ ایک بہت ہی بڑا کمرا تھا اور ایسا شاندار کمرا تھا کہ مجھے یقین نہ آیا

PVL PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

کہ اسی کمرے کے ایک منقش دروازے کے اس طرف جو سیڑھیاں نیچے کی طرف جاتی ہیں ان کے اختتام پر وہی تہہ خانہ ہے جسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے ہم دنیا کی قدیم عمارت کے کھنڈر میں ہیں۔

میں نے اتنا خوب صورت کمرا شاید زندگی میں پہلی اور آخری بار دیکھا تھا۔ قیمتی اور نادر فرنیچر اور فرنیچر بھی ایسا کہ شاید کوئی تصور ہی نہ کر سکے۔ دائیں جانب کی دیوار کچھ اس طرح بنائی گئی تھی کہ لگتا تھا پہاڑ ہی پہاڑ ہیں جن سے آبشار بہہ کر پورے زور سے نیچے پڑے بڑے بڑے پتھروں سے ٹکرا رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر دیکھا وہ دیوار نہیں تھی وہاں واقعی آبشار گر رہا تھا۔ میں نے چہرے پر چھینٹے محسوس کیے اور تب ہی میں گھٹنوں تک اونچی اس دیوار سے ٹکرا گیا جو نصف دائرے کی شکل میں آبشار اور میرے درمیان بنی ہوئی تھی۔ یہ مصنوعی آبشار تھا۔ نصف دائرے کی شکل میں بنی ہوئی اس دیوار کے دوسرے کنارے پر خوب صورت سینریز بنی ہوئی تھیں جو دور سے دیکھنے پر فریم کی ہوئی سینری لگتی تھیں مگر قریب جا کر معلوم ہوتا تھا کہ ان تصویروں کو اسی دیوار پر بنایا گیا ہے۔

کمرے کے بیچوں بیچ سرخ رنگ کا گول قالین بچھا ہوا تھا۔ جس کے چاروں طرف گولائی میں ہی صوفہ اور سائیڈ ٹیبلز بنائی گئی تھیں۔ کمرے کے کونوں میں بڑے بڑے منقش گلدان رکھے تھے۔ خوب صورت پردے اور انتہائی نفیس اور قیمتی ڈیکوریشن پیس تھے جو قدیم اور نادر معلوم ہوتے تھے۔

میں بالکل بھول چکا تھا کہ جگو میرے ساتھ ہے' وہ مجھے ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے دیکھے گا تو کیا سوچے گا۔ میں واقعی بالکل گم صم ہو چکا تھا۔ مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ خود کو خواب اور حقیقت کے درمیان معلق دیکھ کر میں نے اپنے بازو میں چٹکی کاٹی۔ سخت تکلیف نے مجھے احساس دلا دیا کہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ حقیقت ہے۔ میں نے پلٹ کر جگو کی طرف دیکھا' جو کسی زر خرید غلام کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔ تیز روشنی میں مجھے وہ بوتل کا جن لگا' موٹا' بدہیت اور گنجا۔

مجھے اپنی جانب متوجہ پا کر اس نے ہاتھ سے بائیں طرف کے دروازے کی طرف اشارہ کیا اور کہا "سر آپ کا کمرا اس طرف ہے۔" میں اس طرف بڑھ گیا۔

جگو نے لپک کر دروازہ کھولا' اب میں ایک اور حسین کمرے میں تھا جو بیڈ روم تھا۔ یہاں بھی ہر چیز قیمتی' خوب صورت اور نفیس تھی۔ میں نے حیران ہونے کی کوشش نہیں کی اور جگو سے مخاطب ہوا "کیا یہی میرا کمرا ہے؟"

"جی سر! یہ اس طرف باتھ روم ہے۔ آپ کے بیڈ کے سرہانے بیل کا بٹن لگا ہے' کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو آپ مجھے بلوا سکتے ہیں یہ انٹر کام ہے۔ سات نمبر میرے کمرے کا ایکسٹنشن ہے۔" یہ کہہ کر وہ ایک دیوار کے قریب چلا گیا' جہاں آف وہائٹ اور سنہرے رنگ سے بنی ہوئی وارڈ روب تھی۔ جگو نے اس کا سنہری ہینڈل پکڑ کر کھول دیا۔ اندر بڑی نفاست سے ہینگر پر کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔

"یہ آپ کے کپڑے ہیں۔ آپ نہا کر کپڑے بدل لیجئے گا۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہاں قدم قدم پر اسراف تھا۔ جس نے میرے اعصاب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ یہ کمرا بھی بے حد بڑا تھا۔ اس کمرے کے بھی بیچوں بیچ گول بیڈ تھا جو آف وہائٹ اور سنہرے رنگوں کا امتزاج تھا۔ پورے کمرے کا فرنیچر اسی طرح کا تھا جس میں ڈریسنگ ٹیبل' چار بے حد خوب صورت ڈیزائن کی کرسیاں' ایک ٹیبل اور ایک الماری شامل تھی۔ اسی رنگ کے پردے تھے۔ میں بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر جگو اسی دروازے کی طرف بڑھ گیا جہاں سے ہم داخل ہوئے تھے۔ میرے کان دروازے پر لگے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ دروازہ باہر سے لاک کر دیا گیا ہو گا مگر میں نے ایسی کوئی آواز نہ سنی۔ میں چند لمحے اسی طرح کھڑا رہا۔ پھر میں نے دبے قدموں آگے بڑھ کر دروازے کے ہینڈل کو پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ اب مجھ میں حیران ہونے کا دم نہیں تھا اس لیے میں سپاٹ ذہن لیے دروازہ بند کر کے بیڈ تک آ گیا۔ بستر بے حد نرم تھا۔ میں بیٹھا تو اس میں دھنستا چلا گیا۔ کمرے میں بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ بیڈ پر بہت سے کشن پڑے تھے میں کشن سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں بادلوں پر لیٹا ہوا ہوں۔ نرم' خنک اور خوشبوؤں سے معطر بادل۔

میں کافی دیر تک یونہی آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ شاید آدھا گھنٹا اسی طرح گزر گیا۔ میرا ذہن اس نئی گتھی کو سلجھانے میں لگا ہوا تھا مگر گتھی کا سرا ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ تب میں تھک گیا۔ میں نے سوچ لیا کہ خود کو ہلکان کرنے سے بہتر ہے کہ حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا جائے۔ جو کچھ ہو گا سامنے آ ہی جائے گا۔ مجھے اپنے بارے میں کوئی خوف نہ تھا۔ پریشانی تھی تو صرف فاریہ اور سوہنی وغیرہ کی طرف سے کہ جانے وہ لوگ کس حال میں ہوں گے۔ میں نے صدقِ دل سے دعا مانگی کہ خدا کرے وہ خیریت سے ہوں۔ پھر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے باتھ روم کا دروازہ کھولا۔ باتھ روم بھی بے حد خوب صورت تھا۔ ضرورت کی ہر چیز اور دنیا کی ہر خوشبو وہاں موجود تھی۔ میں تقریباً گھنٹا بھر تک نہاتا رہا پھر وہاں ٹنگی ہوئی باتھ روب پہن کر کمرے میں واپس آ گیا۔

الماری کھول کر میں نے ایک سوٹ اپنے لیے منتخب کیا اور اسے پہن کر حیران ہو گیا لگتا تھا جیسے درزی کو میرا ناپ دے کر سلوایا گیا ہو۔ کپڑے بدل کر میں نے کلون لگایا جو خاصا مہنگا تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر سگریٹ کیس رکھا تھا اور اسی ٹیبل پر موم بتی نما ایک سنہرا لائٹر بھی موجود تھا۔ میں نے ایک سگریٹ سلگایا اور کرسی پر بیٹھ کر لمبا کش لیا۔ مجھے چائے کی شدید طلب محسوس ہوئی تو میں نے انٹر کام اٹھا کر سات نمبر دبایا۔ دوسری جانب سے فوراً ہی جگو کی آواز آئی۔ "لیس سر!"

"جگو میں چائے پینا چاہتا ہوں۔"

"ابھی حاضر ہوا۔" جواباً کہا گیا اور رابطہ منقطع ہو گیا۔

چند لمحوں بعد ہی جگو چائے کی ٹرالی لے آیا جس میں چائے کے ساتھ لوازمات بھی تھے۔ مجھے ایک دم ہی بھوک کا احساس ہونے لگا۔ میں نے جو کھانا تہہ خانے میں کھایا تھا اسے کھانا تو نہیں کہا جا سکتا تھا۔ جگو نے خود ہی چائے کا کپ بنایا اور میرے سامنے رکھ دیا۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔" میں نے چائے میں چمچہ ہلاتے ہوئے جگو سے کہا۔

جگو ذرا سا جھکا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں ٹرے پر ٹوٹ پڑا۔ وہ جو کچھ بھی لایا تھا میں نے سب کھا لیا' دو کپ چائے پی اور بے دم سا بیڈ پر پڑ گیا۔ پیٹ بھر جانے کے بعد مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی اور پھر نہ معلوم کب آنکھ لگ گئی۔

میری آنکھ انٹر کام کی بیل بجنے کی آواز پر کھلی۔ میں نے ہڑبڑا کر ریسیور اٹھایا۔

"لیس!"

"سر.......... مسٹر زید آپ کو یاد کر رہے ہیں' اگر آپ تیار ہیں تو میں لینے آ جاؤں!" جگو کی آواز سے میں پوری طرح جاگ گیا۔

"ہاں.......... تم آ جاؤ۔" میں نے جواب دیا اور ریسیور رکھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے پہنچ گیا۔ قدِ آدم آئینے میں خود کو دیکھا' کپڑوں کی کریز صحیح کی۔ بالوں کو اچھی طرح جمایا اور آفٹر شیو چہرے پر لگا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

چند لمحوں بعد دروازے پر ہلکی دستک سنائی دی۔ "کم ان!" میں نے اونچی آواز میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی جگو اندر داخل ہوا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے آبشار والے کمرے سے گزر کر ایک لمبی کوریڈور میں آ گئے۔ کوریڈور میں دور تک قالین بچھا ہا تھا۔ دیواروں پر خوب صورت تصاویر آویزاں تھیں۔ جگہ جگہ بڑے بڑے گلدان رکھے تھے۔ ٹیبل تھی جہاں ٹیلی فون رکھا تھا اور چھت پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے فانوس لٹکے ہوئے تھے۔ اس کوریڈور میں دائیں بائیں کئی دروازے تھے جو بند تھے۔ جگو مجھ سے چند قدم آگے تھا۔ وہ ایک بڑے سے دروازے کے سامنے رک گیا۔ اس نے ہلکی سی دستک دی پھر دروازہ کھول کر ایک طرف ہو گیا' مجھے اس نے اندر جانے کا اشارہ کیا میں جھجکتا ہوا اندر داخل ہوا۔

وہ سامنے ہی کھڑا تھا۔ گرے کلر کے سوٹ پر میرون ٹائی اور جیب میں سے جھانکتا ہوا اسی رنگ کا رومال' اس پر بے حد خوب صورت لگ رہا تھا۔ وہ خود بھی بے حد خوب صورت تھا۔ اس کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان ہو گی۔ کنپٹی پر سفید بال اس کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہے تھے۔ کھڑا ناک نقشہ' گورا رنگ اور گھنے گھونگریالے بال۔ وہ مردانہ وجاہت کا حسین نمونہ تھا۔

مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر دلفریب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "آیئے مسٹر اقبال' آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"ج.......... جی نہیں۔" میں خود کو مضبوط بنانے کی کوشش کرنے کے باوجود اس سے مرعوب ہو گیا اور میری زبان لڑکھڑا گئی۔

"آئندہ بھی نہیں ہو گی۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

میں جس کمرے میں تھا وہ ایک ہال نما کمرا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے یہ کوئی کانفرنس روم ہو۔ سائیڈ پر صوفے رکھے تھے مگر کمرے کے درمیان میں ایک بہت بڑی ٹیبل تھی جس کے چاروں طرف بہت سی کرسیاں رکھی تھیں۔ کمرا نفاست سے سجایا گیا تھا۔ یہاں بھی نادر اشیاء کی بہتات تھی۔

میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''مسٹر اقبال' آپ نے میری میزبانی قبول کرنے کا ثبوت دے دیا جس سے میں بے حد خوش ہوں۔''

''میں سمجھا نہیں!''

''یہ کہ آپ نے اپنے کمرے سے نکلنے یا فرار ہونے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ دروازے کھلے ہوئے تھے اور آپ اگر چاہتے تو جا سکتے تھے۔ میں نے سب سے کہہ دیا تھا کہ اگر آپ جانے کی کوشش کریں تو آپ کو نہ روکا جائے۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا۔ یہی میری میزبانی قبول کرنے کا ثبوت تھا۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

اس کی اس بات نے مجھے حیران کر دیا کہ میں مکمل طور پر آزاد تھا ورنہ میرا خیال تو یہ تھا کہ اندر نہ سہی مگر باہر ضرور پہرے بٹھائے گئے ہوں گے۔ بہرحال میں ان حالات میں اس کی بات پر اعتبار کرنے پر مجبور تھا کہ میں نے فرار ہو کر یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ میں آزاد ہوں یا نہیں۔ ویسے بھی ان حالات کے اسرار نے مجھے اتنا مجبور تو کر ہی دیا تھا کہ میں یہاں رک کر خود کو اغوا کر لینے کا مقصد جانے بغیر جا بھی نہیں سکتا تھا اور نہ ہی مجھے جانا چاہیے تھا۔

''مسٹر زید' مجھے آپ کی میزبانی نے کافی متاثر کیا ہے۔ یہ میزبانی قبول نہ کرنا کفرانِ نعمت ہوتا۔''

''شکریہ مسٹر اقبال!''

''ویسے میں جلد از جلد یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ مجھے کیسے جانتے ہیں اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

''کیوں.......... کیا آپ کو جانے کی جلدی ہے؟''

''ظاہر ہے.......... میرے اس طرح آ جانے سے گھر کے لوگ پریشان ہوں گے۔''

''تو آپ انہیں ٹیلی فون کر کے بتا دیجئے کہ آپ کو اچانک کراچی آنا پڑ گیا اور آپ

چند ہی روز میں واپس پہنچ جائیں گے۔''

''یہ.......... یہ کراچی ہے؟'' میں اچھل پڑا۔

''جی مسٹر اقبال.......... میں آپ کو اس طرح لائے جانے پر شرمندہ ہوں مگر یہ میری مجبوری تھی' پلیز آپ مائنڈ نہ کیجئے گا۔''

میں چند لمحے گنگ بیٹھا رہا۔ کراچی آنے کی میری بھی بہت خواہش تھی۔ میں نے کراچی کے بارے میں بہت کچھ گاؤں میں ہی سن لیا تھا اور کراچی کو کسی پرستان کی طرح اپنے خوابوں میں بھی دیکھا تھا مگر یوں اچانک اور بے خبری میں کراچی پہنچ جاؤں گا یہ گمان بھی نہ تھا مجھے۔

''مسٹر اقبال.......... آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے نا؟''

میں چونک اٹھا۔ جی.......... جی ہاں۔ نہیں' ایسی کوئی بات نہیں مسٹر زید' جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا ہے۔ اب ہمیں آئندہ کے بارے میں گفتگو کرنا چاہیے یہ سب کچھ میرا لیے بڑا حیران کن ہے اور میں حیرانگی کی اس کیفیت سے نکلنا چاہتا ہوں نکلنا چاہتا ہوں۔''

''ضرور مسٹر اقبال۔ وقت تو میرے پاس بھی بہت کم ہے' ویسے اب زاریہ کا کیا حال ہے؟''

زاریہ کے نام پر میں پھر اچھل پڑا مگر بہت جلد میں نے خود کو سنبھال لیا۔ ''وہ اب ٹھیک ہے.......... آپریشن کامیاب ہو گیا ہے ورنہ مجھے تو اس کی موت کا یقین ہو گیا تھا۔'' میں نے قطعی نارمل لہجے میں بتایا۔ بالکل اس طرح جیسے میں کسی بہت ہی قریبی عزیز کو اس کے بارے میں بتا رہا ہوں۔

''ہاں' مجھے جب علم ہوا کہ وہ کوما میں چلی گئی ہے تو میں خود بھی پریشان ہو گیا تھا۔ میرا مقصد قطعی اسے تکلیف پہنچانا نہیں تھا مگر..........''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میرے دماغ میں اتھل پتھل شروع ہو چکی تھی۔ اس کے اس جملے سے ظاہر ہوتا تھا کہ زاریہ محض انہی کی وجہ سے اس حال کو پہنچی ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی سوال کرتا دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک نے مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

''یس کم ان!'' مسٹر زید نے اونچی آواز میں کہا۔ دروازہ دھیرے سے کھلا اور ساتھ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

ہی میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

یہ وہی لڑکی تھی جسے میں میڈیکل اسٹور پر دیکھ چکا تھا' جس کی شہادت کی انگلی کا ناخن نہیں تھا یا یوں کہہ لیجئے کہ عذرا کے بھیس میں فاریہ کی کوٹھی جانے اور زاریہ کو زخمی کرنے والی یہی تھی۔

"گڈ ایوننگ باس!" وہ ذرا سا جھکی اور پھر مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی! "گڈ ایوننگ مسٹر اقبال!"

"آؤ زینی.......... میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔" مسٹر زید نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں اب تک سکتے کے عالم میں تھا۔ وہ لڑکی اس وقت فیروزی ساری میں ملبوس' فیروزے کا ہلکا سا سیٹ پہنے' بالوں کا جوڑا بنائے کسی شہزادی سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کمرا بھینی بھینی خوشبو سے مہک اٹھا تھا۔ میرے اور مسٹر زید کے کپڑوں سے اٹھنے والی خوشبو پھیکی پڑ گئی تھی۔

وہ بڑے پُروقار انداز میں چلتی ہوئی میرے قریب والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ قریب آنے پر وہ اور زیادہ پیاری لگی۔ اس لڑکی سے بہت مختلف جسے میں نے میڈیکل اسٹور پر دیکھا تھا۔ میرے ذہن میں کہیں دور یہ احساس موجود تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے مگر پھر بھی وہ مجھے مختلف لگ رہی تھی' میں نے گھبرا کر اس پر سے نگاہیں ہٹا لیں اور ذہن کو اس کے جادو سے آزاد کرنے کے لیے تمام خیالات کو جھٹک دیا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ مسٹر زید نے دستک دینے والے کو اندر آ جانے کو کہا۔ آنے والا ایک باوردی ویٹر تھا جس نے ایک ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ ٹرے سے کافی کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس نے ہمارے سامنے کافی کے خوب صورت کپ رکھے اور مؤدب ہو کر واپس چلا گیا۔

"ویل مسٹر اقبال.......... ہم آپ کے بارے میں بہت زیادہ کچھ نہیں جانتے مگر جاننے کی خواہش رکھتے ہیں۔" مسٹر زید نے کافی کا کپ اٹھا کر اس میں اٹھتی ہوئی بھاپ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ میرے بارے میں کیا جانتے ہیں' میرا مطلب ہے کتنا جانتے ہیں؟"

"صرف اتنا کہ آپ کی انٹری بہت ڈرامائی تھی' آپ ایک سیدھے سادے اور دیہاتی آدمی تھے' پھر اچانک ہی آپ بے حد ذہین' چست و چالاک اور اسمارٹ نوجوان کی صورت میں سامنے آ گئے' بے حد ایکٹو اور ویری انٹیلی جنٹ۔ مگر یہ تبدیلی آپ میں اتنی جلد اور اچانک کیوں آئی اور کیسے آئی' یہ پتا نہیں چل سکا' اور یہ بھی نہیں معلوم کہ آپ کہاں سے آئے ہیں' یہی وہ باتیں ہیں جو ہم جاننا چاہتے ہیں۔"

"یہ سب باتیں جاننا آپ کے لیے غیر ضروری ہوگا' بہتر تو یہی ہے کہ ہم بات کو ماضی سے شروع کرنے کی بجائے حال سے شروع کریں۔"

"لیں' اصولاً تو یہی ہونا چاہیے مگر یہ رسمی باتیں ہیں اور پہلی تفصیلی ملاقات میں بات اگر رسمی باتوں سے شروع ہوتی ہے تو آدمی میں جلد ہی ترتیب اور خود اعتمادی پیدا کر دیتی ہے۔ میں یہ سب محض اپنے اور آپ کے درمیان اپنائیت کی فضا پیدا کرنے کے لیے پوچھ رہا ہوں۔"

"پھر تو ایسے ہی سوال مجھے بھی کرنا پڑیں گے تب کیا آپ جواب دینا پسند کریں گے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"یقیناً بلکہ میں آپ کو پہلے اپنے بارے میں ہی بتا دوں تاکہ آپ مطمئن ہو جائیں' ویسے آپ کی تعریف کروں گا کہ آپ کو اپنا دفاع کرنا آتا ہے۔"

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

"شکریہ مسٹر زید.......... میرا اتنا استحصال کیا گیا ہے کہ میں لاشعوری اور غیر ارادی طور پر پہلے دفاع کرتا ہوں' امید ہے آپ مائنڈ نہیں کریں گے۔ ویسے بھی اصولاً دفاع مجھے کرنا ہے آپ کو نہیں۔ آپ کے ذہن میں میرے بارے میں یقیناً کوئی پلان ہے مگر میرا ذہن کسی کورے کاغذ کی طرح ہے' میں خوفزدہ بھی ہو سکتا ہوں اور متجسس بھی جبکہ آپ کے ساتھ ایسا نہیں ہے آپ کے اعصاب پر کوئی بوجھ نہیں ہے اور میں.......... میرے اعصاب پے درپے حالات کی وجہ سے شل ہو چکے ہیں۔"

"آئی ایم سوری مسٹر اقبال کہ آپ کو میری وجہ سے ذہنی اذیت اٹھانا پڑی' سب سے پہلے تو آپ لاہور فون کر کے خود کو ایک بڑی پریشانی سے بچا لیں۔ خیریت معلوم بھی کر لیں اور اپنی خیریت سے بھی انہیں آگاہ کر دیں۔" مسٹر زید نے کافی کا کپ خالی کر کے ٹیبل پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر واقعی تاسف تھا اور کوئی ایسی بات تھی

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

جو مجھے اطمینان دلا رہی تھی۔

"نہیں مسٹر زید' مجھے اپنی اس غیر حاضری کے لیے کوئی ایسا جواز بھی چاہیے جسے وہ لوگ بالخصوص فاریہ قبول کر سکے۔ وہ بے انتہا ذہین ہے اور یہ بھی جانتی ہے کہ میں اس کی اجازت یا اس کے علم میں لائے بغیر ایسی کوئی حرکت نہیں کر سکتا۔"

"اوکے' ایز یو لائک' اب آپ مجھ سے کوئی سوال کرنا چاہیں تو کریں' میں جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں میں یہ جاننا چاہوں گا کہ فاریہ اور بیگ صاحب سے آپ کا کیا تعلق یا دشمنی ہے؟"

"میرا کوئی تعلق یا دشمنی نہ بیگ صاحب سے ہے اور نہ فاریہ سے۔" اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

"آں؟" میں حیران ہو گیا۔ اس نے زاریہ پر یہ حملہ کرایا' وہ کوما میں چلی گئی گویا موت کے منہ میں چلی گئی تھی' مجھے اغوا کرایا اور کہہ رہا تھا کہ اس کی کوئی دشمنی زاریہ یا فاریہ یا پھر بیگ صاحب سے نہیں۔ "میں سمجھا نہیں۔" میں نے ان دونوں کو باری باری دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"سیدھا سا جملہ تھا اور اس جملے کا ایک ہی مفہوم بھی تھا کہ میری کوئی دشمنی نہ بیگ صاحب سے ہے اور نہ فاریہ سے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں انہیں صرف اسی وقت سے جانتا ہوں جب سے میں آپ کو جانتا ہوں۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"مسٹر زید! آپ شاید میرے سوالوں کا جواب دینا نہیں چاہتے!" میں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"ارے مسٹر اقبال ایسی کوئی بات نہیں' ٹھہریئے میں آپ کو شروع سے بتاتا ہوں۔ مسٹر اقبال' میں ایک متوسط گھرانے کا لڑکا تھا۔ یونیورسٹی میں میری ملاقات صبیحہ سے ہوئی تھی۔ وہ ایک مل اونر کی بیٹی تھی۔ اکلوتی بیٹی' حسین اور خوب صورت' وہ مجھے بہت اچھی لگی۔ میری تھوڑی سی کوشش مجھے اس کے قریب لے آئی۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہماری قربت ایک سنجیدہ محبت میں تبدیل ہو گئی مجھے اپنے اور اس کے درمیان کا فرق معلوم تھا اسی لیے میں نے کبھی اس سے شادی کے

بارے میں نہ کہا حالانکہ میں اکثر خیالوں میں اسے حاصل کرنے کی ترکیبیں سوچا کرتا تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ مجھے اس کی دولت سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور یہ بات بھی میں جانتا تھا کہ شادی کی فرمائش میرے اور اس کے درمیان شکوک کے علاوہ فاصلوں کو بھی جنم دے سکتی ہے' ممکن ہے وہ یہ سمجھے کہ میں اس کی دولت کی وجہ سے اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں یا پھر ممکن ہے کہ اس کا مغرور باپ ہمارے درمیان فاصلے اگا دے۔ یہ دونوں خدشات مجھے شادی کی بات کرنے سے روکتے تھے مگر مجھے اس وقت حیرت ہوئی جب صبیحہ نے خود مجھ سے شادی کی بات کی اور اپنے باپ سے ملنے کا مشورہ دیا۔ تب میں نے اسے سمجھایا کہ اس کا باپ ہمارے درمیان دوری پیدا کر سکتا ہے۔ وہ یہ سب باتیں ماننے کو تیار نہ تھی اور ہر حال میں مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی چاہے اس کا باپ مانے یا نہ مانے۔ یہاں ایک اور بات بتا دوں کہ اس کا ایک سوتیلا بھائی بھی تھا یعنی صبیحہ کے باپ کی پہلی بیوی کا بیٹا۔ وہ بیوی اس بیٹے کی پیدائش پر مر گئی تھی۔ اس کے سوتیلے بھائی کا نام حیدر علی تھا۔ حیدر علی تین برس کا تھا کہ اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی اور اس کے یہاں صبیحہ نے جنم لیا۔ حیدر علی ماں کے مرنے کے بعد اپنی نانی کے پاس رہا تھا وہیں پلا بڑھا اور جوان ہوا اسے اپنے باپ کی محبت سے محرومی کا شدید احساس تھا۔ وہ کبھی کبھی باپ کے پاس رہنے آیا کرتا تھا اور صبیحہ سے باپ اور ماں کی محبت دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتا اور اس سے نفرت کرتا تھا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

بہرحال میں بتا رہا تھا کہ صبیحہ نے مجھ سے ضد کرنا شروع کر دی کہ میں اس کے باپ سے ملوں۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ماں کو راضی کر چکی ہے۔ اب تمام مسئلہ باپ کا ہے۔ باپ کو اس کی ماں نے میرے متعلق اور صبیحہ کی پسند کے متعلق بتا دیا تھا اور اس کا باپ مجھ سے ملنے کا خواہش مند تھا۔ میں خود میں اتنی ہمت نہیں پاتا تھا کہ اس سے ملوں مگر اس نے مجھے حوصلہ دیا اور میں نے اس کے باپ سے مل لیا۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی کہ چند دن کی گہری خاموشی کے بعد اس کے باپ نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ وہ بے حد خوش تھی اور میری حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھی۔

ہماری شادی دھوم دھام سے ہوئی۔ اس کے باپ نے مجھے اتنا کچھ دیا کہ میں تصور نہیں کر سکتا تھا۔ میرا ایک بھائی اور ایک بہن تھی۔ باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ماں بیمار رہنے

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

کے بعد انتقال کر گئی۔ بھائی کو میں نے امریکہ بھیج دیا اور بہن کی شادی کر دی۔ ہماری شادی کے تیسرے برس صبیحہ نے ایک پیاری سی بچی کو جنم دیا جس کا نام ہم نے سیماں رکھا۔"

آخری جملہ سنتے ہی میں اچھل پڑا۔ "ج۔ ج۔ جی؟ سیماں یعنی۔ یہ بہادر والی سیماں!؟"

اس کے ہونٹوں پر دکھ کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "ہاں.......... یہی سیماں' بہادر والی' میری بیٹی ہے اور یہ بہادر ماموں ہے اس کا' صبیحہ کا سوتیلا بھائی' حیدر علی بہادر۔"

میری پیشانی پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں۔ اس کی تمام کہانی جسے میں اب تک لاتعلقی سے سن رہا تھا اب میرے لیے حیرت انگیز ہو گئی تھی میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے یاد آ گیا کہ مجھے بتایا گیا تھا کہ سیماں کا باپ اپنی بیوی اور بچی کو چھوڑ کر امریکہ بھاگ گیا تھا اور پھر پلٹ کر ان دونوں کی کوئی خبر نہ لی۔ مجھے وہ رات بھی یاد آ گئی جب سیماں' بیگ صاحب کے گھر میں تھی اور رات کو میری کھڑکی سے کود کر اندر آئی تھی اور عجیب بہکی بہکی باتیں کرنے لگی تھی اس نے مجھے جمال کہہ کر مخاطب کیا تھا اور مجھ پر اپنی ماں کے قتل کا الزام بھی لگایا تھا۔

"پھر.......... پھر کیا ہوا مسٹر زید.......... ٹھہریئے۔ میں کافی اور پیئوں گا۔"

زید نے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور اس لڑکی کو اشارہ کیا جسے اس نے زینی کہہ کر تعارف کرایا تھا۔ زینی نے اٹھ کر انٹرکام پر کافی لانے کا آرڈر دیا۔ زید نے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ پھر وہ اچانک رکا اس نے کوٹ کی جیب سے ایک قیمتی اور خوب صورت سگریٹ کیس نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے فوراً ہی سگریٹ لے لیا' مجھے شدت سے اس کی طلب کا احساس ہوا تھا۔ مسٹر زید نے بھی ایک سگریٹ نکالا اور ہونٹوں میں دبا کر دوسری جیب سے ایک چھوٹا سا مگر خوب صورت لائٹر نکال لیا۔ دوسرے لمحے لائٹر سے شعلہ سا نکلا اور کمرے میں جلترنگ گونج اٹھا۔ جلترنگ کی آواز اس لائٹر سے آ رہی تھی اور اس آواز نے نہ معلوم کیوں میرے اعصاب کو پرسکون کر دیا تھا۔ مسٹر زید نے پہلے میرا اور پھر اپنا سگریٹ سلگایا اور منہ سے دھوئیں کا ایک دائرہ سا بنا کر فضاؤں میں چھوڑ دیا۔ اس کی نگاہیں دھیرے دھیرے بڑھتے ہوئے اس دائرے پر جم کر رہ گئیں۔

"مسٹر اقبال.......... سیماں ہم دونوں کے بے تحاشا پیار کی پہلی نشانی تھی جسے پا کر

میں اور صبیحہ' دونوں اتنے خوش تھے کہ ہمارے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ ہم نے سیماں کی پیدائش پر جی کھول کے خوشیاں منائی تھیں۔ سیماں کے نانا نے سیماں کے نام اپنی بہت سی جائداد کر دی تھی اس کی نانی نے بھی بہت کچھ دیا تھا۔ وہ خوش قسمت ترین بچی تھی جسے بے پناہ محبتیں ملیں۔ نانا نانی اسے دیکھ کر جیتے تھے اور ہم دونوں میاں بیوی کی تو وہ آنکھ کا تارا تھی۔

وہ دو برس کی ہوئی تو اس کی نانی یعنی صبیحہ کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ ان کے مرنے کے بعد پتا چلا کہ وہ اپنی تمام دولت سیماں کے نام کر گئی ہیں۔ صبیحہ کے والد بوڑھے ہو چکے تھے۔ میں تنہا ان کی تمام جائیداد اور تمام کاروبار کو سنبھال نہیں سکتا تھا۔ یہ دیکھ کر انہوں نے اپنے بیٹے حیدر علی کو بھی اپنے پاس بلا لیا اور اپنے دو ٹیکسٹائل ملز اس کے حوالے کر دیے۔ حیدر علی بہادر ایک چالاک اور تیز آدمی تھا۔ اس نے بہت جلد اپنے حصے کا کاروبار سنبھال لیا بلکہ اس کاروبار میں خاطر خواہ اضافہ بھی کر دیا۔ صبیحہ کے والد اس کی ذہانت سے بہت خوش ہوئے اور اب وہ مطمئن ہو کر آرام کرنے لگے۔" وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوا اور اس نے سگریٹ کا لمبا کش لے کر پھر دھوئیں کے مرغولے بنائے۔

اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

"کم اِن۔" زینی نے بلند آواز میں کہا۔ اس کی آواز بے حد خوب صورت تھی۔

دروازہ کھلا اور ملازم کافی کی ٹرے لیے اندر داخل ہوا۔ اس کی کمرے میں موجودگی کے دوران میں گہری خاموشی طاری رہی چینی کے نازک برتنوں کی کھنک گونجتی رہی۔ وہ ہم سب کو کافی کے کپ دے کر چلا گیا۔ تب زید میرے بالکل سامنے والی کرسی پر آ بیٹھا۔

"ہوں.......... کیا کہہ رہا تھا میں؟" اس نے زینی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"حیدر علی نے تمام کاروبار سنبھال لیا۔" زینی نے جواب دیا۔

"ہاں.......... صبیحہ کے والد کی عمر آرام کرنے کی تھی۔ یعنی اب دو بیٹے مل گئے تھے۔ ایک میں اور دوسرا حیدر علی۔ میں بھی بڑے احسن طریقے سے اپنا کام سنبھالے ہوئے تھا۔ تین برس اور گزر گئے۔ سیماں پانچ سال کی ہو گئی۔ ہم بے حد خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے کہ اچانک صبیحہ کے والد مضطرب رہنے لگے۔ ہم ان کے اضطراب کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھے مگر ایک بات میں نے نوٹ کی تھی کہ وہ کچھ روز کے لیے

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

امریکہ گئے تھے اور اپنے کچھ پرانے دوستوں سے مل کر آئے تھے آتے ہی انہوں نے دو ٹیکسٹائل ملز کا دورہ کیا جسے وہ حیدر علی کے سپرد کر چکے تھے۔ امریکہ سے آنے کے بعد ہی وہ بہت مضطرب رہنے لگے تھے پھر ایک روز انہوں نے مجھے بتایا کہ حیدر علی نے امپورٹ ایکسپورٹ کاروبار شروع کر دیا ہے وہ یہاں سے ایرانی قالین' پاکستان کی ثقافت کی کچھ اور چیزیں مثلاً ہاتھ سے بنائی ہوئی کپڑے کی گڑیاں' پیتل کے کام کے برتن اور لکڑی پر ہاتھ سے کھدے ہوئے نقش و نگار کی حامل چیزیں ایکسپورٹ کر رہا ہے اور ان کے بدلے میں وہ وہاں سے بھی کچھ چیزیں امپورٹ کرتا ہے۔

میں نے سب کچھ حیرت سے سنا کیوں کہ اب تک حیدر علی نے ہمیں ایسی کوئی بات نہیں بتائی تھی۔ صبیحہ کے والد حیدر علی کے اس کاروبار سے خوش نہیں تھے۔ انہوں نے دبے الفاظ میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ حیدر علی کو روک دیں اگر آپ نہیں چاہتے تو۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ باوجود چاہنے کے اسے منع نہ کر سکے مگر ان کا اضطراب بڑھتا چلا گیا۔ شاید اسی اضطراب کی وجہ سے ان کے اعصاب جواب دے گئے اور ان پر فالج کا شدید دورہ پڑا۔ ان کی جان خطرے میں پڑ گئی۔ اسی حالت میں انہوں نے اپنے وکیل کو بلوا کر اپنی وصیت لکھوا دی اور وصیت کے تیسرے روز ہی وہ وفات پا گئے۔ ان کی موت کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے بیٹے حیدر علی کو اپنی جائداد سے عاق کر دیا ہے اور اپنی تمام جائداد سیماں اور صبیحہ کے نام کر گئے ہیں۔

اب مجھے حیدر علی پر شک ہو گیا۔ سسر کا اضطراب اور پھر ان کی وصیت نے اس کے کردار کو مشکوک بنا دیا تھا۔ ہم نے قانونی تقاضے پورے کرتے ہوئے حیدر علی سے تمام کاروبار لے لیا کیوں کہ یہ اس کے باپ کی ہدایت تھی۔ حیدر علی اس وقت تو خاموشی سے چلا گیا مگر وہ نچلا نہ بیٹھا اور میرے خلاف سازشوں کا جال سا بچھا گیا۔ اس نے کچھ زمینیں حیدر آباد کے نواح میں خرید لی تھیں اب انہی کی دیکھ بھال کرتا تھا اور اسی پر گزارہ بھی کرتا تھا۔

وہ جو بچپن ہی سے محرومی کا شکار رہا تھا اس نے ہماری جڑیں کاٹنا شروع کر دیں۔ میں نے ملز کے ساتھ ہی امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار بھی خود ہی سنبھالنے کا فیصلہ کر لیا تھا

اور یہی میری پہلی بھول تھی۔ مجھے اس سلسلے میں پوری سوچ بچار سے کام لینا چاہیے تھا مگر ایسا نہ کر سکا اور بہت جلد اس کے بوئے ہوئے گناہ میں ہاتھ کٹوا بیٹھا۔ معلوم اس وقت ہوا جب پانی سر سے اونچا ہو گیا اور مجھے اپنی گرفتاری کا خطرہ پیدا ہو گیا۔"

"کس سلسلے میں؟" میں نے اس کی بات کاٹی۔

"ایکسپورٹ امپورٹ کی آڑ میں وہ ہیروئن کا کاروبار کرتا تھا۔" مسٹر زید نے ایک اور سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "اوہ سوری۔" وہ سگریٹ جیب سے نکالتے ہوئے بولا اور سگریٹ میری جانب بڑھا دی۔ میں نے انکار نہ کیا اور ایک سگریٹ نکال لی۔ لائٹر پھر جلا اور جلترنگ بج اٹھے۔

"مجھے ملک چھوڑ کر فرار ہونا پڑا۔" اس نے دھویں کے مرغولے چھوڑتے ہوئے کہا۔ "جاتے ہوئے سیماں کی ماں سے بھی نہ مل سکا اور یہ میری دوسری بڑی غلطی تھی۔ حیدر علی کو میری اس حرکت کی وجہ سے صبیحہ کو ورغلانے کا موقع مل گیا۔ اس نے میری تصویریں ایک خوب صورت لڑکی کے ساتھ بنوائیں اور اسے پہنچا دیں۔ صبیحہ مجھ سے بے تحاشہ محبت کرتی تھی۔ وہ میرے بارے میں سن کر پاگل سی ہو گئی اور اتنی ہی شدت سے نفرت کرنے لگی جس شدت سے وہ محبت کرتی تھی۔ میں اپنے پیچھے زنجیروں کی جھنکار سنتا رہا اور بھاگتا رہا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ملک سے فرار ہوتے وقت مجھے پیسے کی ضرورت تھی اور وہ میں نے اسی کاروبار سے حاصل کیا تھا مگر میں نے اپنی بیوی یا بچی سے بے وفائی نہیں کی تھی۔" مسٹر زید لمحہ بھر کو خاموش ہوئے۔ انہوں نے زینی کی طرف دیکھا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ زینی ان کی مزاج شناس نکلی۔ اس نے اٹھ کر فریج کھولا اور ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر لے آئی۔ مسٹر زید نے مسکرا کر سر کی خفیف سی حرکت سے اس کا شکریہ ادا کیا اور ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔

"آپ مسٹر اقبال؟" زینی نے مجھ سے پوچھا۔

"جی ضرور........... مسٹر زید کی داستان ایسی ہے کہ بار بار حلق خشک ہو جاتا ہے۔" میں نے شوخ انداز میں جواب دیا اور ہاتھ بڑھا کر پانی کا گلاس اٹھا لیا جسے زینی دوبارہ بھر چکی تھی۔

مسٹر زید نے ایک بھوں اُچکا کر مجھے گہری نظر سے دیکھا۔ "آپ طنز تو نہیں کر رہے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

مسٹر اقبال؟" اس کا لہجہ دھیما تھا مگر میں نے اس کے لہجے میں آنچ محسوس کی۔

"سوری مسٹر زید.......... میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا اگر آپ کو دکھ پہنچا ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔ جو کچھ میں نے کہا وہ قطعی طور پر سچائی پر مبنی تھا۔"

"شکریہ.........." وہ پھر نارمل ہو گیا۔ "تو مسٹر اقبال میں بھاگتا رہا' بھاگتا رہا اور جب بہت سا وقت گزر گیا تو میں نے کچھ سکون محسوس کیا اور تبھی میں نے فون پر صبیحہ سے رابطہ قائم کرنا چاہا مگر اس نے میری آواز سن کر فون بند کر دیا۔ اس نے مجھے صفائی کا موقع بھی نہیں دیا اور یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا کہ میں ان سب کے لیے مر چکا ہوں اور یہ کہ دوبارہ رابطے کی کوشش نہ کروں۔ میں چیختا رہ گیا مگر بے سود' حیدر علی اپنے پلان میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ بہن اور بھانجی کا ہمدرد بن کر ان کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس نے صبیحہ کو میرے بارے میں ورغلایا اور اسے بتایا کہ یہ مذموم کاروبار میں ہی کر رہا تھا اور اس کے باپ کو بھی متنفر کرنے والا بھی میں ہی ہوں۔ صبیحہ جو اکیلی ہو گئی تھی اسے بھائی کا سہارا بڑا سہارا لگا اور وہ اس پر اعتماد کر بیٹھی۔ یہ سب باتیں مجھے جمال سے معلوم ہوئی تھیں۔"

جمال کے نام پر میں ایک بار پھر چونک اٹھا۔ "جمال.......... یہ کون تھا؟"

"میرا بھتیجا' جسے میں نے مجبوراً صبیحہ کے پاس اپنے وکیل کی حیثیت سے بھیجا تھا تاکہ وہ میری بیوی کو حقیقت بتا سکے اور ان لوگوں پر منڈلانے والے کسی بھی خطرے کے امکان کو ختم کر سکے مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ حیدر علی اب سمجھ چکا تھا کہ میں صبیحہ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں ہوں وہ جمال کی آمد کا مقصد بھی سمجھ چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر صبیحہ کو حقیقت پتا چل گئی تو اس کی بنی بنائی ساکھ خراب ہو جائے گی۔ میں نے جمال کے ہاتھ چند ایسے دستاویزات بھیجے جو مجھے بے گناہ اور حیدر علی کو مجرم ثابت کرنے کے لیے کافی تھے مگر یہاں جمال سے چوک ہو گئی۔ وہ پہلے بات چیت سے مسئلہ حل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پہلے میری بیوی کے دل سے میری نفرت کم کرنے کی ضرورت ہے تبھی وہ ان دستاویزات پر یقین کرتی۔ وہ یقیناً ایسا ہی کرتی مگر اس طرح وقت کافی لگ گیا اور حیدر علی نے جو سولی پر لٹک کر رہ گیا تھا' خود کو محفوظ کرنے کے لیے اپنی سگی بہن کو قتل کرا دیا یعنی میری بیوی کو' اور الزام جمال کے اوپر رکھ دیا۔ سارے شواہد جمال کے خلاف تھے۔ جمال کو وہاں سے بھاگنا پڑا اور اب وہ سیماں کا وارث بنا بیٹھا

ہے۔ سیماں کا نہیں بلکہ اس کی تمام جائیداد کا۔ اس نے دواؤں کی ایک فیکٹری کھولی ہے' مسٹر اقبال اور مجھے یقین ہے کہ ہیروئن کا وہ مذموم کاروبار اسی فیکٹری کے تھرو کر رہا ہے۔ مگر کیسے اور اس کا طریقہ کار کیا ہے یہ میں اب تک معلوم نہیں کر سکا۔" وہ خاموش ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔

"مسٹر زید یہ جمال صاحب کیا.........."

"ہاں.......... وہ بالکل تم جیسا ہے۔" مسٹر زیدؔ نے میری پوری بات سنے بغیر ہی جواب دیا۔ مجھے اس کی ذہانت کی داد دینا پڑی۔ "میں نے آپ کو یہاں اسی لیے بلوایا ہے مسٹر اقبال کہ حیدر علی بہادر آپ میں اسی لیے دلچسپی لے رہا تھا وہ آپ کی ذہانت سے بھی بہت متاثر ہے۔"

"مسٹر زید کیا مس سیماں جانتی ہیں کہ وہ کیا کاروبار کر رہا ہے' جیسے میں نے سنا ہے کہ وہ خود بھی اس کاروبار میں شریک ہیں۔"

"غلط ہے یہ"۔ وہ یک بیک چیخ اٹھا مگر فوراً ہی اسے اپنے چیخنے کا احساس ہو گیا۔

"سوری مسٹر اقبال میں.........."

"کوئی بات نہیں مسٹر زید' میں آپ کی کیفیت کو سمجھ سکتا ہوں۔" میں نے فوراً ہی اس کی شرمندگی دور کر دی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

"مسٹر اقبال یہ تو ممکن ہے کہ وہ نادانستگی میں ایسے جرائم میں ملوث ہو چکی ہو مگر جان بوجھ کر وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ وہ ابھی بہت چھوٹی ہے مسٹر اقبال' شی از اونلی سیونٹینتھ' اتنی عمر میں اس کے اتنے بڑے کاروبار میں شرکت پر کوئی کیسے یقین کر سکتا ہے۔"

"ہوں.......... آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"ہاں.......... اب میں اس سوال کا جواب زیادہ آسانی سے دے سکتا ہوں۔ آپ کو یہ تمام کہانی سنانے کا مقصد یہ تھا کہ آپ مجھ پر شک نہ کریں اور یہ جان جائیں کہ میں جو کچھ بھی کرنا چاہتا ہوں۔ ایک باپ کی حیثیت سے کرنا چاہتا ہوں۔ مسٹر اقبال' آپ باپ نہیں ہیں اس لیے میری کیفیت کو سمجھنے سے قاصر ہوں گے۔ مگر محبتوں کی کیفیت سے ضرور واقف ہوں گے۔ میں نے صبیحہ کو کھویا اور تمام زندگی اس خلا کو پُر نہیں کر سکتا مگر

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

اب میں سیماں کو کھونا نہیں چاہتا۔ آپ اس سلسلے میں میری بھرپور مدد کر سکتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ حیدر علی نے سیماں سے آپ کے بارے میں کیا کہا ہو گا مگر میں یہ جانتا ہوں کہ وہ آپ کو استعمال کرنا چاہتا ہے۔"

تب میں نے اپنی اور سیماں کی اس ملاقات کے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا جب سیماں کھڑکی سے کود کر میرے کمرے میں آئی تھی اور اس نے مجھے میرے اصرار کے باوجود جمال کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ وہ اور زینی بڑے غور سے میری تمام باتیں سنتے رہے میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ میرا وہاں جانے کا پروگرام تھا مگر زاریہ کی حالت کی وجہ سے منسوخ کرنا پڑا۔

"گویا یہاں پھر ہم سے غلطی ہو گئی۔" اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ شکست خوردہ تھا۔

"مسٹر زید میں ابھی الجھن میں ہوں۔"

"کیوں؟" وہ چونک اٹھا۔

"اس لیے کہ اس ساری داستان میں کہیں بھی بیگ صاحب یا فاریہ کا ذکر نہیں آیا پھر مس زینی کو وہاں بھیجنے اور زاریہ کو زخمی کرنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ بیگ صاحب کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟"

"ہاں......... آپ کی الجھن یقیناً صحیح ہے۔ میں بتاتا ہوں اصل میں بیگ صاحب اور حیدر علی بہت پرانے دوست تھے' کلاس فیلو بھی رہ چکے ہیں دونوں۔ اس معاملے میں ان دونوں کا ایک گہرا تعلق یہ ہے مسٹر اقبال کہ فاریہ کی یہ کوٹھی جس میں وہ لوگ اس وقت قیام پذیر ہیں' میرے سسر کی بنوائی ہوئی ہے۔ انہی نے بہادر کے ہاتھ بیچا تھا اسے بلکہ اسے یہ کوٹھی خریدنے پر مجبور کیا تھا۔ یہ میں نہیں جانتا کہ کس طرح بیگ صاحب نے وہ کوٹھی خرید لی۔ میری معلومات کے مطابق اس مذموم کاروبار کے بہت سے ثبوت یہاں کسی خفیہ جگہ موجود ہیں۔ مرنے سے پہلے میرے سسر مجھے اس بارے میں کچھ بتانا چاہتے تھے مگر فالج کے آخری حملے میں ان کی زبان بھی متاثر ہوئی اور دایاں ہاتھ بھی جس وقت انہوں نے مجھے کچھ بتانے کا فیصلہ کیا تھا اس وقت ان کی حالت بے حد خراب تھی پھر بھی انہوں نے مجھ سے اشاروں میں کاغذ اور قلم لانے کو کہا اور کمرا خالی کروا دیا حتیٰ کہ

انہوں نے اپنی اکلوتی اور چہیتی بیٹی کی موجودگی کو بھی پسند نہ کیا تھا۔

میں نے کاغذ اور قلم انہیں دیا۔ انہوں نے الٹے ہاتھ سے اس پر کچھ لکھنا چاہا مگر موت انہیں مہلت دینے کے لیے تیار نہ تھی۔ ان کے جسم کو جھٹکے لگ رہے تھے پھر بھی انہوں نے تین الفاظ ٹیڑھے میڑھے انداز میں لکھ ہی دیے وہ الفاظ تھے کوٹھی میں تیسرا کمرا' تہہ خانہ' کالا بکس۔

کوٹھی کے بارے میں مَیں نے پوچھا کہ ہماری کوٹھی؟ تب انہوں نے نفی میں سر ہلایا اور اسی وقت موت کے پنجے نے انہیں دبوچ لیا۔ وہ کاغذ آج تک اسی طرح میرے پاس موجود ہے۔ میں اسی وقت سے بیگ صاحب کی کوٹھی کے پیچھے پڑ گیا۔ میں نے کئی بار اس کوٹھی میں اپنے آدمی بھیجے مگر وہ کبھی کامیاب نہ ہو سکے۔ بہادر اور فاریہ کی مخاصمت نے فاریہ کو الرٹ کر دیا ہے اور وہ ایسی کسی بھی کارروائی کو بہادر سے منسوب کر دیتی ہے حالانکہ بہادر اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا۔ میرے آدمی اس کوٹھی کے تمام کمرے چیک کر چکے ہیں۔ مگر زاریہ والا کمرا ابھی تک چیک نہیں کیا گیا تھا۔ میں نے اپنے کچھ آدمی فاریہ کی فیکٹری میں بھی لگا دیے تھے جن میں سے ایک ادریس بھی تھا' لفٹ مین اور وہ ٹیکسی والا بھی میرا ہی آدمی تھا۔ جس نے عذرا کو نشہ آور مشروب پلا کر واپس گھر چھوڑ دیا تھا میں اس روز صرف اس کمرے میں تہہ خانے کا راستہ تلاش کروانا چاہتا تھا۔ بکس نکالنا ابھی ضروری نہیں تھا کیوں کہ اس سے محفوظ جگہ کوئی دوسری نہیں ہو سکتی مگر زینی اس میں ناکام ہو گئی۔ وہ زاریہ کو بے ہوش سمجھ رہی تھی۔ اس نے تمام کمرے کو چیک کرنے کے بعد اس کے بیڈ کے نیچے جا کر چیک کرنا چاہا اسی وقت زاریہ اٹھ گئی اور اس سے پہلے کہ زاریہ چیختی زینی نے اس کے سر پر کوئی چیز دے ماری اور پھر وہ ناخوشگوار واقعہ ہو گیا جس کا مجھے اب تک دکھ ہے۔ ان لوگوں کو کسی بھی قسم کی تکلیف پہنچانا میرا مقصد نہیں تھا۔"

"یہ ایسی بات نہیں ہے مسٹر زید کہ آپ کو یہ طریقہ اختیار کرنا ضروری ہو۔ اس سلسلے میں اگر آپ فاریہ سے بات کرتے تو شاید آپ کا یہ مسئلہ بغیر کسی پریشانی کے حل ہو جاتا"۔

"یہ ممکن ہے بھی اور نہیں بھی' ویسے میں اس معاملے میں فاریہ کو ملوث کرنا بہتر

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

نہیں سمجھتا۔ بہادر پہلے ہی بیگ کا دشمن بنا ہوا ہے اور بیگ سے زیادہ اسے فاریہ سے خطرہ ہے کیوں کہ وہ اس کے لیے بہت نقصان دہ اور مشکل ثابت ہوئی ہے فاریہ نے اسے ناقابلِ بیان حد تک نقصان پہنچایا ہے۔ اس کی تفصیل میں آپ کو پھر کبھی بتاؤں گا' اس وقت مجھے بھوک محسوس ہو رہی ہے اور میرے خیال میں کافی وقت گزر چکا ہے یوں کہہ لیں کہ میں نے آپ کا کافی وقت ضائع کر دیا ہے مگر آپ کو اعتماد میں لینے کے لیے ضروری تھا کہ آپ کو حقیقت سے آگاہی ہو۔ اب میں آپ کی طرف سے کافی پُرامید ہوں مسٹر اقبال' اور میری خواہش ہے کہ آپ سیماں کو دوسرے طریقے سے پرکھیں' میں جانتا ہوں کہ بہادر نے اس کی پوزیشن کافی خراب کر دی ہے مگر وہ معصوم ہے مسٹر اقبال اور اسے صرف معصوم ثابت کرنے کے لیے آپ کو میرا ساتھ دینا ہو گا۔ اس کے بدلے آپ جو چاہیں گے وہ میں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ سیماں میری اکلوتی بچی' میری محبت کی نشانی ہے' میرا اپنا خون ہے۔ اس کے سامنے میری تمام دولت اور دنیا کے تمام رشتے ہیچ ہیں۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوا تو زینی اٹھ کھڑی ہوئی' اس نے انٹرکام پر کھانا لگانے کا حکم دیا۔

زید اس دوران میں پھر اٹھ کر ٹہلنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری سوچ کے سائے لرزاں تھے' آنکھوں میں پھیلی محرومی کچھ اس شدت کی تھی کہ میں نے اسے اپنے اندر اور چاروں طرف بکھرتا محسوس کیا۔ قدرت مجھے انوکھے حالات میں ڈال رہی تھی ہر ہر مقام پر عجیب پُراسراریت کا احساس ہوتا تھا۔ میں کہاں تھا اور کہاں پہنچ گیا تھا۔ اس بارے میں خود بھی حیرت زدہ تھا۔

کمرے میں چھائی ہوئی گہری خاموشی درد انگیز تھی۔ مسٹر زید کے ٹہلنے سے کوئی بھی آہٹ نہیں ہو رہی تھی کیوں کہ ان کے پیروں تلے دبیز قالین تھا۔

زینی خاموش نگاہوں سے کبھی مجھے اور کبھی زید کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا کردار اب بھی پُراسراریت لیے ہوئے تھا میں نہیں جانتا تھا کہ اس کا زید سے کیا رشتہ ہے' نہ ہی اس بارے میں زید نے کچھ بتایا تھا۔ وقت بہت زیادہ گزر چکا تھا اور حالات بتا رہے تھے کہ داستان بہت زیادہ طویل ہے۔ میں ابھی نہیں جانتا تھا کہ جمال اب کہاں ہے' زید کیا کرتا ہے۔ اس کے پاس اتنی بے تحاشہ دولت کہاں سے آئی ہے کہ وہ محل نما اس کوٹھی میں

رہ رہا ہے' وہ اتنے بہت سے ملازموں کو کس طرح پال رہا ہے اور یہ کہ وہ مجھ سے اب کیا چاہتا ہے۔ ویسے یہ اندازہ تو مجھے ہو گیا تھا کہ وہ بھی میرے بہادر کے پاس چلے جانے کا خواہش مند ہے' اس طرح وہ سیماں کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دوسری طرف وہ مجھ سے فاریہ کی کوٹھی میں موجود تہہ خانے کا پتا بھی معلوم کرنا چاہتا ہے۔ جس کے بارے میں' میں اب تک نہیں جانتا تھا مگر ان تمام باتوں کے لیے وہ کون سا طریقہ اختیار کرے گا اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔

ہم سب اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے' اسی طرح تقریباً پندرہ منٹ گزر گئے۔ انٹرکام کی آواز سے ہم تینوں ہی چونک اٹھے۔ زینی نے انٹرکام اٹھایا اور کچھ سن کر رکھ دیا۔

"سر کھانا لگ گیا ہے۔"

"آیئے مسٹر اقبال۔" زید نے مجھ سے کہا اور بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ میرے اور پھر زینی کے باہر آنے تک یونہی دروازہ کھولے کھڑا رہا۔ اس کے اخلاق نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ اس کے بارے میں میری پہلی رائے بہت غلط تھی۔ میں اسے پاگل یا نفسیاتی مریض سمجھا تھا مگر اب وہ مجھے بے حد سلجھا ہوا اور کلچرڈ لگا تھا۔

ہم ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہوئے اس کمرے میں آ گئے جسے ڈائننگ روم کہا جاتا تھا۔ میں اب آپ کو اس کمرے کی تفصیل نہیں بتاؤں گا صرف اتنا کہوں گا کہ آج جو کچھ میں دیکھ رہا تھا وہ شاید زندگی بھر دوبارہ نہ دیکھ سکوں۔ نفاست کی بہترین مثال تھا یہ محل اور یہاں کی معمولی سے معمولی چیز بھی اتنی قیمتی محسوس ہوتی تھی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ ڈائننگ ٹیبل' برتن چمچے' گل دان دیواروں پر لگی پینٹنگز سبھی کچھ نوادرات میں شامل کی جا سکتی تھیں۔

ہم لوگ خاموشی سے کھانا کھاتے رہے کھانے کے بعد ہم نے گرم گرم چائے پی۔ چائے کے دوران میں زید کا موڈ بڑا خوشگوار تھا۔ وہ موضوع سے ہٹ کر اپنی سیاحت کے بارے میں بتاتا رہا۔ مختلف قوموں کے کلچر اور عادات پر تبصرہ کرتا رہا۔ اس نے بہت ہلکی پھلکی گفتگو کر کے ہمارے اعصابی تناؤ کو کم کر دیا تھا۔ یہ اس کی بہترین خوبی اور مہارت تھی۔ اس روز مجھے اندازہ ہوا کہ سونے سے پہلے انسان کس طرح خود کو ایک خوشگوار نیند کے لیے تیار کر سکتا ہے۔ ہم بہت دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اٹھ گئے۔ مسٹر زید نے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

تھکن ظاہر کی اور مجھ سے اگلے روز ملنے کا وعدہ کیا۔ میں کھڑا ہو گیا مس زینی نے میرے کمرے تک میرا ساتھ دیا اور پھر شب خیر کہہ کر چلی گئیں۔

گو کہ مسٹر زید نے مجھے بڑا پُرسکون کر دیا تھا مگر اس کی تمام داستان میرے ذہن میں گونج رہی تھی۔ میں نے سلیپنگ سوٹ پہنا اور نرم و ملائم بستر پر لیٹ گیا۔ میں کیوں کہ دن میں کافی دیر سو چکا تھا اس لیے نیند کا کہیں پتا نہیں تھا۔ اب میں نے مسٹر زید کی سنائی ہوئی داستان ذہن میں دہرانا شروع کر دی۔ میں اس داستان میں کہیں جھول تلاش کر رہا تھا جس سے میں داستان کی حقیقت یا جھوٹ ہونے کا اندازہ کر سکتا مگر بڑی باریک بینی کے باوجود مجھے کہیں جھول نظر نہ آیا اور تمام داستان حقیقت پر مبنی معلوم ہوئی۔ یہ داستان بھی پچھلے تمام حالات کی طرح پُراسرار ضرور تھی اور ابھی تک بہت سی باتیں اور بہت سے سوال ایسے تھے جو جواب طلب تھے۔ مجھے یقین تھا کہ مسٹر زید سے دوسری تفصیلی ملاقات میں ان سوالوں کے جواب بھی مل جائیں گے۔

اب میں نے تمام باتوں کو ذہن سے جھٹک دیا اور فاریہ وغیرہ کے متعلق سوچنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ وہ لوگ میری وجہ سے بہت پریشان ہو چکے ہوں گے۔ مسٹر زید نے مجھے فون کرنے کی اجازت دے دی تھی مگر ابھی میں اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ مجھے مسٹر زید کی شخصیت کو ظاہر کرنا ہے یا نہیں۔

بہرحال مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ کچھ سوچنے کے بعد میں نے علی الصبح فون کرنے کا فیصلہ کر لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ رات کے کسی پہر مجھے نیند آ گئی۔ بہت دیر سے سونے کی وجہ سے میں علی الصبح نہ اٹھ سکا۔ میری آنکھ کھلی تو پونے گیارہ بجے تھے۔ میں نے انٹرکام پر جگو کو چائے لانے کو کہا۔

کچھ دیر بعد جگو ناشتے کی ٹرے لیے آ گیا۔

"مسٹر زید کہاں ہیں؟" میں نے توس پر مکھن لگاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ اسلام آباد جا چکے ہیں، رات کی فلائٹ سے واپس آ جائیں گے۔" اس نے مؤدبانہ جواب دیا۔

"اور مس زینی.........؟"

"وہ یہیں ہیں اور آپ کے ناشتے سے فارغ ہونے کا انتظار کر رہی ہیں۔"

"اوہ......... ٹھیک ہے تم جاؤ۔ میں آدھے گھنٹے بعد ان سے ملاقات کروں گا۔"

"آپ تیار ہو جائیں تو مجھے بتا دیجئے گا، میں آپ کو لینے آ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے"۔ میں نے مختصر جواب دیا۔ وہ ذرا سا جھکا پھر باہر چلا گیا اور میں ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ٹھیک آدھے گھنٹے میں، میں تیار ہو چکا تھا۔ میں نے انٹرکام پر جگو کو بتایا۔ وہ چند لمحوں بعد مجھے لینے آ گیا۔ ہم ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہوئے اسی کمرے میں آ گئے جہاں کل مسٹر زید اور مس زینی سے ملا تھا۔ مس زینی اس وقت ڈھیلی سی پینٹ اور ڈھیلی سی قمیص میں ملبوس تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ میک اپ سے پاک چہرے پر بے پناہ تازگی اور بلا کی معصومیت تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ "آیئے مسٹر اقبال۔"

"کیسی ہیں آپ؟"

"جسٹ فائن، آپ کیسے ہیں؟"

"بہترین، مس زینی آپ کے بارے میں تجسس ابھی تک برقرار ہے۔ ویسے آپ بتائیں گی کہ اُس روز آپ میڈیکل اسٹور پر کیا کر رہی تھیں؟"

"آپ نے مجھے پہچان لیا تھا کیا، آپ نے تو مجھے نہیں دیکھا تھا پھر آپ کیسے جان گئے کہ میں وہی ہوں جس نے مس زاریہ کو زخمی کیا ہے"۔

"آپ کی شہادت کی انگلی کی وجہ سے"۔

"اوہ......... یہ انگلی میرے لیے خطرناک بھی ہو سکتی ہے، اچھا ہوا آپ نے بتا دیا آئندہ میں اس بارے میں خیال رکھوں گی ویسے انگلی کے بارے میں کیسے پتا چلا تھا آپ کو؟"

"حمیدہ بی بی نے بتایا تھا۔ آپ نے غالباً اس سے پانی مانگا تھا۔ تبھی اس کی نگاہ آپ کی انگلی پر پڑی تھی اور جب ہم نے اس سے آپ کی کوئی نشانی اور حلیہ پوچھا تو اس نے بتایا کہ........."

"خیر مسٹر اقبال، زاریہ کے سلسلے میں مسٹر زید تو معذرت کر ہی چکے ہیں، میں ذاتی طور پر بھی معذرت چاہتی ہوں۔ زاریہ جب تک اسپتال میں رہی میں اس کی خیریت معلوم کرنے جاتی رہی اور......... اسے بعض ممکنہ خطرات سے بھی بچایا ورنہ........."

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"ممکن خطرات..........؟"

"ڈاکٹر زیدی.......... وہ اس کے لیے خطرناک تھا۔ بہادر نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ کسی بھی طرح زاریہ کو ختم کر دے۔"

تب مجھے عذرا کا وہ خط یاد آگیا جو اس نے جانے کے دوسرے روز ہی میری گاڑی میں اس وقت پہنچا دیا تھا جب میں بیگ صاحب کی دوا لینے میڈیکل اسٹور پر گیا تھا۔ اس میں اس نے زاریہ کو مسٹر زیدی سے بچانے کی ہدایت کی تھی۔

"شکریہ مس زینی.........."

"مجھے اس کی حفاظت کا حکم دیا گیا تھا مسٹر اقبال' ایسا کر کے میں نے اپنے جرم کا ازالہ کیا ہے' اس میں شکریہ کی بات نہیں۔" یہ کہہ کر زینی نے چائے منگوائی اور ہم چائے پینے لگے۔

"مس زینی آپ کے بارے میں میرا ذہن الجھا ہوا ہے۔"

"سوری مسٹر اقبال' میں مسٹر زید کی اجازت کے بغیر کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔ ویسے آپ میرے لیے اپنے ذہن میں کوئی الجھن نہ رکھیں اور صرف اتنا سن لیں کہ میں مسٹر زید کا بہت احترام کرتی ہوں' اپنے کسی بھی بزرگ سے بڑھ کر' اس احترام میں محبت بھی شامل ہے' ویسی ہی محبت جیسی کوئی لڑکی اپنے باپ یا بڑے بھائی سے کر سکتی ہے۔ میری عزت کی زندگی انہی کی مرہون منت ہے۔ میں ان کی خاطر بڑے سے بڑے خطرے میں بھی کود سکتی ہوں۔" ایسا کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھلملاہٹ محسوس ہوئی اور میں سوچتا رہ گیا کہ اس کے ماں باپ یا بہن بھائی کہاں ہیں اور وہ کیوں مسٹر زید کی احسان مند ہے مگر وہ کسی بھی سوال کا جواب دینے سے معذرت کر چکی تھی۔ اس لیے اس سے کچھ پوچھنا بیکار تھا۔

اسی کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ مسٹر زید ایک اہم میٹنگ میں اسلام آباد گئے ہیں اور رات واپس آ جائیں گے۔ میٹنگ کی اہمیت پر اس نے کوئی روشنی نہ ڈالی۔ ظاہر ہے کہ وہ یہ باتیں مجھ سے نہیں کرتی۔ میں نے بھی پوچھنا مناسب نہ سمجھا' ہم کچھ دیر وہاں بیٹے باتیں کرتے رہے جو زیادہ تر کوٹھی کی نفاست اور خوب صورتی سے متعلق تھیں۔ زینی نے بتایا کہ مسٹر زید خوب صورت اور نادر چیزوں سے عشق کرتے ہیں۔ کوٹھی کی

تمام نفاست ان کے ذوق کی آئینہ دار ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ان کی زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں مگر وہ اپنی بیوی اور بیٹی کو بہت مس کرتے ہیں۔ ان کی زندگی میں اگر کوئی دکھ ہے تو وہ بیوی کی جدائی کا اور بیٹی کی دوری کا۔ وہ ہر قیمت پر اپنی بیٹی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہیں۔ زینی جب تک وہاں بیٹھی رہی مسٹر زید کے کردار کے ہر پہلو پر باتیں کرتی رہی۔ اس نے ان کے ہر پہلو کی تعریف کی اور انہیں ایک عظیم شخصیت کے روپ میں پیش کیا۔

تین بجے کے قریب وہ کسی کام سے چلی گئی اور میں اٹھ کر اس کے ساتھ باہر آگیا۔ یہ کوٹھی سے باہر کا حصہ تھا یہاں آ کر میں حیرت زدہ رہ گیا کیونکہ باہر سے یہ کوٹھی کوئی قدیم عمارت لگتی تھی اور اس کوٹھی کی پیشانی پر سیمنٹ سے ابھرا ہوا انیس سو پینتیس لکھا ہوا تھا۔ میں جس جگہ کھڑا تھا وہاں سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر کوٹھی کا مین گیٹ تھا اور باہر سے گزرنے والی ٹریفک کا شور یہاں تک سنائی دے رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ کوٹھی شہر کی مصروف سڑک پر واقع تھی۔ گیٹ اور کوٹھی کے اس اندرونی دروازے کے درمیان سرخ رنگ کی بجری سے روش بنائی گئی تھی۔ روش کے دونوں اطراف میں خوب صورت پھول اور پودے لگے ہوئے تھے۔ دائیں جانب سرونٹ کوارٹر تھا اور بائیں جانب خوب صورت لان جس کے درمیان ایک پرانی طرز کا فوارہ بنا ہوا تھا۔ یہ فوارہ ایک حوض کے بیچوں بیچ تھا اور حوض شفاف پانی سے بھرا ہوا تھا۔ لان میں بھی خوب صورت پھول اور پودے لگے ہوئے تھے۔ میں ٹہلتا ہوا لان میں آگیا' جہاں کونے میں ایک بڑی خوب صورت اور رنگ برنگی چھتری ایک لمبے بانس پر ٹکی ہوئی تھی۔ اس چھتری کے نیچے رنگین کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کرسیوں کے تین اطراف گلاب کے بڑے بڑے پھول مہک رہے تھے۔ پھولوں کی خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ موسم بے حد خوب صورت تھا۔ دھوپ کی کرنیں ترچھی ہو چکی تھیں۔ میں یہاں بیٹھ کر گیٹ سے لے کر کوٹھی کے سامنے والے حصے تک دیکھ سکتا تھا۔ کوٹھی باہر سے کافی شکستہ لگ رہی تھی۔ باہر کی دیواروں کو نہ پلستر کرایا گیا تھا اور نہ ہی رنگ کیا گیا تھا۔ قدیم اور جدید کا یہ امتزاج عجیب پُراسرار سا تھا۔ میں کچھ دیر آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا پھر میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی سوا پانچ بجے تھے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

یہ حیرت انگیز بات تھی کہ اس دوران میں مجھے کوئی ذی روح نظر نہ آیا تھا۔ گویا مسٹر زید نے سچ کہا تھا کہ اگر میں فرار ہونا چاہتا تو بغیر کسی مشکل کے فرار ہو سکتا تھا۔ یہاں دور دور تک کوئی نہ تھا جو میری راہ میں رکاوٹ بنتا مگر حالات کو اس موڑ پر چھوڑ کر میرا فرار ہو جانا قطعی غیر مناسب تھا۔ البتہ میں فاریہ کو اپنی خیریت سے مطلع کرنا چاہتا تھا اور ان لوگوں کی خیریت معلوم کرنے کے لیے بے چین تھا۔ صبح تو میں فون نہیں کر سکا تھا مگر اب وقت ہو گیا تھا کہ مجھے فاریہ گھر پر مل سکتی تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اندر داخل ہوا کوریڈور خالی تھا میں اندازے سے بڑھتا چلا گیا۔ نہ معلوم میں غلط جگہ آ گیا تھا، مجھے اپنے کمرے کی پہچان نہیں تھی۔ میں نے جس کمرے کے دروازے کو دھکا دیا وہ لاک تھا۔ پھر میں نے اس کوریڈور کے تمام دروازوں کو کھولنا چاہا مگر سب کے سب لاک تھے اور سب ایک ہی جیسے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ نہ معلوم کیا بات تھی کہ مجھ پر خوف سا طاری ہو گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے مجھے لوہے کے حصار میں قید کر دیا ہو۔ میں گھبرا کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ میرا خیال تھا یہ بھی لاک ہو گا مگر اس وقت مجھ میں اطمینان پھیل گیا جب وہ دروازہ کھلتا چلا گیا اور میں نے خود کو اسی لان کے سامنے کھڑا پایا جہاں میں کچھ دیر پہلے موجود تھا۔ میں نے کھلی فضا میں گہرے گہرے سانس لیے اور وہیں سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ اب میں نے سوچا کہ جس کوریڈور میں چند لمحے پہلے میں تھا، وہ کوریڈور نہ تھا جس سے میں زینی کے ساتھ باہر آیا تھا کیونکہ اس کوریڈور میں کئی چیزیں ایسی تھیں جو کچھ اسی کوریڈور میں تھیں۔ مثلاً وہ کالا اور سنہری رنگ کا بڑا سا گلدان جس میں سرخ گلاب کے پھول لگے ہوئے تھے۔ وہ کارنر ٹیبل جس پر میں نے فون رکھا دیکھا تھا۔ وہ خوب صورت تصویر جس میں ایک حسین عورت مسکرا رہی تھی کچھ بھی وہاں نہ تھا۔ میں عجیب مخمصے میں تھا کہ اچانک کوٹھی کا دروازہ کھلا اور جگو ٹرے میں چائے کے برتن لیے باہر آ گیا۔ "سر میں آپ کی چائے یہیں لے آیا۔"

"اوہ جگو......... یہ کیا اسرار ہے، میں نے اپنے کمرے میں جانا چاہا تھا مگر........."

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھیں میں کھوج تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ یہ سب مجھے نہیں کہنا چاہیے تھا۔

"مگر کیا ہوا؟" اس نے کریدنے والی نگاہوں سے مجھ دیکھا۔ اس وقت اس کا لہجہ

بہت مختلف تھا۔

"مگر یہ کہ......... یہ دروازہ جو تم کھول کر آئے ہو......... یہ بند تھا۔ میں نے بہت کوشش کی دروازہ کھل جائے مگر نہیں کھلا، تھک ہار کر میں یہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔" میں نے بات بدل دی اور یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ میں پوری کوریڈور گھوم کر آیا ہوں۔

"آپ چائے یہیں پئیں گے یا.........؟" وہ مؤدب ہو چکا تھا۔

میرے ذہن میں کہیں دور گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ چھٹی حس کسی خطرے کی طرف اشارہ کر رہی تھی، وہ کیا خطرہ یا کیا بات تھی میں نہیں سمجھ سکا۔

"اندر کمرے میں، مجھے لاہور فون کرنا ہے۔" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"تشریف لائیے۔" اس نے کہا اور اسی دروازے کی طرف پلٹ گیا۔ اس نے دروازے کا دایاں پٹ کھولا اور میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ میرا جانا پہچانا کوریڈور تھا۔ وہی کالا اور سنہری گلدان، وہی اس میں لگے ہوئے سرخ گلاب، مسکراتی ہوئی حسین عورت کی تصویر دیکھ کر تو مجھے یوں لگا تھا جیسے وہ میری حیرت اور بے وقوفی پر ہنس رہی ہو۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ کارنر ٹیبل بھی نظر آ گئی جس پر فون رکھا تھا۔ جگو آگے آگے تھا اور میں پیچھے پیچھے۔ اسی طرح چلتے ہوئے ہم دائیں جانب کے تیسرے دروازے پر رک گئے جو میرے اندازے کے مطابق میرا کمرا تھا۔

جگو کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھی اس لیے میں نے بڑھ کر دروازہ کا ہینڈل گھمایا اور دروازہ کھلتا چلا گیا۔ مجھے حیرت کے دورے پڑ رہے تھے مگر میں نے کمال مہارت سے خود کو نارمل کیا ہوا تھا۔ جگو نے سائیڈ ٹیبل پر چائے کی ٹرے رکھ دی اور ہاتھ باندھ کر مؤدب کھڑا ہو گیا۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔" میں نے اس سے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔ مبادا وہ میری آنکھوں میں بھری حیرت کو نہ دیکھ لے۔

وہ خفیف سا جھکا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے مزید حیرت زدہ ہونے کی بجائے فاریہ کا فون نمبر ملایا مگر کوئی بیل نہ ہوئی میں نے پھر کوشش کی......... پھر کی مگر جانے کیا بات تھی کہ نمبر ملانے کے بعد کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

میں نے انٹر کام پر جگو کو بلوایا۔ چند منٹ بعد ہی وہ آ گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ فون غالباً خراب ہے۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ سے ریسیور لے لیا اور مجھ سے نمبر پوچھ کر ڈائل کیا پھر ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ میں نے اشارے سے اسے جانے کو کہا اور خود فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

دوسری جانب سے فون اٹھانے والا سلطان تھا جسے میں نے فوراً ہی پہچان گیا۔ "ہ سلطان میں بالا بول رہا ہوں۔"

"بالے .... تُو .... تو کہاں چلا گیا بالے .... کہاں سے بول رہا ہے۔ ہم تجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہو گئے۔ مس فاریہ بہت پریشان ہیں بالے۔ سوہنی، بیگ صاحب، ماسی اور میں .... سب بہت پریشان ہیں، تو کہاں سے بول رہا ہے، تو کیوں گیا تھا بالے، کہاں ہے تو ....؟" وہ ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

"سلطان میری بات تو سن یا تُو ہی بولتا رہے گا۔" میں نے کہا مگر شاید دوسری طرف سے ریسیور فاریہ نے لے لیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے فاریہ کی آواز آئی۔

"اقبال ....؟"

"یس میڈم ...." میں فوراً مؤدب ہو گیا۔

"تم کہاں چلے گئے اقبال ....؟" وہ روہانسی ہو گئی۔

"میڈم سوری .... مجھے بغیر بتائے آنا پڑا ...."

"کہاں .... کہاں آنا پڑا؟" اس نے فوراً ہی میری بات کاٹ دی۔

"میں کراچی سے بول رہا ہوں۔"

"کراچی سے .... مگر .... کیوں اقبال۔ سنو۔ کیا تمہارے قریب کوئی ہے۔ کیا تم کسی کے دباؤ میں ہو؟"

نہیں میڈم ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ میری پوری بات سنیں تو بتاؤں۔"

"ہاں بولو۔"

"میڈم آپ کو یاد ہے کہ سیماں نے مجھے جمال کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ پہلی مرتبہ جب وہ آپ کے گھر آئی تھیں۔"

"ہاں .... آں یاد آیا .... تو پھر؟"

"میں اسی جمال کے پیچھے یہاں تک پہنچ گیا ہوں۔ سیماں اس وقت کراچی میں اسی جمال کے ساتھ ہے اور میں ان دونوں کے پیچھے۔ بہرحال آپ کو فون کرنے کا مقصد صرف اپنی خیریت بتانا اور آپ لوگوں کی خیریت معلوم کرنا تھا۔ تفصیل میں آ کر بتاؤں گا فی الحال یہ بتائیے کہ سوہنی اور زاریہ کیسی ہیں؟"

"وہ اب بالکل ٹھیک ہیں اقبال، زاریہ تو بالکل ہی ٹھیک ہے، اب تو بات چیت کر لیتی ہے مگر سوہنی تمہارے جانے کے بعد سے بہت پریشان تھی۔ اس وقت تو میرے سامنے بیٹھی مسکرا رہی ہے، اقبال تم تو خوش قسمت ہو کہ تمہارے اتنے بہت سے چاہنے والے موجود ہیں۔ تم واپس کب آ رہے ہو، اور تمہارے پاس پیسے ہیں؟"

"آپ فکر نہ کریں۔ مجھے کوئی پریشانی نہیں۔ میں بہت جلد واپس آؤں گا۔ اپنا اور سب کا خیال رکھئے گا میڈم۔"

"ہاں اور سنو، جلدی آنا، جب تک نہیں آؤ گے ہم پریشان رہیں گے۔"

"آپ پریشان نہ ہوں میڈم میں جلد واپس آؤں گا، اوکے سی یو ...."

"سی یو اقبال گڈ بائے۔" یہ کہہ کر اس نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ میں چند لمحے یونہی ریسیور تھامے بیٹھا رہ گیا پھر میں نے ایک لمبی سانس لے کر ریسیور کریڈل پر رکھا ہی تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور مسٹر زید تالی بجاتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

"گڈ .... ویری گڈ، آپ بہت انٹیلی جنٹ ہیں مسٹر اقبال"۔

میں اسے یہاں دیکھ کر حیران ہو گیا میری اطلاع کے مطابق اسے رات کو واپس آنا تھا جبکہ اس وقت چھ بج کر پندرہ منٹ ہو رہے تھے۔ دوسری حیرت مجھے یہ تھی کہ اس نے ہماری بات چیت کیسے سنی۔ وہ ابھی میرے سامنے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ میں کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھئے بیٹھئے ...." اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے دوبارہ بٹھا دیا۔

"یہ سن کر خوشی ہوئی کہ زاریہ اب بالکل ٹھیک ہے۔"

"شکریہ مسٹر زید، ویسے مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ اسلام آباد گئے ہیں اور رات کی فلائٹ سے آئیں گے"۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"آپ سے ٹھیک کہا گیا تھا البتہ میرا پروگرام تبدیل ہو گیا اور میں رات سے پہلے ہی آ گیا۔ کیا آپ کو میرے جلد آ جانے پر کوئی اعتراض ہے؟" اس نے بڑی رازداری سے پوچھا اور میں بے ساختہ ہنس پڑا' اس کا انداز کچھ اتنا ہی مضحکہ خیز تھا۔

"اوہ.......... آپ ہنس بھی لیتے ہیں.......... چلئے آپ ہنسے تو.........." اس نے خوشگوار موڈ میں کہا پھر یک لخت سنجیدہ ہو گیا۔ "آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں مسٹر زید' میں نے اتنی انوکھی میزبانی کہیں اور نہیں دیکھی۔"

"شکریہ مسٹر اقبال' مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے ابھی تک دوپہر کا کھانا نہیں کھایا۔"

"اوہ سچ.......... میں تو بھول ہی گیا تھا۔ ویسے بھوک بھی محسوس نہیں ہوئی۔"

"اچھا.......... ورنہ میں تو ڈر گیا تھا کہ شاید آپ ناراض ہو گئے یا کچھ آپ کے ساتھ غلط ہو گیا۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔"

"تو پھر چلیں؟"

"کہاں؟"

"کھانا کھانے' مجھے بھوک لگی ہے اور جب آپ ڈائننگ روم میں جائیں گے تو یقیناً آپ کو بھی بھوک محسوس ہونے لگے گی۔"

"ضرور!" میں نے مسکرا کر جواب دیا اور کھڑا ہو گیا۔ ہم پھر اس کوریڈور سے ہوتے ہوئے ڈائننگ روم میں آ گئے۔ اس بار میں نے کوریڈور کے اس دروازے کو بہت غور سے دیکھا جو باہر کی طرف کھلتا تھا۔ کوریڈور کی ایک ایک چیز میں نے ذہن نشین کر لی تھی۔ ہم کچھ ہی دیر بعد ڈائننگ روم میں پہنچ گئے اور زید نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہاں پہنچ کر مجھے بھوک لگنے لگے گی۔ مختلف کھانوں سے اٹھتی ہوئی لذت انگیز خوشبو نے میری بھوک چمکا دی اور میں زید کے بیٹھنے کے بعد ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

ہم کھانے کے دوران میں خاموش رہے مگر کھانا ختم ہوتے ہی زید نے کہا۔ "ہاں تو مسٹر اقبال اب آپ اپنے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے؟"

"کیوں نہیں۔" میں نے کہا پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے اپنی داستان

شروع کر دی۔ گاؤں سے شروع ہونے والے مظالم کی داستان سناتے سناتے میری آواز بھرا گئی۔ حلق نمکین ہو گیا مگر میں نے خود پر قابو پائے رکھا۔ وہ بڑی توجہ سے میری کہانی سن رہا تھا۔ راجہ کے ذکر پر وہ لمحہ بھر کو چونکا تھا یا شاید مجھے دھوکا ہوا تھا بہرحال اس دوران میں زید نے مجھے ٹوکا نہیں بلکہ گہری خاموشی اور دلچسپی کے ساتھ سب کچھ سنتا رہا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد میری داستان یہاں آ کر ختم ہو گئی کہ "راجہ نے میری ملاقات بیگ صاحب سے کروائی اور پھر اس کے بعد کی تمام باتیں آپ جانتے ہی ہوں گے۔"

"ہوں.......... ویری سیڈ' دنیا میں کتنے ظالم لوگ ہیں مسٹر اقبال جو رشتوں کی نزاکت اور جدائی کے جان لیوا عذاب سے ناواقف ہیں۔ شاید اس لئے کہ ان سے کبھی ان کا کوئی عزیز نہیں بچھڑا۔ ان لوگوں سے تمام رشتے چھین لینا چاہئیں مسٹر اقبال! مثلاً چودھری سے راجو یا.......... راجو سے اس کا بیٹا اور حیدر علی بہادر سے اس کا بیٹا یا پھر.........." ایسا کہتے ہوئے وہ انتہائی سفاک ہو گیا اور شاید اسے خود ہی اپنے لہجے کی سفاکی کا احساس ہوا تھا اسی لیے وہ چپ ہو گیا۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر اپنے چہرے پر پھیرا اور انٹرکام پر جگو سے چائے کے لیے کہہ کر اپنی کرسی پر واپس آ گیا۔ اس نے حسبِ عادت سگریٹ کیس نکال کر ایک سگریٹ مجھے دے دیا اور دوسرا خود سلگا کر دھوئیں کے مرغولے بنانے لگا۔

"مسٹر زید گو آپ کی میزبانی میرے لیے باعثِ فخر ہے مگر میرے لیے بھی کچھ کام ہیں۔ میں جلد از جلد یہاں سے جانا چاہتا ہوں اگر آپ اجازت دیں تو.........."

"کیوں نہیں مسٹر اقبال' بس میری ایک درخواست ہے کہ سیماں بے قصور اور معصوم ہے اس کا خیال رکھئے گا اور دوسری درخواست یہ ہے کہ اگر آپ اس کوٹھی میں تہہ خانہ تلاش کر کے مجھے اس کا نقشہ فراہم کر سکیں تو نوازش ہو گی' اس کے بدلے میں آپ جو چاہیں میں پیش کر سکتا ہوں۔"

"شکریہ مسٹر زید' اول تو مادی چیزیں میرے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہماری پرورش میں جذبوں' رشتوں اور محبتوں کے سوا کسی چیز کو اہمیت نہیں دی جاتی دوسری بات یہ کہ اگر سیماں بے قصور ہے تو اور نہیں ہے تو' ہم دونوں صورتوں میں اسے نقصان پہنچانا نہیں چاہتے' فاریہ کا مشن صرف اس مذموم کاروبار کا

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

خاتمہ ہے اور شاید یہی آپ بھی چاہتے ہیں"۔

"یقیناً مسٹر اقبال' ویسے میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں' اگر کہیں آپ کو میری ضرورت ہو تو ضرور بتایئے گا۔ ویسے اس بکس میں آپ کی دلچسپی بیکار ہو گی کیونکہ اس بکس میں میرے اور جمال کے بے گناہ ہونے کے ثبوت ہیں جو یقیناً آپ کے کام کے نہیں ہوں گے۔ اگر اس میں بہادر کے اس زہریلے کاروبار سے متعلق کچھ ہوا تو میں خود ہی رضاکارانہ طور پر آپ کو پیش کر دوں گا۔"

"شکریہ' آپ کسی خدشے کو ذہن میں جگہ نہ دیں' میں جو کام بھی کرتا ہوں پوری دیانت داری سے کرتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے' آپ کو ایک اچھے دوست کی حیثیت سے میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ یہ میرا کارڈ ہے' اس میں فون نمبر لکھا ہوا ہے کوئی کام کی بات معلوم ہو تو آپ رات میں کسی بھی وقت مجھ سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں' جب بھی آپ جانا چاہیں میں انتظام کرا دوں گا۔"

"میں کل ہی جانا چاہتا ہوں۔"

"او کے' کل آپ کو پہلی فلائٹ کی ٹکٹ مل جائے گی اور آپ کو جگو ائیرپورٹ تک چھوڑ آئے گا۔ میں شاید صبح آپ سے نہ مل سکوں بلکہ ممکن ہے اس وقت کے بعد آپ سے میری ملاقات نہ ہو پائے۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے' وِش یو گڈ لک۔" اس نے اپنا ملائم ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا' اس کی گرفت دوستانہ تھی اور اس میں گرم جوشی بھی تھی۔ میں اس سے رخصت ہو کر کمرے میں آ گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بھی میں نے کوریڈور کو گہری نظروں سے دیکھا تھا۔ کمرے میں آ کر میں نے کپڑے بدلے اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ گو یہ سونے کا وقت نہیں تھا مگر میرے ذہن میں جو کچھ تھا اس پر عمل کرنے کے لیے میں اس وقت جی بھر کر سو لینا چاہتا تھا۔

بہت جلد میں گہری نیند میں ڈوب گیا۔ گہری نیند میں جانے سے شاید لمحہ بھر پہلے میں نے اپنے چاروں طرف ہلکی موسیقی کی آواز سنی جس نے مجھے جگانے کی بجائے نیند میں پہنچا دیا اور گہری نیند کے باوجود میرا ذہن محض غنودہ حالت میں تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

جیسے بیکراں سمندر کی موجیں میرے بالکل قریب آتی جا رہی ہوں اور جیسے ہر قریب آنے والی موج میرے ذہن سے ٹکرا کر ایک عجیب سی سنسنی مجھ میں اتار رہی ہو۔ ان موجوں کے دوش پر ایک سرگوشی آتی محسوس ہوتی تھی اور پھر جیسے وہ سرگوشی قطرہ قطرہ کر کے میرے وجود میں اترتی جاتی تھی۔

یہ ایک عجیب سی کیفیت تھی' میرا تمام جسم بے حس و حرکت تھا مگر ذہن کو جیسے کوئی دھیمے دھیمے لہجے سے جگائے ہوئے تھا۔ نہ معلوم یہ کیفیت کتنی دیر تک رہی مگر پھر یہ کیفیت نہ رہی اور مجھے بالکل کچھ بھی ہوش نہ رہا۔ جب میری آنکھ کھلی تو رات کے سوا دس بج رہے تھے۔ کمرا بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ ذہن بالکل خالی تھا' کچھ ایسی کیفیت تھی جیسے میں نے دنیا میں پہلی بار آنکھ کھولی ہو۔ میں کچھ دیر یونہی لیٹا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اسی وقت دروازے پر ہلکی دستک ہوئی اور میرے جواب دینے سے پہلے ہی کسی نے دروازہ کھول دیا اور داخل ہونے والی زینی تھی۔ اس کی سحرانگیز شخصیت نے مجھے لمحوں میں چاق و چوبند کر دیا۔

"کیسے ہیں مسٹر اقبال؟" اس نے مترنم لہجے میں مسکرا کر پوچھا۔ اس کے جملے نے جیسے مجھے سب کچھ یاد دلا دیا ورنہ ابھی تک میرا ذہن کسی کانچ کے خالی برتن کی طرح لگ رہا تھا۔

"جی ٹھیک ہوں۔"

"بے وقت سو گئے تھے' مجھے خیال ہوا کہ شاید آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"جی بس کچھ کسلمندی سی تھی مگر اب میں بالکل ٹھیک ہوں' اگر کافی مل جائے تو مزید بہتر ہو جاؤں گا۔"

"ضرور لیکن ایک شرط ہے۔"

"کیا؟"

"آپ میرے ساتھ تاش کھیلیں گے۔"

"جی۔ تاش۔ مجھے تو تاش کھیلنا نہیں آتے' میں نے کبھی تاش نہیں کھیلے"۔

"کھیلیں گے تو آ جائیں گے"۔ یہ کہہ کر اس نے میرے بیڈ کی دراز کھولی اور ایک

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

خوب صورت پیکٹ نکال لیا۔ میں کچھ الجھن محسوس کرنے لگا' سر بھاری بھاری سا لگا مگر احتراماً کچھ نہ کہہ سکا۔ میں نے کبھی زندگی میں تاش کے پتوں کو ہاتھ میں نہیں لیا تھا۔ جبکہ وہ انتہائی مہارت سے تاش کے پتوں کو پھینٹ رہی تھی۔ پھینٹنے کے بعد اس نے اسی پھرتی سے تاش بانٹے اور مجھے تاش اٹھانے کا اشارہ کیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر تاش اٹھائے پھر حیرت انگیز طور پر تاش کے پتوں کا پھول سا بنا کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی غیر مرئی طاقت مجھ سے ایسا کروا رہی ہو۔ میں نے زینی کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں میرے دماغ میں سرسراتی محسوس ہوئیں اور پھر میں نے خاموشی اور انتہائی مہارت کے ساتھ کھیلنا شروع کیا۔ شروع میں تو زینی بڑی تیز اور کھوجنے والی نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی یوں جیسے میری ایک ایک حرکت اور ایک ایک چال کو نوٹ کر رہی ہو۔ پھر وہ ایک دم بہت خوش ہو گئی اس نے ہاتھ سے پتے پھینک دیے۔ "ونڈر فل مسٹر اقبال۔ اب سب ٹھیک ہو گیا۔"

میں نے حیرت سے اس کا جملہ سنا مگر معنی اور مفہوم سمجھنے سے قاصر رہا۔

"میں نے سنا ہے کہ آپ کل جا رہے ہیں۔"

"جی! غالباً کل صبح تک روانہ ہو جاؤں گا۔"

یہ سن کر اس نے اپنی گود میں رکھا وہ چھوٹا سا رنگین کاغذ میں لپٹا ہوا پیکٹ اٹھا لیا۔

"یہ ایک چھوٹا سا تحفہ ہے میری جانب سے۔"

"تکلف کر رہی ہیں آپ۔" میں شرمندہ ہو گیا کہ میں نے ابھی تک اس انداز سے نہیں سوچا تھا۔

"نہیں تکلف نہیں' مجھے پرانے گیت پسند ہیں' یہ میرے منتخب گیتوں کا کیسٹ ہے' میں ذہین اور اچھے لوگوں کو یہ تحفہ ضرور دیتی ہوں۔ اسے آپ سونے سے پہلے سنیں گے تو خود کو ہر الجھن سے دور محسوس کریں گے۔ یہ نغمے انسان میں نئی روح پھونک دیتے ہیں اور اگلے روز وہ زندگی کو زیادہ خوب صورت اور حسین پاتا ہے۔ اسے سنئے گا ضرور ورنہ مجھے دکھ ہو گا۔"

"ضرور مس زینی! آپ جس خلوص سے تحفہ دے رہی ہیں وہ میرے لیے بہت بڑی بات ہے' میں اسے ضرور سنوں گا اور آپ کو یاد رکھوں گا۔" میں نے پُریقین لہجے

میں جواب دیا اور وہ کیسٹ لے لیا۔

پھر ہم رات گئے تک باہر لان میں ٹہلتے رہے۔ باتیں کرتے رہے' میں زینی کی ذاتی زندگی کے بارے میں جاننا چاہتا تھا مگر جانتا تھا کہ وہ میرے کسی سوال کا جواب نہیں دے گی۔

مسٹر زید سے میری ملاقات نہیں ہو سکی۔ رات تقریباً ساڑھے گیارہ بجے جگو نے میرا ٹکٹ لا کر دیا جو اگلے روز صبح ساڑھے دس بجے والی فلائٹ کا تھا۔ ٹکٹ کے ساتھ ہی ایک لفافہ تھا جس پر انگریزی میں "صرف مسٹر اقبال کے لیے" لکھا ہوا تھا اور نیچے مسٹر زید کا نام لکھا تھا۔ جگو کے سامنے میں نے وہ لفافہ نہیں کھولا کہ شاید یہ مناسب نہ ہو۔ اس کے جانے کے بعد میں نے لفافہ کھولا تو اس میں پانچ ہزار روپے تھے۔ اس زمانے میں پانچ ہزار کی رقم بہت بڑی رقم تھی۔ میں حیرت زدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے مسٹر زید سے اس سلوک کی امید نہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ یہ رقم کیوں دے رہے ہیں مگر یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اگر چاہتے تو بغیر کسی معاوضے کے ان کا کام کر سکتا تھا دوسری یہ بات تھی کہ جس طرح انہوں نے مجھے اغوا کروایا تھا بالکل اسی طرح وہ مجھ پر دباؤ ڈال کر بھی اپنا کام نکلوا سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور آج میں نے پہلی بار ان کے بارے میں اچھی رائے قائم کی۔ یہ حقیقت تھی کہ اب تک انہوں نے خود کو ایک بہترین شخص ثابت کیا تھا سوائے اغوا کرانے والے واقعہ کے۔

جگو جانے سے پہلے کہہ گیا تھا کہ ہمیں ساڑھے آٹھ بجے تک ایئرپورٹ پہنچ جانا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ مجھے صبح ساڑھے سات بجے تک جگا دے گا۔ میں یونہی دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ میرا پروگرام سونے کا نہیں تھا۔ جاگنے کے پروگرام کی وجہ ہی سے میں دن میں سو چکا تھا۔ مجھے گھر کے دوسرے افراد' خاص طور پر جگو کے سونے کا انتظار تھا۔ میں یونہی لیٹا آنے والے لمحات کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں نے جو کچھ سوچا تھا وہ کافی خطرناک تھا' مسٹر زید' زینی اور جگو کی نگاہ میں میرا بنا بنایا امیج تباہ ہو سکتا تھا یا پھر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔ ایک تو یہ پُراسراریت ختم ہو جاتی اور میرا امیج بھی نہ بگڑتا۔

بہرحال مجھے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا تھا اور اسی لیے میں ایک بار پھر اپنے فیصلے کے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

متعلق سوچ رہا تھا۔ وقت دبے پاؤں سہما ہوا سا گزر رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے سر کو تکیے پر ٹکا دیا اور گزرتے ہوئے قدموں کی چاپ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ گھر کی ہر چیز اونگھنے لگی۔ گہری خاموشی رات کے گہرے ہو جانے کا احساس دلا رہی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ گھڑی میں وقت دیکھا ایک بج کر بیس منٹ ہو چکے تھے۔ میں مزید انتظار کرنا چاہتا تھا جوں جوں وقت گزر رہا تھا میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ بے کلی بڑھ کر انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ میں نے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔

نہ جانے کس طرح مزید ایک گھنٹہ گزر گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے اپنی پوری ایک صدی یونہی ٹہلتے ہوئے گزاری ہو۔ میری پنڈلیوں کے پٹھے اکڑ کر رہ گئے تھے۔ میں آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور میں نے اپنی ہتھیلیوں سے پٹھوں کو رگڑنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد میرے اعصاب ڈھیلے ہو گئے۔ میں نے باتھ روم جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ بالوں میں کنگھی کی۔ یہ سب میں خود کو چاق و چوبند رکھنے کے لیے کر رہا تھا اور کچھ وقت بھی گزارنا مقصود تھا۔ اب دو بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ میں نے جوتے اتار دیے اور سلیپنگ سوٹ کی قمیض اٹھا کر پاجامے کے لاسٹک میں اڑس لیے۔

میں نے پانچ منٹ اور انتظار کیا پھر آہستہ سے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور دروازے کو آہستگی سے اپنی جانب کھینچا۔ دروازہ بغیر کسی آواز کے کھلتا چلا گیا۔ باہر حسبِ توقع خاموشی تھی۔ کوریڈور خالی تھا اور تمام فانوس بجھا دیے گئے تھے۔ صرف ایک بلب روشن تھا جس کی روشنی اسی پر لگے شیڈ کی وجہ سے پورے کوریڈور میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں باہر آ گیا اور دروازے کو دوبارہ اسی آہستگی سے بند کر دیا۔ کوریڈور میں دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ ہونے کا سوال ہی نہ تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے کسی بھی خطرے یا کسی کے بھی دیکھے جانے کے خوف سے بچنے کے لیے چپل نکال کر پہن لیے اب اگر کوئی دیکھ بھی لیتا تو میں کہہ سکتا تھا کہ مجھے نیند نہیں آ رہی اور میں کچھ دیر کھلی فضا میں رہنا چاہتا ہوں۔ ایسا کر لینے کے بعد میں کچھ ہلکا سا ہو گیا۔ اب میں بڑے آرام سے نارمل حالت میں چلتا ہوا بیرونی دروازے تک آ گیا۔ مجھے سارا خدشہ یہ تھا کہ بیرونی دروازہ لاک نہ ہو مگر دروازے کے قریب پہنچ کر مجھے معلوم ہو گیا کہ دروازہ لاک ہے اور اندر کی جانب سے کھولا جا سکتا ہے مجھے امید تو نہیں تھی کہ یہاں اس قسم کے لاک ہوں گے مگر یہ

حقیقت تھی اور اس وقت میرے سامنے بھی تھی۔

میں نے دروازہ کھولا وہ کھلتا چلا گیا۔ میں نے اس دروازے کا باہر والا ہینڈل پکڑ لیا اور باہر آ کر دیکھا وہ دایاں پٹ تھا اور بایاں پٹ یونہی بند تھا جبکہ میں نے اندر سے دروازہ کھولتے ہوئے اچھی طرح نوٹ کیا تھا کہ کوریڈور میں صرف ایک پٹ کا دروازہ تھا۔ میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ یہ بائیں پٹ والا دروازہ یقیناً اس گیلری کا تھا جہاں کل میں نادانستگی میں چلا گیا تھا اور بالآخر تھک کر واپس آ گیا تھا اور پھر جب جگو مجھے لے کر اندر داخل ہوا تھا تو اس نے دروازے کا دایاں پٹ کھولا تھا۔ اب بات میری سمجھ میں آ چکی تھی۔ ظاہر ہے باہر سے دیکھنے والے کو کوٹھی میں داخل ہونے والا یہ دروازہ دو پٹ کا نظر آتا تھا اور وہ اندر داخل ہونے کے بعد سوچتا بھی نہ ہو گا کہ یہ کیا اسرار ہے۔ میں کچھ دیر یونہی باہر ٹہلتا رہا۔ کھلی فضا میں لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا تاکہ اگر کوئی دیکھے تو شک نہ کرے۔ میں نے اسی طرح تقریباً آدھا گھنٹا گزار دیا۔ مگر یہاں بھی گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا اور ویرانی منہ پھاڑے کھڑی محسوس ہوتی تھی۔ کچھ دیر بعد مجھے اطمینان ہو گیا تو میں دھیرے سے مگر بالکل نارمل انداز میں آگے بڑھا اور میں نے بجائے دایاں پٹ کھولنے کے بایاں پٹ کھولا، بالکل اسی طرح کہ اگر مجھے چیک کیا جا رہا ہو تو میری یہ حرکت قطعی غیرارادی محسوس ہو۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

یہ حیرت انگیز بات تھی کہ دروازہ لاک نہیں تھا۔ میں کل کی طرح بڑی آسانی سے اندر داخل ہو گیا۔ یہ وہی کوریڈور تھا جہاں کل میں بھٹک رہا تھا مگر اب میں چوکنا تھا۔ میں نے ایک طائرانہ نگاہ ڈالی، دونوں جانب تین تین دروازے تھے مجھے یقین تھا کہ یہ سب دروازے کل ہی کی طرح لاک ہوں گے پھر بھی میں نے انہیں چیک کیا وہ لاک تھے۔ میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ کوریڈور کے اختتام پر دائیں جانب بہت پتلی سی گلی جیسی بنی ہوئی تھی۔ میں اس پتلی گلی میں داخل ہو گیا جو دس قدم آگے بڑھنے کے بعد بند ہو گئی اور سپاٹ دیوار نے میرا راستہ روک لیا۔ اس گلی میں اندھیرا تھا اس لیے میں نے جیب سے لائٹر نکال لیا۔ یہ وہی لائٹر تھا جو موم بتی کی طرح بنا ہوا تھا۔ یہ لائٹر میں نے قصداً جیب میں ڈالا ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے کسی بھی وقت اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے لائٹر کی روشنی میں میں نے دیواروں کا جائزہ لیا اور کوئی ایسی جگہ تلاش کرنے لگا جسے دروازے یا

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

کھڑکی کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ مگر ایسی کوئی جگہ نہ تھی البتہ ایک سوئچ بورڈ بنا ہوا تھا جس پر ہرے، سرخ اور کالے رنگ کے تین بٹن لگے ہوئے تھے.......... ان بٹنوں کے نیچے یا اوپر کچھ بھی لکھا ہوا نہیں تھا اس لیے میں رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔ دائیں جانب دیوار میں لوہے کا ایک ہینڈل سا بنا ہوا تھا۔ میں نے ہینڈل کو پکڑا اور لمحہ بھر کو گھبرا گیا کیوں کہ ہینڈل ہاتھ میں پکڑتے ہی مجھے یوں لگا جیسے پوری دیوار ہل گئی ہو۔ میں نے پاؤں سختی سے جما لیے اور پھر یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ دائیں جانب کی دیوار کسی دروازے ہی کی طرح کھلتی چلی گئی بعد میں معلوم ہوا کہ دیوار نظر آنے والا یہ حصہ دراصل لکڑی کا بنا ہوا دروازہ تھا جس کے کھلے حصے سے ہلکی روشنی دکھائی دے رہی تھی اور کچھ ایسی آواز آ رہی تھی جیسے اندر کہیں ڈرل مشین چلائی جا رہی ہو۔

میں نے احتیاط سے اندر کی جانب جھانکا، اندر میرے لیے مزید شوشے کا سامان موجود تھا۔ یہ حصہ ایسا تھا کہ جیسے میں قدیم محلوں کے اندر کا حصہ دیکھ رہا ہوں۔ بالکل شاہ جہاں کے مقبرے کا درمیانی حصہ لگتا تھا جہاں بڑے بڑے درختوں کے نیچے سیمنٹ کی منڈیریں سی بنی ہوئی ہیں، زرد پتے بکھرے ہوئے تھے۔ سرخ چھوٹی بڑی اینٹوں سے روشیں بنی ہوئی تھیں اور ان روشوں کے دونوں اطراف کبھی ہری ہری گھاس اگا کرتی ہو گی۔ مگر اس وقت وہاں سوکھے ہوئے زرد پتوں اور مٹی کے سوا کچھ نہ تھا۔

دور بالکل گولائی میں غلام گردش کے آثار تھے جو اب کھنڈر میں تبدیل ہو چکے تھے البتہ اس غلام گردش سے ہٹ کر ایک پرانی سی عمارت تھی جسے اس کھنڈر کا حصہ تو نہیں کہا جا سکتا تھا مگر وہ بھی کافی پرانی لگ رہی تھی۔ دو منزلہ اس عمارت کی پہلی منزل کی کھڑکیوں سے جھانکتی روشنی اور کھڑکی کے شیشوں پر لرزتے، آتے جاتے سائے وہاں زندگی کے آثار کا ثبوت تھے۔

میں اپنی متجسس طبیعت پر قابو نہ پا سکا اور پھر یہاں سے واپس چلے جانا کچھ دانش مندی بھی نہ تھی۔ اس لیے میں نے پلٹ کر کوریڈور میں جھانکا۔ وہاں سے اطمینان ہو جانے کے بعد میں نے دیوار نما دروازہ کھول کر اندر کا اچھی طرح جائزہ لیا اور اللہ کا نام لے کر قدم اندر رکھ دیا۔ اپنے پیچھے دروازے کو اچھی طرح بند کر کے میں ایک قریبی درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ اس درخت کا تنا بہت موٹا تھا۔ میں اس کے پیچھے بہ آسانی

چھپ گیا۔ کچھ دیر وہاں دبکے رہنے کے بعد میں نے دیوار کے سائے سائے میں قدم آگے بڑھائے۔ دیواروں کے سائے تلے گہرا اندھیرا تھا اور میرے دیکھ لیے جانے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ میں اس عمارت تک پہنچنا چاہتا تھا جہاں پہلی منزل روشن تھی اور ڈرل مشین چلائے جانے کی سی آواز بھی وہیں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

میں بغیر آہٹ پیدا کیے آگے بڑھتا رہا۔ تقریباً بارہ منٹ کے بعد میں عین اس عمارت کے نیچے پہنچ چکا تھا۔ عمارت کا نچلا حصہ گہرے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا پھر بھی میں نے احتیاط کا دامن نہ چھوڑا اور کافی دیر وہیں دبکا رہا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی اور پسینے کی بوندیں پیشانی پر سرسرا رہی تھیں، کچھ دیر میں نے احتیاط سے بڑی آہستگی سے حرکت کی اور سرکتا ہوا نچلے حصے کی اس کھڑکی تک پہنچ گیا جو تاریک تھی مگر اوپر سے آنے والی روشنی واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے اندر جھانکا، اندر کچھ بھی نہ تھا سوائے اندھیرے اور ویرانی کے۔

میں کچھ دیر آہٹ لیتا رہا پھر میں نے کھڑکی کے پٹ پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ مدھم سی چرچراہٹ گونجی اور میں دہل کر رہ گیا۔ کچھ دیر ساکت کھڑا رہا مگر چرچرانے کی یہ آواز شاید میرے حساس کانوں تک ہی پہنچی تھی۔ میں نے اب دیر کرنا مناسب نہ سمجھا اور فوراً ہی کھلی ہوئی کھڑکی سے اندر کی طرف اتر گیا۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے چپل اتار کر بغل میں دبا لیے تھے مبادا فرش کھڑکی سے نیچا ہو اور میرے کودنے کی آواز سے اندر موجود کوئی بھی شخص چوکنا ہو جائے۔

میرے پیر ٹھنڈے فرش سے ٹکرائے اور پیروں تلے مٹی اور سوکھے پتوں کا احساس ہوا جس سے مجھے یہ اطمینان ہو گیا کہ جس حصے میں مَیں داخل ہوا ہوں وہ قطعی استعمال میں نہیں ورنہ اتنی مٹی اور کوڑا وہاں نہ ہوتا۔ تھوڑی ہی دیر میں میری آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئیں اور مجھے کمرا خالی نظر آیا۔ سامنے کی طرف ایک کھڑکی اور دروازے کا ہیولا سا نظر آ رہا تھا جسے باہر سے آنے والی ہلکی سی روشنی نے واضح کیا ہوا تھا۔

میں دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھا۔ یہ دیوار میں بنا ہوا دروازے کا خلا تھا اور دونوں طرف سیمنٹ کی چوکھٹ اس بات کی طرف اشارہ کر رہی تھی کہ یہاں دروازہ نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ میں چند لمحے دیوار کی آڑ میں چھپا رہا پھر میں نے سر نکال کر باہر

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

جھانکا سامنے اوپر جاتی ہوئی سیڑھیاں نظر آ گئیں اور یہاں سے سیڑھیوں کے اوپر بنا ہوا دروازہ صاف نظر آ رہا تھا جہاں روشنی تھی۔ غالباً سیڑھیوں کے اوپر چالیس وولٹ کا بلب لگا ہوا تھا کیونکہ روشنی بہت مدقوق اور بیمار سی تھی۔

میں سیڑھیوں تک جانا چاہتا تھا بلکہ اوپر کی عمارت میں کیا ہو رہا ہے' یہ دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے چاروں طرف ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور قدم اٹھایا ہی تھا کہ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں فوراً دیوار کی آڑ میں ہو گیا اگر ایک لمحے یا ثانئے کی بھی دیر ہو جاتی تو ٹارچ کی روشنی کے اس دائرے کی زد میں آ گیا ہوتا جو انتہائی بائیں جانب سے اچانک نمودار ہوا تھا اور رینگتا ہوا ایک کونے سے دوسرے کونے تک چلا گیا تھا۔

میں نے سر کو دیوار سے ٹکا لیا' پسینہ میری گدی سے بہہ کر کمر سے ہوتا ہوا ٹانگوں کی طرف جاتا محسوس ہو رہا تھا۔ خدا نے مجھے بال بال بچا لیا تھا ورنہ جانے میرے ساتھ کیا ہوتا۔ ٹارچ کی اس روشنی کا مطلب یہ تھا کہ یہاں کوئی شخص موجود تھا جس کی ذمے داری یہاں کا خیال رکھنا تھی۔ اب میں اس جگہ تھا جہاں سے واپسی بھی مجھے ناممکن لگ رہی تھی کیوں کہ اس عمارت سے نکل کر اس جگہ پہنچنے میں' جہاں سے میں اس حصے میں داخل ہوا تھا مجھے تقریباً بارہ منٹ لگے تھے اور اب تو باہر کسی کی موجودگی ثابت ہو چکی تھی' آتے ہوئے مجھے یہ احساس تھا کہ یہاں کوئی نہیں ہے مگر اب چوکیدار کی موجودگی کو جانتے ہوئے میری واپسی بہت دشوار تھی۔

میرا سینہ کسی ڈھول کی طرح بجتا محسوس ہو رہا تھا۔ بدن سے پسینا یوں ابل رہا تھا جیسے میں نہا کر نکلا ہوں۔ ہمت جواب دے رہی تھی خاص طور پر اس لیے کہ مجھے واپس اپنے کمرے میں پہنچنا تھا اگر مجھے صرف فرار ہونا ہوتا تو دوسری بات تھی میں گھنٹا دو گھنٹے ہر حال یا تین چار گھنٹے بھی انتظار کر سکتا تھا اور پھر موقع دیکھ کر فرار ہو سکتا تھا مگر مجھے سات بجے سے اپنے کمرے بلکہ اپنے بستر پر ہونا تھا کیوں کہ جگو نے کہا تھا کہ وہ ٹھیک سات بجے مجھے جگا دے گا۔ دوسری بات یہ تھی کہ میں مسٹر زید کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ ابھی میں بہت سی باتوں سے ناواقف تھا اور واقفیت چاہتا تھا مزید یہ کہ مسٹر زید نے اب تک میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی تھی اور اب میں کوئی ایسا موقع دینا بھی نہیں چاہتا تھا مجھے ہر حال میں فاریہ اور سوہنی تک پہنچنا تھا۔

میں یہ تمام باتیں سوچتا رہا اور وقت سینے پر رکھے ہوئے کسی بوجھ کی طرح دھیرے دھیرے سرکتا رہا۔ میری ٹانگیں تھک گئیں تو میں آہستہ سے وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔ میری آنکھیں باہر اندھیرے میں گھور رہی تھیں اور کان کسی آہٹ پر لگے ہوئے تھے چند منٹ یونہی گزر گئے پھر اچانک وہی روشنی کا دائرہ اندھیرے میں گھومنے لگا۔ اس مرتبہ یوں لگا جیسے کوئی شخص ٹارچ ہاتھ میں لیے قریب آ رہا ہو۔ بہت جلد آنے والے کے قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ میں سرکتا ہوا دیوار کی آڑ لیے اس کھڑکی تک آ گیا جو عین میرے بالوں سے کچھ اوپر تھی۔ آنے والا کھڑکی کے قریب آ چکا تھا۔ میں نے سانس روک لیا اور اسی لمحے قدموں کی چاپ بھی رک گئی۔ روشنی کا گول دائرہ رینگتا ہوا پہلے دروازے کے راستے سامنے والی دیوار پر پڑا پھر شاید دروازے اور کھڑکی کے درمیان کی دیوار اس روشنی کی راہ میں آ گئی اور پھر وہ دائرہ کھڑکی کے راستے سرسرایا یعنی عین میرے سر کے اوپر سے ہوتا ہوا سامنے کی دیوار اور کونے میں چکرانے لگا۔

میں نے اس لمحے پسینے کو اپنی ریڑھ کی ہڈی سے بہتا محسوس کیا۔ میری کنپٹیاں گرم ہو گئیں۔ حلق خشک ہو گیا اور یوں لگا جیسے سانس گھٹنے لگا ہو۔ چند لمحے تھے جو قیامت بن کر گزرے' پھر جاتے ہوئے قدموں کی آواز نے میرے اوسان بحال کر دیے۔ میں نے لمبے سانس لیے اور سینے کو دونوں ہاتھوں سے دبایا۔ کیوں کہ سانس روکے رکھنے کی وجہ سے میرا سینہ دکھ گیا تھا۔

قدموں کی آواز معدوم ہو گئی تھی۔ میں یونہی دیوار سے چپکا بیٹھا رہا پھر شاید پانچ یا سات منٹ بعد میں نے بڑی آہستگی سے سرکنا شروع کر دیا۔ اب اس جگہ ٹھہرے رہنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا اس لیے میں واپس جانا چاہتا تھا۔ میں دروازے کی جانب جانے کی بجائے اس کھڑکی تک چلا آیا جہاں سے کود کر میں ویران کمرے میں داخل ہوا تھا۔

کچھ دیر آہٹ پر کان لگائے بیٹھا رہا مگر جھینگروں کے بولنے کی آواز کے سوا کوئی آواز نہ تھی اور پھر چند ہی لمحوں بعد میں کھڑکی کے اس طرف تھا۔ باہر کودنے کے بعد میں نے دیر نہ کی اور تھوڑا سا اٹھ کر رکوع کی حالت میں ہی بھاگتا ہوا اس دیوار کے سائے تک پہنچ گیا جہاں سے میں اس کھڑکی تک آیا تھا۔ کوریڈور میں کھلنے والا دیوار نما دروازہ اب کافی فاصلے پر تھا مگر اب میں مطمئن تھا کیونکہ یہ فاصلہ میں اسی طرح طے کرتا جس

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

طرح آتے ہوئے طے کیا تھا۔ یعنی دیوار کے اندھیرے سائے تلے ہی سرکتا ہوا وہاں تک پہنچ سکتا تھا۔

یہاں رک کر میں نے پھر چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ آہٹ سننے کی کوشش کی اور وہیں بیٹھ گیا۔ اب میں کھڑا ہونے کی بجائے بیٹھے بیٹھے ہی اس طرح سرکنے لگا۔ اس طرح سرکتے ہوئے بہت سا وقت گزر گیا۔ تھکن اور اعصابی تناؤ نے مجھے ہلکان کر دیا تھا مگر میں رکے بغیر بڑھتا چلا گیا۔ اب وہ موٹے تنے والا درخت قریب آ چکا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس درخت سے بس چند قدم پر وہ دروازہ ہے جہاں مجھے پہنچنا تھا۔ میں دھیرے دھیرے درخت کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک میرا پاؤں کسی چیز پر پڑا میں پھسلا اور بڑی مشکل سے اپنی چیخ روکی۔ وہ گول سا لمبا ڈنڈا تھا۔ بالکل ویسا جیسا میں نے تھانیداروں کے ہاتھوں میں دیکھا تھا' شاید اس کے چکنے اور گول ہونے کی وجہ ہی سے میرا پاؤں سلپ ہو گیا تھا۔

یہ بھی خدا کا شکر تھا کہ میں اس وقت کھڑا ہوا نہیں تھا ورنہ بری طرح گرتا اور میرے گرنے کی آواز سے چوکیدار ہوشیار ہو جاتا اور پھر جانے کیا ہوتا۔

میں نے وہ ڈنڈا اٹھا لیا۔ شاید یہ غیبی مدد تھی کیونکہ جیسے ہی میں درخت کے تنے کی آڑ سے نکلا اور اس طرف بڑھا جہاں میرے اندازے کے مطابق وہ دروازہ تھا' کوئی اچانک میرے سامنے آ گیا' یہ وہی چوکیدار تھا کیوں کہ سامنے آتے ہی اس نے ٹارچ والا ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ میں نے اسی ڈنڈے سے اس ہاتھ پر وار کیا اور پھر اپنی پوری طاقت سے ڈنڈا اس کے سر پر دے مارا۔ وہ چکرا کر گرا اور میں وہاں رک کر اسے دیکھنے کی بجائے ڈنڈا وہیں پھینک کر دیوار کی طرف لپکا۔ دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا اور کوریڈور کی ہلکی روشنی میں یہ روزن صاف نظر آ رہی تھی' شاید چوکیدار بھی یہی روزن دیکھ کر یہاں ٹھہرا تھا۔ میں نے وقت ضائع نہ کیا اور تیزی سے آگے بڑھ کر وہ دیوار نما دروازہ کھولا' دوسرے ہی لمحے میں اندر تھا۔

میں اندر بھی ایک لمحے کو نہ ٹھہرا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ یہ میری مشکل کا آخری لمحہ تھا مگر میں نے کسی خطرے کی پرواہ نہ کی اور خدا پر بھروسا کرتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ باہر اب بھی سناٹا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس پُراسرار کوریڈور کا دروازہ بند کر کے میں نے دایاں پٹ کھولا اور اندر داخل ہو

کوریڈور سنسان تھا۔ میں اطمینان سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

سب کچھ ویسا ہی تھا مگر میں.......... میرا پورا وجود پسینے میں شرابور تھا۔ خون کنپٹیوں پر ٹھوکریں سی مار رہا تھا۔ دل کی دھڑکن شور کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کر دیا اور بے دم سا بستر پر لیٹ گیا۔ میں نے اندر آتے ہی گھڑی دیکھی' پونے پانچ بج رہے تھے۔ اتنا بہت سا وقت گزر جانے پر میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

بڑی دیر بعد میری حالت سنبھلی تو میں اٹھ کر باتھ روم چلا گیا۔ باتھ روم کا دروازہ کھولتے ہی سامنے کی دیوار میں قدِ آدم آئینہ لگا ہوا تھا' اس پر نگاہ پڑتے ہی میں چونک گیا۔ میرے سلیپنگ سوٹ پر جا بہ جا دھبے پڑ گئے تھے۔ میں نے فوراً ہی شرٹ اتاری جو پشت سے بری طرح خراب ہو چکی تھی۔ یہ کپڑے پہنے رہنا خطرناک ہو گیا تھا۔ میں نے سلیپنگ سوٹ اتار کر شاور لیا اور تولیہ لپیٹے ہوئے باہر آ گیا۔ کپڑوں کی الماری کھولی جہاں ایک اور سلیپنگ سوٹ میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ میں نے وہ کپڑے پہنے اور میلے ہو جانے والے سلیپنگ سوٹ کو پانی سے اچھی طرح دھو کر وہیں باتھ روم میں لٹکا دیا۔

شاور لینے کے بعد میں کافی حد تک خود کو بہتر محسوس کرنے لگا۔ اب میں نے گزرے لمحات پر نگاہ ڈالی تو اس انتھک محنت اور کوشش کو بیکار ہی پایا۔ میں نے اتنا بڑا رسک لیا تھا مگر میں اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ نہ مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس عمارت میں کون تھا اور کیا ہو رہا تھا اور نہ ہی اس گیلری یا کوریڈور میں بنے ہوئے کمروں کا راز کھل سکا جو کل بھی لاک تھے اور آج بھی۔ یعنی اس ساری محنت اور مشقت کے بعد میں وہیں تھا جہاں کل تھا۔ اگر وہ چوکیدار نہ آ گیا ہوتا تو میں یقیناً کچھ نہ کچھ معلوم کر لیتا۔

بہرحال اب رونا بیکار تھا۔ میں آرام سے بستر پر لیٹ گیا۔ یہی غنیمت تھا کہ میں پکڑا نہیں گیا اور نہ ہی چوکیدار میری صورت دیکھ سکا تھا بس ایک پریشانی ہو گئی تھی کہ جانے وہ چوکیدار زندہ رہا یا مر گیا۔ میں نے اپنی پوری قوت سے ڈنڈا اس کے سر پر مارا تھا۔ خدا کرے وہ بچ گیا ہو۔ میں نے کروٹ بدلتے ہوئے دعا مانگی اور آنکھیں موند کر کچھ دیر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ میری آنکھ نہ بھی کھلی تو جگو مجھے جگا دے گا۔ شاید بری طرح تھک جانے کی وجہ سے ہی مجھے بہت جلد نیند آ گئی۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

مجھے کسی نے بھی نہ اٹھایا بلکہ میری آنکھ خود ہی کھل گئی اور آنکھ کھلتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میں کافی دیر سویا ہوں اور بہت اچھی نیند سویا ہوں کسی قسم کی کوئی تھکن یا نیند پوری نہ ہونے کا کوئی احساس نہ تھا جس پر مجھے حیرت ہوئی کیونکہ میں رات والے واقعے سے بہت تھک چکا تھا اور صبح کے قریب سویا تھا۔ میں نے بستر سے اٹھ کر بھرپور انگڑائی لی اور سائیڈ ٹیبل پر رکھی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور دم بخود رہ گیا۔ یہ گھڑی پونے بارہ بجا رہی تھی۔ میں نے پلکیں جھپکائیں۔ دوبارہ گھڑی پر نگاہ ڈالی یہ حقیقت تھی کہ گھڑی پونے بارہ بجا رہی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ جگو نے تو مجھے صبح سات بجے تک جگا دینا تھا مجھے ساڑھے آٹھ بجے تک ایئرپورٹ پہنچنا تھا مگر اب.........

میں نے فوراً انٹرکام اٹھا کر جگو کا نمبر دبایا۔ دوسری طرف سے کسی نے نہ اٹھایا۔ میں پریشان ہو گیا میں نے کپڑے بدلنا بھی مناسب نہ سمجھا اور انہی کپڑوں پر سلیپنگ گاؤن پہن کر باہر آ گیا۔ میں ابھی چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ بیرونی دروازہ کھلا' پہلے مسٹر زید اور ان کے پیچھے زینی اور جگو' تینوں اندر آ گئے۔ مسٹر زید کا چہرہ خشک ہو رہا تھا اور ان کے جبڑے بھینچے ہوئے تھے اور جگو بالکل کسی لاش ہی کی طرح سفید ہو رہا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی مسٹر زید نے کمال مہارت سے خود کو نارمل بلکہ بے انتہا خوش اخلاق ظاہر کیا۔ "ہیلو مسٹر اقبال .... آئی ایم سوری' دراصل میری غلطی کی وجہ سے آپ کی فلائٹ نکل گئی۔ میں بالکل بھول گیا تھا کہ آج آپ نے فلائی کرنا ہے"۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"مگر مسٹر زید......... میں وہاں اطلاع کر چکا تھا کہ میں........."

"آئی نو مسٹر اقبال لیکن......... بس آپ مجھے معاف کر دیں' قطعی غیر دانستگی میں ایسا ہو گیا۔ آپ پھر فون کر دیں اور میں نے زینی سے کہہ دیا ہے کہ وہ کل صبح کی فلائٹ میں آپ کی سیٹ بک کرا دے' پلیز....."

اس نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ میں کچھ اور نہ کہہ سکا' ویسے بھی میں بھلا کیا کر سکتا تھا؟ نہ اپنی مرضی سے یہاں آیا تھا اور نہ ہی اپنی مرضی سے یہاں سے جانے کا اختیار رکھتا تھا۔ ویسے میں گھبراہٹ میں مبتلا ہو گیا تھا کیونکہ میں رات ایک شخص کو زخمی کر چکا تھا یا شاید موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ ہر دو صورت میں ان لوگوں کو مجھ پر ہی شک ہو

سکتا تھا۔ اب مجھے خود پر بہت قابو رکھنا تھا اور اپنی کسی حرکت یا کسی بات سے' یہ ظاہر نہیں ہونے دینا تھا کہ رات والے واقعے کا تعلق مجھ سے ہے۔

"ٹھیک ہے مسٹر زید' نو پرابلم......... آپ اجازت دیں تو میں نہا کر کپڑے بدل لوں"۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں......... غالباً آپ نے ناشتا بھی نہیں کیا ہے؟" اس نے جگو کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں اب ناشتے کی ضرورت تو نہیں بس چائے پیوں گا"۔

"اوکے مسٹر اقبال' انشاء اللہ بہت جلد آپ سے ملاقات ہو گی' اس وقت مجھے ایک اہم کام نمٹانا ہے"۔ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور نہ معلوم کیوں میری نگاہ جگو کی طرف اٹھ گئی۔ شاید یہ میرے احساس کا دھوکا تھا کہ مجھے جگو کی نگاہوں میں التجا نظر آئی اس کا رنگ ایک بار پھر سفید ہو گیا اور وہ اپنے موٹے موٹے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ خوف زینی کی آنکھوں میں بھی تھا مگر اتنا واضح نہ تھا جتنا جگو کی آنکھوں میں تھا۔ مسٹر زید ابھی تک میری طرف متوجہ تھے۔ میں نے فوراً ہی نگاہیں جگو کے چہرے سے ہٹا کر مسٹر زید پر جما دیں۔ "آپ اسلام آباد سے کب آئے مسٹر زید؟"

"نہیں.........میں یہیں تھا"۔

"اوہ.........سوری میں بھول گیا تھا"۔ میں گھبرا گیا۔ اب بہتر یہی تھا کہ میں ان لوگوں کے پاس سے ہٹ جاتا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ مسٹر زید سے اجازت لے کر میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ وہاں آ کر سب سے پہلا کام تو میں نے یہ کیا کہ اس سلیپنگ سوٹ کو چیک کیا جسے میں رات کو دھو کر باتھ روم میں ٹانگ آیا تھا۔ اس پر مٹی کا کوئی دھبہ نہیں تھا' یہ دیکھ کر مجھے قدرے اطمینان ہوا۔ دوسرا کام میں نے جو کیا وہ یہ تھا کہ کپڑے بدلتے ہی وہ سلیپنگ سوٹ جسے میں پہن کر سویا تھا' بالکل اسی طرح تہہ کر کے الماری میں رکھ دیا جس طرح میں نے اسے الماری سے نکال کر پہنا تھا۔

میں آدھے' پون گھنٹے بعد تیار ہو گیا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ اب تک کوئی میرے لئے چائے لے کر نہیں آیا تھا۔ میں نے انٹرکام پر جگو کے کمرے کا نمبر دبایا۔ دوسری طرف سے فوراً ہی ریسیور اٹھا لیا گیا مگر جو آواز سنائی دی وہ جگو کی قطعی نہیں ہو

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

سکتی تھی اس لیے بولنے والی کوئی عورت تھی۔

"سوری میڈم' میں نے شاید غلط نمبر ملالیا۔"

"آپ نے ٹھیک جگہ ملایا ہے مسٹر اقبال' میں ابھی چائے لے کر حاضر ہوتی ہوں۔"

اتنا کہہ کر بولنے والی نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں حیران سا بیٹھا رہ گیا۔ چند لمحوں بعد ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ "کم اِن"۔ میرے منہ سے یہ الفاظ نکلتے ہی جیسے طلسمی دروازہ کھل گیا۔ وہ اتنی حسین اور خوب صورت تھی کہ میں پتھرا کر رہ گیا۔ اس نے سفید لباس پہنا ہوا تھا اور وہ لباس بھی اتنا عجیب تھا کہ اب تک میں نے نہیں دیکھا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میرے سامنے آسمان سے اتری ہوئی کوئی حور کھڑی ہو۔ اس کے مرمریں جسم پر سفید ریشمی لبادہ سا تھا جس نے اسے سر سے پیر تک ڈھانپا ہوا تھا کچھ عجیب و غریب سا لباس تھا۔

"مسٹر اقبال مجھے آپ کی خدمت پر مامور کیا گیا ہے۔ آپ مجھے نور کہہ سکتے ہیں۔"

اس نے آگے بڑھ کر چائے کی ٹرے سنٹرل ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور میں طلسمی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آ گیا۔ "تھینک یو مس نور......... جگو کہاں ہے؟"

"وہ غالباً جا چکا ہے"۔ اس نے دھیرے سے کہا اور نہ معلوم کیوں میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ "آپ چائے پی کر فارغ ہو جائیں۔ مسٹر زید آپ کا انتظار کر رہے ہیں"۔

اس نے اسی دھیمے لہجے میں کہا اور پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ نہ معلوم کیوں میں بے چین ہو گیا تھا۔ مجھے رہ رہ کر اس چوکیدار کا خیال بھی آ رہا تھا۔ میرا خیال تھا بلکہ مجھے یقین تھا کہ اب تک اس کے زخمی ہونے کا راز کھل چکا ہو گا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ بے ہوش ہوا ہی نہ ہو اور کسی اجنبی کی اس عمارت میں موجودگی کی اطلاع اسی لمحے مسٹر زید کو مل چکی ہو۔ بہرحال جو بھی معاملہ تھا ابھی تک سامنے نہیں آیا تھا مگر میرا یوں روک لیا جانا مجھے اندیشوں میں مبتلا کر رہا تھا۔

میں نے جلدی جلدی کسی نہ کسی طرح چائے پی اور فوراً ہی تیار ہو گیا میری خواہش تھی کہ جو کچھ بھی ہونا ہے یا ہو چکا ہے وہ جلد از جلد میرے سامنے آ جائے تاکہ اس جان

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

لیوا کیفیت سے میری جان چھوٹ جائے۔ تیار ہو کر میں نے جگو کے ایکسٹنشن پر نور کو اطلاع دی۔ وہ وہی مجھے لینے کے لیے آ گئی۔ یہ شاید اس کی شخصیت کا اثر تھا یا خدا جانے کیا بات تھی کہ میں اسے دیکھتے ہی افسردہ ہو گیا۔ یہ احساس مجھے شدت کے ساتھ ہوا کہ وہ بہت دکھی ہے یا اس کے ساتھ بدسلوکی ہو رہی ہے یا کچھ یوں جیسے وہ یہاں زبردستی لائی گئی ہے۔ جو تاثر مجھے زینی کے چہرے پر نظر آتا تھا وہ اس کے چہرے پر نہ تھا بلکہ اس کی آنکھوں میں خالی پن تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی آنکھیں خلا میں کچھ تلاش کر رہی ہیں۔

میں اس کے پیچھے پیچھے کوریڈور کراس کر کے باہر کے حصے میں آ گیا اور یہاں آتے ہی مجھے سانپ سونگھ گیا۔ بیچ لان میں ایک میت رکھی تھی۔ زینی اور مسٹر زید کے علاوہ یہاں بہت سے اجنبی چہرے بھی تھے جن پر تاسف پھیلا ہوا تھا۔ جگو بھی یہاں موجود تھا مگر ایسی حالت میں کہ اس کے چہرے پر جگہ جگہ نیل پڑے تھے۔ ایک آنکھ سُوج کر کپا ہو گئی تھی۔ وہ اس وقت صرف پتلون میں تھا یعنی اس کا اوپری حصہ بے لباس تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر نائیلون کی رسّی سے بندھے ہوئے تھے۔

مسٹر زید کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ انہوں نے جلتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ میں ان کی نگاہوں کی تاب نہ لا سکا اور میں نے ان کے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر لان میں رکھی اس میت پر گاڑ دیں۔ "یہ........ یہ کون ہے........ کیا ہوا اسے.........؟"

"یہ ادریس ہے مسٹر اقبال......... وہی لفٹ مین جو میں نے فاریہ کی فیکٹری میں بھیجا تھا اور جس نے عذرا کے پروگرام کی اطلاع دی تھی۔" مسٹر زید نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس دوران ان کی نگاہیں میرے چہرے کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔

میرا دل دھڑک اٹھا تھا مگر میں نے خود پر بڑی مہارت سے قابو رکھا اور معصوم بنا رہا۔ "مگر اسے کیا ہوا؟"

"اسے قتل کر دیا ہے کسی نے۔ اس کے سر پر ڈنڈا مارا جس سے یہ زخمی ہو گیا' سر سے خون بہا اور یہ رات بھر بیہوش پڑا رہا اور پھر......... خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو گئی"۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

میرا حلق خشک ہو گیا۔ گویا میں نے قتل کر دیا تھا۔ وہ میرے ہاتھوں زخمی ہوا اور پھر مر گیا۔ اس اطلاع نے مجھے شدید صدمے سے دوچار کیا تھا مگر یہاں میری افسردگی میری موت ثابت ہوتی اس لیے میں نے خود کو سنبھالے رکھا مجھے یقین نہیں تھا کہ میں اداکاری بھی کر سکوں گا مگر اس وقت مجھے حیرت ہوئی جب مسٹر زید نے مجھے بتایا کہ اس کی وجہ جگو ہے، جگو کی بے پروائی کے سبب کوئی شخص کوٹھی میں داخل ہوا اور اس حصے میں پہنچ گیا جہاں بہ قول مسٹر زید کے ان کی قیمتی اور اہم اشیاء، رقم اور دوسرے اہم دستاویزات رکھے تھے اور جہاں کی حفاظت کے لیے انہوں نے ادریس کی ڈیوٹی لگائی ہوئی تھی۔ مسٹر زید کی کہانی کے مطابق ادریس نے غالباً اس شخص کو دیکھ لیا تھا جو چوری کی نیت سے وہاں داخل ہوا تھا۔ ادریس نے اسے پکڑنے کی کوشش کی ہو گی جس پر آنے والے نے اسے زخمی کر دیا، زخم اس کے سر پر تھا اور اسی زخم نے اس کی جان لے لی تھی۔

میں آنکھیں پھاڑے مسٹر زید سے منہ کھولے ان کی کہانی سنتا رہا۔ وہ خاموش ہوئے تو میں نے پوچھا۔ ”مسٹر زید آپ کو یہ سب کیسے پتا چلا.......... آپ نے جب اسے دیکھا تو کیا یہ زندہ تھا؟“

”نہیں مسٹر اقبال، اصل میں مجھے صبح سویرے ورزش کرنے کی عادت ہے، آج صبح بھی میں حسبِ عادت ہلکی سی ورزش کرنے کے لیے باہر آیا تھا کہ گیٹ کھولتے ہی میں نے ادریس کو زخمی حالت میں باہر رکھے گملوں کے درمیان پڑے دیکھا تب میں نے اسے چیک کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بہت دیر ہوئی اس دنیا سے جا چکا ہے“۔

”سر مجھے معاف کر دیں.......... سر آئندہ ایسی کوتاہی نہیں ہو گی سر“۔ اس کی بات ختم ہوتے ہی جگو گڑگڑایا۔

آئندہ.......... نہیں جگو آئندہ تو میں خود بھی ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں دنیا کا ہر نقصان برداشت کر سکتا ہوں مگر اپنے وفادار ساتھیوں کا جانی نقصان برداشت کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ میں تمہیں آئندہ ایسی کوتاہی کا موقع نہیں دوں گا۔“ مسٹر زید نے ٹھہرے ہوئے مگر سفاک لہجے میں جواب دیا۔

”اسے معاف کر دیں سر.......... یہ خود بھی آپ کا وفادار ہے“۔ میری پشت کی جانب سے مس نور کی سرسراتی ہوئی سرگوشی سنائی دی۔

مسٹر زید نے چونک کر میری پشت پر کھڑی مس نور کو دیکھا۔ اس نے گھبرا کر نگاہیں جھکا لیں۔ ہم سب ہی مس نور اور مسٹر زید کو دیکھ رہے تھے۔

”ہوں.......... یہ بھی سچ ہے کہ جگو نے اب تک مجھ سے بے وفائی نہیں کی ہے، اگر کل رات والا واقعہ اس کی لاعلمی میں ہوا ہے تو..........“

”سر! خدا کی قسم میں نہیں جانتا کہ وہ کون تھا اور کیسے اندر داخل ہوا تھا..........“ جگو جلدی سے بول پڑا، شاید مسٹر زید کا جواب سن کر اسے کچھ یقین ہو گیا تھا کہ اسے معاف کیا جا سکتا ہے۔

”خیر اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے فی الحال اس کی تدفین کا انتظام کرو“۔ مسٹر زید نے وہاں کھڑے لوگوں سے کہا اور پھر میری جانب گھوم گئے۔ ”ہاں تو مسٹر اقبال میں کیا کہہ رہا تھا؟“ اس نے بالکل اس طرح کہا جیسے ہم خوش گپیوں میں مصروف تھے اور وہ جیسے چائے کا گھونٹ لینے کے لیے رکا تھا۔

”ہم ادریس ہی کے متعلق بات کر رہے تھے۔ مسٹر زید..........“

”اوہ لیو اٹ.......... وہ اب نہیں رہا اس لیے اس موضوع کو ختم کر دیں“۔

اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔ میں اس طرز عمل پر حیران تھا کہ ایک شخص ختم ہو گیا تھا اور وہ کتنے اطمینان سے باتیں کر رہا تھا۔ ادریس کی موت نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ میری کیفیت بہت خراب تھی۔ یہ احساس مجھے کچوکے لگا رہا تھا کہ میں نے ایک شخص کو قتل کر دیا ہے۔ میں اس وقت تنہائی کا طالب تھا مگر مسٹر زید میری جان چھوڑنے پر تیار نظر نہیں آتے تھے۔ دوسری طرف میں اس طرح روک لیے جانے پر بھی پریشان تھا۔ مجھے یہ اندازہ بھی نہیں ہو رہا تھا کہ مسٹر زید کو اس سلسلے میں مجھ پر شک ہوا یا نہیں اور اسی الجھن نے مجھے بے چین کیا ہوا تھا۔

”مسٹر زید، مس فاریہ اور بیگ صاحب میرے نہ پہنچنے پر پریشان ہو جائیں گے“۔

”میں جانتا ہوں، آپ فون کر دیں کہ آپ چند روز بعد آئیں گے“۔

”جی.......... چند روز بعد..........؟“ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

”دراصل مجھے کچھ ضروری کام ہیں اور پھر اہم بات یہ ہے کہ آج رات میں آپ کو کسی سے ملوانا چاہتا ہوں، اور.......... مسٹر اقبال آج مجھے ایک بہت ہولناک اطلاع ملی ہے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

وہ یہ کہ بہادر اسی ہفتے میں سیماں کو برطانیہ بھیج رہا ہے۔ ویسے تو اس نے سیماں سے کہا ہے کہ وہ کچھ عرصہ گھوم پھر لے مگر مجھے یقین ہے کہ وہ بلا مقصد اسے نہیں بھیج سکتا۔ وہ ضرور اسے استعمال کرے گا"۔

"مسٹر زید آپ ایک کام کیوں نہیں کرتے' آپ اگر میری بجائے سیماں کو اغوا کروا لیتے اور اسے یہ تمام کہانی سناتے تو شاید آپ کی ساری پریشانیاں دور ہو جاتیں اور آپ کی بیٹی بھی آپ کو مل جاتی"۔

"یہ اتنا آسان نہیں ہے مسٹر اقبال.......... میں یہ بات بہت پہلے سوچ چکا ہوں۔ بہادر نے جو زہر سیماں کے اندر بھرا ہے وہ اتنی آسانی سے ختم نہیں ہو گا۔ اپنی بے گناہی کے جو ثبوت میں حاصل کرنا چاہتا ہوں بس وہی سیماں کے دل سے میری نفرت کو نکال سکتے ہیں اور آپ اس سلسلے میں میری مدد کا وعدہ بھی کر چکے ہیں"۔

"میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ آپ ہر معاملے کو اس طرح گھما پھرا کر کیوں حل کرنا چاہتے ہیں۔ ثبوت حاصل کرنے کے لیے بھی آپ نے اتنا طویل چکر لگایا۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ فاریہ اور بیگ صاحب خود ہی وہ بکس آپ کے حوالے کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف سیماں.........."

"مسٹر اقبال...." اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے خاموش کرا دیا۔ "میں اپنے ہر معاملے کو اپنے طور پر حل کرنے کا عادی ہوں۔ اگر کبھی مجھے آپ کے مشورے کی ضرورت پڑی تو میں ضرور مشورہ لوں گا"۔ اس نے روکھے انداز میں جواب دیا اور میں خاموش ہو گیا۔

اس دوران میں لان میں سے ادریس کی میت اٹھالی گئی تھی۔ مس زینی اس کی تدفین کے انتظامات کروا رہی تھیں۔ میں کھڑے کھڑے تھک گیا تھا۔ شاید مسٹر زید سمجھ گئے تھے اس لیے کہ وہ فوراً ہی اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

"آیئے مسٹر اقبال اندر بیٹھتے ہیں"۔

ہم دونوں ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ مسٹر زید ایک صوفے میں دھنس گئے اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی' ٹیلی فون میرے قریب ہی رکھا تھا جبکہ مسٹر زید یہاں سے کافی دور تھے انہوں نے تھکے ہوئے انداز میں فون کو دیکھا اور پھر مجھے ریسیور اٹھالینے کا اشارہ

کیا۔

"یس ہیلو.........." میں نے ریسیور اٹھا کر کہا۔

"مسٹر زید سے بات ہو سکتی ہے مسٹر..........؟" دوسری جانب سے بڑے اکھڑے ہوئے انداز میں پوچھا گیا۔ وہ آواز' وہ لہجہ' میرے سر میں دھماکے سے ہونے لگے۔ میں بولنے والے کو جانتا تھا مگر یاد نہیں آ رہا تھا۔ یہ لہجہ میں نے بہت قریب سے سنا تھا' میں یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

"اے مسٹر..........کیا تم سو گئے یا مر گئے؟"

"جج.......... جی.......... ایک منٹ ہولڈ کیجئے' میں دیکھتا ہوں۔ آپ کا نام..........؟"

"نام صرف دوستوں اور دشمنوں کو بتاتا ہوں مسٹر' اجنبی لوگوں کو نہیں"۔

اور میرے دماغ میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔

وہ سوفی صد راجہ کی آواز تھی۔ میں اسے مخاطب کرنے ہی والا تھا کہ مسٹر زید نے آگے بڑھ کر ریسیور میرے ہاتھ سے لے لیا۔

"یس.........." انہوں نے اسی تھکے ہوئے انداز میں کہا اور پھر غالباً دوسری جانب موجود شخص کی آواز سنتے ہی ان کی آنکھوں میں روشنی سی بھر گئی۔ "کہاں ہو تم؟" انہوں نے بے چینی سے پوچھا پھر کچھ دیر تک وہ دوسری جانب بولنے والے کا جواب سنتے رہے۔ اس دوران میں ان کے اضطراب میں اضافہ ہو رہا تھا البتہ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ اضطراب خوشی کا ہے یا کسی پریشانی کا سبب ہے۔

"ٹھیک ہے مگر دیکھو.......... تم جتنا جلد ہو سکے مجھ سے ملاقات کرو۔ آغا سے الجھنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ معاملہ بڑھ بھی سکتا ہے"۔ اتنا کہہ کر وہ پھر کچھ دیر خاموشی سے سنتے رہے پھر بولے۔ "اوکے.......... سی یو.......... اور ہاں تھینک یو.......... نہیں نہیں اس سلسلے میں جو کچھ مجھ سے ہو سکا میں ضرور کروں گا' نہیں.......... اب ضرورت نہیں' شاید میرا کام اب آسانی سے ہو جائے"۔ آخری جملہ کہتے ہوئے انہوں نے مجھے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔

میں جو ٹیلی فون پر بولنے والے کی آواز سن کر بے چین ہو گیا تھا جھجک کر دوسری

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

طرف دیکھنے لگا۔ میں مسٹر زید پر اپنی بے چینی کا اظہار کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"اوکے............ میں منتظر ہوں"۔ انہوں نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا اور گہری سانس لی یوں جیسے ان کا کوئی بہت بڑا کام ہو گیا ہو۔

میں نے کن انکھیوں سے وال کلاک کی طرف دیکھا جو اب سوا تین بجا رہا تھا۔ مجھے شدید بھوک کا احساس ہو رہا تھا۔ دوسری جانب مجھے فاریہ کی طرف سے بھی سخت پریشانی تھی۔ اس نے بڑی شدت سے میرا انتظار کیا ہو گا۔ اب وہ ناامید ہو گئی ہو گی اور جانے کیا کیا سوچ رہی ہو گی اور سوہنی............ جانے کیسی ہو گی کس قدر خراب قسمت تھی اس کی کہ خوشی جب بھی بڑھ کر اس کی دہلیز کو چھوتی تھی، وہ عذابوں میں گھر جاتی تھی۔ پہلی بار جب اس نے اپنی آنکھوں میں میرے پیار کا سپنا سجایا تو قدرت نے مجھے اس سے چھین لیا، ہم جدائیوں کی فصلیں کاٹتے رہے اور اسے لوٹا جاتا رہا اور اب جب وہ مجھے دوبارہ نصیب ہوئی، اس کی بجھی آنکھوں میں دیے سے ٹمٹمائے تو ایک بار پھر میں اس سے چھین لیا گیا، جانے میں اس کی اور وہ میری قسمت میں تھی یا نہیں۔

"مسٹر اقبال! مجھے آپ کی پریشانی کا احساس ہے مگر یقین کیجئے میں بے حد مجبور ہوں۔" مسٹر زید کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"اوہ نہیں مسٹر زید، آپ پریشان نہ ہوں۔ مجھے ان چھوٹی چھوٹی پریشانیوں کی عادت سی ہو گئی ہے"۔

"طنز کر رہے ہیں؟"

"نہیں نہیں بھلا میری ایسی مجال کہاں، میں حقیقت بتا رہا ہوں"۔

اسی لمحے زینی کمرے میں داخل ہوئی۔ "سر کھانا لگا دیا گیا ہے"۔

"آیئے مسٹر اقبال"۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر ایسی کوئی بات نہ تھی جس سے احساس ہوتا کہ وہ کچھ دیر پہلے کسی تدفین کا انتظام کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ صبح سے اب تک کھانے ہی کے انتظام میں مصروف تھی۔ اس کی مخمور نگاہوں میں وہی معصومیت تھی۔ ہونٹوں پر نرم سی گیلی گیلی مسکراہٹ جو آدمی کو خواہ مخواہ تر و تازگی کا ایک فرحت انگیز سا احساس دلاتی ہے۔

مسٹر زید کے ساتھ ہی میں بھی کھڑا ہو گیا۔ ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے ڈائننگ روم

میں پہنچے جہاں نور نگاہیں جھکائے گہری خاموشی میں سمٹی کھانا لگا رہی تھی ہمیں دیکھتے ہی وہ ذرا سا جھکی اور کرسی پیچھے کی طرف سرکا کر مسٹر زید کے بیٹھنے کا انتظار کرنے لگی۔ مسٹر زید کے بیٹھتے ہی میں اور مس زینی بھی اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ نور نے فوراً ہی کھانا سرو کرنا شروع کر دیا۔ مجھے اس کے وجود سے لپٹی افسردگی اور خاموشی کو دیکھ کر وحشت سی ہو رہی تھی۔ میرے ذہن سے مس زینی کی شخصیت کا فرحت انگیز احساس زائل ہو کر مس نور کے وجود کا وحشت ناک احساس رینگنے لگا تھا۔

کچھ دیر کے بعد وہ خاموشی سے سر جھکائے کمرے سے باہر چلی گئی۔ میری نگاہیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ شاید اس بات کو مسٹر زید نے بھی محسوس کر لیا تھا۔

"مسٹر اقبال............ یہ بچی جب صرف دس برس کی تھی تبھی سے میرے پاس ہے۔ یہ پہلے ایسی نہیں تھی۔ بات بات پر ہنسنے اور خوش ہونے والی بچی تھی مگر جب محمد بخش اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا تو............ اس نے اس کی ساری خوشیاں چھین لیں۔ اسے بتا دیا کہ یہ اس کی بیٹی نہیں ہے بلکہ اسے اس کی بانجھ بیوی نے چرایا تھا۔ اسے بچے کی بڑی تمنا تھی اور یہ تمنا اتنی شدید ہو گئی تھی کہ وہ یہ جرم کر بیٹھی۔ محمد بخش اپنی مجبور بیوی کا جرم چھپائے چھپائے جانے کہاں کہاں پھرتا رہا اور پھر تقدیر انہیں یہاں تک لے آئی۔ محمد بخش میرے پاس ملازم ہو گیا۔ اس کی بیوی سارے گھر کی دیکھ بھال کرنے لگی اور میں............ میں نور میں سیماں کا عکس تلاش کرنے لگا مگر وہ جانے کیوں مجھ سے ڈرتی تھی اور کبھی میرے سامنے نہیں آتی تھی۔ نہ ہی مجھ سے بے تکلف ہوتی تھی۔ اسے شدت سے یہ احساس تھا کہ وہ، اس کی ماں اور اس کا باپ میرے ملازم ہیں۔" اتنا کہہ کر مسٹر زید لمحہ بھر کو ٹھہرے، انہوں نے نوالہ منہ میں رکھا۔ چند لمحے کچھ سوچتے رہے پھر بولے۔ "پھر اس کی ماں............ نہیں بلکہ محمد بخش کی بیوی مر گئی اور دو برس بعد محمد بخش بھی شدید بیمار ہو کر بستر سے جا لگا، تب ہی ایک روز اس نے مجھے بلوایا اور نور کو بھی اپنے پاس بٹھا لیا۔

"صاب جی، اس بچی کو آپ کے حوالے کر رہا ہوں............ اور اس کی ذات سے وابستہ وہ راز بھی آج افشا کر رہا ہوں جسے سنبھالے سنبھالے میرے سینہ دکھ گیا ہے۔ اب اور جیا نہیں جاتا صاب جی"۔ اس نے اکھڑی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا تو میں حیران ہو

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

گیا تھا مسٹر اقبال' کہ بھلا اس کی اپنی بچی کی ذات سے کون سا ایسا راز وابستہ ہے جسے وہ ان حالات میں' اپنے آخری وقت میں افشا کرنا چاہتا ہے۔ مگر جب اس نے بتایا کہ نور کو چھ یا سات برس کی عمر میں اس کی بیوی سکینہ نے ایک گاؤں کے کھیت سے اغوا کیا تھا تو میں ہی نہیں خود نور بھی اچھل پڑی تھی۔ پھر محمد بخش نے بتایا کہ سکینہ نے مرتے دم تک مجھے اس گاؤں کا نام نہیں بتایا کہ کہیں میں بچی کو واپس نہ کر آؤں۔ اب میں اس بچی کو آپ کے سہارے چھوڑے جا رہا ہوں' یہ اگر اپنے ذہن پر زور دے کر کچھ یاد کر سکے تو ٹھیک ہے ورنہ.......... سکینہ کے جرم کی معافی مانگنے کے سوا میرے بس میں کچھ بھی نہیں۔ پھر اس نے نور سے کہا تھا کہ بیٹا اگر میں جانتا کہ تُو کس کی بچی ہے تو اپنی بیوی کی اور اپنی خوشیوں کا گلا گھونٹ کر تجھے تیرے اپنوں کو لوٹا دیتا۔ پھر مسٹر اقبال' وہ نور کو ایک اذیت ناک کیفیت میں مبتلا کر کے مر گیا۔ یہ اس نے بہت برا کیا' ایک جرم اس کی بیوی نے کیا تھا اور دوسرا جرم وہ خود کر کے مر گیا تھا۔ نور اپنوں کی موت پر رو کر چپ ہو جاتی مگر وہ تو اسے اپنوں کی جدائی کا ایسا دکھ دے گیا جسے رو کر بھول جانا اس کے بس میں ہی نہیں' بس اسی روز سے نور بالکل بدل گئی۔ میں نے بہت چاہا کہ وہ یہاں بیگانوں کی طرح نہ رہے مگر.........."

مسٹر زید خاموش ہوئے تو مجھے اپنے وجود میں بہتے درد کا احساس ہونے لگا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کائنات میں بکھری تمام اذیتیں میرے ہی گرد گھیرا ڈال کر ناچ رہی ہیں۔ میں گاؤں سے ملنے والے دکھوں کو جھولی میں بھر کر نکلا تو مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ یہ دکھ بڑھ کر میرے ارد گرد حصار سا بنا لیں گے۔ مجھے تو یہ گمان تھا کہ راجہ اور خان وغیرہ کے ملنے کے بعد' ان کی مدد سے میں اپنے دکھوں سے آزاد ہو جاؤں گا اور زندگی کو کچھ ایسے برتوں گا کہ خوشیاں میرے' ماں کے اور سوہنی کے دکھوں کے عکس کو دھندلا دیں گی مگر یہاں تو ہر شخص کے وجود سے افسردگی اور دکھوں کی ٹیسیں سی اٹھتی محسوس ہوتی تھیں یوں لگتا تھا جیسے میں زندگی کو نہیں بلکہ دکھوں کو پرکھنے اور برتنے کے لیے نکلا ہوں۔

دکھوں کا یہ گھنا جنگل کب ختم ہو گا' کب اذیتوں کی یہ طویل رات کٹے گی' کب میں اس اندھی رات کی خوفناک سرنگ سے باہر نکلوں گا' کچھ پتا ہی نہ چلتا تھا۔ دور دور تک ایسی کوئی کرن نہ تھی جسے اپنی منزل سمجھ کر میں اس سمت بڑھنے کی کوشش کرتا اور مجھے

یہ آس بندھتی کہ یہ طویل اور اندھی رات کہیں نہ کہیں ضرور ختم ہو جائے گی۔ اگر کوئی کرن نظر بھی آئی اور میں نے اسی سمت قدم بھی بڑھائے تو بہت جلد یہ احساس ہو گیا کہ وہ روشنی کی کرن نہ تھی بلکہ میرے احساس کا دھوکا تھا۔ یہ کرن خود میرے ہی ذہن نے تراشی تھی اس ذہن نے جو دن رات کرنوں کے خواب دیکھا کرتا تھا یہ تمام کرنیں میری اپنی تمنا کے سوا کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔

"مسٹر اقبال کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا"۔ مس زینی کی مترنم آواز مجھے سوچوں کے گمبھیر اندھیرے سے باہر لے آئی۔

"سوری۔" میں نے چونک کر جواب دیا اور کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

مسٹر زید مجھے گہری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان کی نگاہوں کی تیزی اور گہرائی کو اپنے چہرے پر سرسراتا محسوس کیا مگر میں نے سر اٹھا کر نہ دیکھا۔

"آپ مس نور سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں"۔ مسٹر زید نے قورمہ اپنی پلیٹ میں نکالتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں مسٹر زید' یہاں آپ کا جملہ غلط ہے"۔ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ اب میں خود کو بہت حد تک سنبھال چکا تھا۔ "کہنا یوں چاہیے کہ میں یہاں آ کر بہت متاثر ہوا ہوں"۔ میں نے لفظ یہاں پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "آپ کی شخصیت' مس زینی کی شخصیت اور کردار' جگو کی وفا.......... اور پھر بے وفائی' مس نور کا وجود اور اس کے گرد لپٹی ہوئی افسردہ سی خاموشی.......... یہ سب تحیر خیز ہے۔ کم از کم میرے لیے یہ سب کچھ عجیب ہے"۔ میں نے بڑے مضبوط اور پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

"فاریہ' زاریہ' بیگ صاحب اور بہادر.......... پھر سیماں.......... ان سب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے' آپ کی کہانی کے مطابق تو آپ کی زندگی سے ان سب کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا اور جس چیز کا تعلق آدمی کی اپنی زندگی سے نہ ہو مگر پھر اچانک وہی چیز اس کی زندگی کا مرکز بن جائے' وہ بھی عجیب محسوس ہوتی ہے"۔ مسٹر زید نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"یقیناً.......... میرے لیے وہ سب بھی کم تحیر خیز نہ تھے.......... مگر اب تک شاید میں ان کا عادی ہو چکا ہوں"۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"ہم سب بھی آپ کے عادی ہو جائیں گے' مسٹر اقبال' زندگی تو آپ کو کسی نہ کسی طور گزارنا ہی ہے۔ گاؤں میں یہ محدود تھی اور رہ سکتی تھی مگر اب جبکہ آپ گاؤں چھوڑ آئے ہیں تو یہاں کے دکھ درد' نشیب و فراز سب جداگانہ انداز رکھتے ہیں اور آپ کو اب ان سب چیزوں کو انہی کے انداز میں پرکھنا ہو گا"۔

"جی مسٹر زید' میں کوشش کر رہا ہوں مگر.......... گاؤں میں دکھوں کا بھی اور خوشیوں کا بھی یہ معیار نہیں تھا۔ وہاں کے دکھ بھی اور خوشیاں بھی دونوں ہی معصوم اور سادہ ہوتی ہیں' وہاں ہمیں دکھ اور خوشیاں دھوکا نہیں دیتے مگر یہاں مجھے قدم قدم پر دکھ اور خوشیاں دھوکا دے جاتے ہیں۔ جسے میں دکھ سمجھتا ہوں وہ دکھ نہیں نکلتا اور جسے میں خوشی محسوس کرتا ہوں وہ خوشی نہیں ہوتی۔ اب آپ اپنی مثال ہی لے لیں۔ آپ نے مجھے اغوا کروایا' تہہ خانے میں قید رکھا' اور میں آپ کو اپنا کوئی بڑا دشمن سمجھ کر دکھ اٹھانے کو تیار ہو گیا پھر سب کچھ بدل گیا۔ آپ مہربان نکلے' آپ نے میری توقع سے بڑھ کر عنایات کیں۔ میں آپ کو فاریہ کا حریف اور ہیروئن کا اسمگلر سمجھا تھا مگر آپ.......... محض ایک دکھی باپ کی حیثیت سے سامنے آئے۔ جس کی بیٹی کو نہ صرف اس سے چھین لیا گیا بلکہ اسے باپ سے متنفر کر دیا گیا۔ یہ دھوکا نہیں تو اور کیا ہے؟ اور وہ.......... سوہنی' جسے اپنے سامنے پا کر میں نے سمجھا کہ مجھے دنیا کی سب سے بڑی خوشی مل گئی' میرا پیار میری دسترس میں آ گیا۔ جدائی کا دکھ ختم ہو گیا.......... وہ.......... وہ ٹوٹی جا چکی ہے .... وہ جسے میں اپنی زندگی سمجھا تھا خود دھیرے دھیرے موت کی طرف بڑھ رہی ہے میں چاہوں بھی تو اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا خواب پورا نہیں کر سکتا اس لیے کہ.......... کہ وہ نشے کی عادی ہے' نشہ اس کی رگوں میں رچ بس گیا ہے۔ میں ایک نہ ایک روز اسے کھو دوں گا"۔

"اوہ مسٹر اقبال.......... ڈونٹ وری.......... زندگی ایسی ہی ہوتی ہے' یہاں آسمانوں کی بلندیوں کے ساتھ ساتھ انتہائی پستیاں بھی ہیں اور بلندیوں اور پستیوں کو کائنات میں یکجا کر کے خدا یہی تو بتا رہا ہے کہ زندگی یہ ہے اور جب زندگی یہ ہے مسٹر اقبال تو ہر زندہ شے کو ان دونوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس سے بچنے کا صرف اور صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ زندگی کو ختم کر لیا جائے مگر یہ بات نہ بھولیے کہ زندگی کو از خود ختم کرنے والا پھ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

پستیوں کی طرف گامزن ہو جاتا ہے' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جبکہ زندہ رہ کر وہ ایسے کام کر سکتا ہے جو موت کے بعد اسے بلندیوں کی طرف لے جاتے ہوں"۔

"ٹھیک کہتے ہیں آپ.........."

"تو پھر آپ کھانا کھائیے' خود کو ان جھمیلوں سے آزاد کر لیجئے اور ہر جذبے کو اس کی تمام تر سچائیوں کے ساتھ محسوس کرنے کی کوشش کیجئے' ہر جذبے کی ایک الگ لذت ہے مسٹر اقبال' خواہ ہمیں پسند ہو یا نہ ہو مگر ہونا یہی چاہیے کہ ہم اپنی ذات میں محسوس ہونے والے جذبے کو پوری شدت سے محسوس کریں' ایسا کرنا ہمارے علم اور تجربے میں اضافہ کرتا ہے۔ ہمارے اندر قوت پیدا کرتا ہے اور یہ قوت زندگی کو ہم پر آسان کر دیتی ہے"۔

"آپ کی باتیں سن کر ایسا ہی لگ رہا ہے مسٹر زید۔ زندگی شاید آپ پر آسان ہو چکی ہے"۔ میں نے مسٹر زید کے چمکتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کہا۔ مجھے اس کی باتیں سن کر واقعی اس کی ذہانت' علم اور تجربے کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ مسکرایا۔ میں کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ زینی کھانے سے فارغ ہو چکی تھی اور کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔ مسٹر زید کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ وہ محض میرا ساتھ دے رہے ہیں ورنہ وہ بھی کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ کچھ دیر بعد نور چائے کی ٹرالی لیے پھر کمرے میں داخل ہوئی۔ ہم سب کو چائے دے کر وہ پھر اسی خاموشی سے باہر چلی گئی۔

"مسٹر زید.......... میں فاریہ کو فون کروں گا۔ اس سے اپنے وہاں پہنچنے کے بارے میں کیا کہوں؟"

"مسٹر اقبال' اصولاً آپ کو روکنا تو نہیں چاہیے مگر میں نے شاید آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ میں آپ کو کسی سے ملوانا چاہتا ہوں شاید آج ہی رات کو ملوا دوں' اگر آج ایسا نہ ہو سکا تو انشاء اللہ کل تک ضرور ہو جائے گا' پھر آپ جا سکیں گے۔ میرا خیال ہے کہ آپ فاریہ سے صرف دو روز کی مہلت اور مانگ لیں اس تاخیر کے لیے میں معذرت خواہ ہوں"۔

"وہ کون ہے مسٹر زید جس سے میری ملاقات ضروری ہے؟"

"اس سلسلے میں اگر آپ کچھ صبر کر لیں تو.........." اس نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ پھر میں نے اصرار نہیں کیا۔ وہ جو بھی تھا اسے بہرحال میرے سامنے تو

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

آنا ہی تھا۔ میں نے سرہلایا' رِسٹ واچ پر نگاہ ڈالی چار بج کر پچیّس منٹ ہوئے تھے میں مسٹر زید اور زینی سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں آگیا۔ میں نے سگریٹ سلگائی اور لیٹ گیا۔ میں کوئی ایسا بہانہ سوچنے لگا جو فاریہ سے کر سکوں اور وہ میرے بہانے سے مطمئن بھی ہو سکے۔ پہلے تو میں نے کہہ دیا تھا کہ میں جمال کے پیچھے یہاں تک پہنچ گیا ہوں اور سیماں اس کے ساتھ ہے مگر اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر عذرا نے اس دوران میں فاریہ سے رابطہ قائم کیا تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ سیماں وہیں لاہور میں موجود ہے۔ خود فاریہ کے بارے میں تو میں جانتا تھا کہ ان حالات میں اسے اتنی فرصت نہ ہو گی کہ وہ خود سیماں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے جائے۔ اب مجھے کوئی ایسی بات کرنا تھی جو بنی رہتی اور فاریہ کو مجھ پر کسی قسم کا شک نہ ہوتا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بہت جلد میں نے بہانہ تراش لیا مگر اس وقت اسے فون کرنا بیکار تھا۔ میں اسے شام چھ بجے کے بعد ہی گھر پر فون کرنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری طرف سے بہت پریشان ہو گی مگر پھر بھی ایسا ہو سکتا تھا کہ وہ فیکٹری گئی ہوئی ہو یا کہیں اور گئی ہو مگر چھ بجے کے بعد گھر پر ملنے کے سو فی صد امکانات تھے۔

میں نے دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد فاریہ کا فون نمبر ملایا۔ دوسری طرف کچھ دیر تک بیل بجتی رہی مگر کسی نے فون نہ اٹھایا تو میرا اضطراب بڑھنے لگا۔ ایسا ممکن نہ تھا کہ گھر میں کوئی نہ ہو۔ گھر کے لوگ نہیں ہوتے تو حمیدہ کو تو لازماً گھر میں ہونا چاہیے تھا اور ویسے بھی میرے نہ پہنچنے کی بناء پر فاریہ کو یہ امید ضرور ہو گی کہ میں اس سے کسی بھی حال میں فون پر رابطہ قائم کروں گا۔ اسے اگر کسی کام سے جانا بھی پڑ گیا تو وہ بیگ صاحب کو یا سلطان کو فون کے انتظار میں ضرور بٹھاتی۔ میں نے گھڑی دیکھی' مجھے ریسیور اٹھائے ہوئے تقریباً دو منٹ ہو چکے تھے۔ میں ریسیور رکھنے ہی والا تھا کہ اچانک دوسری طرف سے کسی نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو........." یہ سلطان تھا۔

"ہیلو سلطان......... میں بالا ہوں"۔

"ہاں بالے......... تُو کیوں نہیں آیا' ہم سب پریشان ہیں"۔

"سن سلطان......... میں شاید ابھی دو روز اور نہ آ سکوں گا"۔

"کیوں .... کیا بات ہے......... کیا تُو آنا نہیں چاہتا"۔

"بیکار باتیں نہ کر' یہاں میں جس معاملے میں الجھا ہوا ہوں' اس سے نکلنے میں مجھے کچھ وقت لگے گا"۔

"تُو کہاں ہے......... اپنا فون نمبر کیوں نہیں دیتا......... نمبر دے' فاریہ بہت پریشان ہے' وہ رات بھر لان میں ٹہلتی رہی ہے اور آج بیمار ہو گئی ہے۔ اسے پتا چلا تو مزید پریشان ہو جائے گی۔ تُو نمبر دیدے وہ اس وقت سو رہی ہے۔ تجھ سے بات کر کے مطمئن ہو جائے گی"۔

"میں کسی ایسی جگہ سے فون نہیں کر رہا کہ تجھے نمبر دوں۔ میں خود ہی رات کو یا کل صبح اس سے بات کر لوں گا' اور سن سوہنی کیسی ہے' ڈاکٹر کو دکھایا؟ اور ماسی"؟

"ماسی تو کچھ ٹھیک ہے بالے مگر سوہنی کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ یہ تو اس کی قوتِ برداشت ہے ورنہ اس کی تڑپ دیکھ کر ہمارا جی چاہتا ہے کہ اسے زہر دے دیں۔"

"نہیں سلطان......... ایسا نہ کرنا......... وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ میری امانت ہے سلطان اس کا خیال رکھنا اور ہاں......... عذرا کی کوئی اطلاع ہے؟"

"نہیں البتہ فاریہ یعقوب کو لے آئی ہے' وہ اس وقت بیگ صاحب کے پاس ہے' ان کے کمرے میں"۔

"یہ اچھا کیا اس نے' ٹھیک ہے پھر......... میں کسی وقت دوبارہ فون کر لوں گا' تو فاریہ کو بتا دینا کہ میں ٹھیک ہوں اور دو روز بعد شاید واپس آ جاؤں"۔

"شاید.........؟"

"ہاں یعنی ممکن ہے دو روز بعد یا ممکن ہے وقت کچھ اور بڑھ جائے مگر میں ٹھیک ہوں' وہ میرے لیٹ ہو جانے پر پریشان نہ ہو"۔

"بالے تو تو بے حس ہو گیا ہے' کسی کی تکلیف اور پریشانی کا تجھے کوئی بھی احساس نہیں' سوہنی کی خالی آنکھیں' ان میں تیرتا بھیگا بھیگا انتظار مجھے تو بہت بے چین کر دیتا ہے بالے' وہ روز بروز کمزور ہوتی جا رہی ہے اسے دیکھ کر خوف سا آتا ہے لگتا ہے جیسے کسی بھی دم وہ ہم سے جدا ہو جائے گی مگر تُو......... پتا نہیں تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں ہوا ہے سلطان' بس دکھ چھپانے کا سلیقہ آ گیا ہے ورنہ انسان تو میں بھی ہوں اور سوہنی تو میرے لیے دنیا کی اہم ترین ہستی ہے مگر کیا کروں سلطان' میرے

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

گرد بُنا ہوا جال اس قدر مضبوط ہے کہ اسے توڑنا تنہا میرے بس میں نہیں لگتا۔ بہرحال.......... میں جلد آؤں گا' تو سب کو تسلی دے دینا' سوہنی کو بھی"۔

پھر اس سے پہلے کہ سلطان مزید کچھ کہتا میں نے ریسیور رکھ دیا۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ یہ سب کچھ خود مجھے بھی پسند نہیں مگر یہاں آدمی اپنی پسند کی زندگی بھلا کب گزارتا ہے۔ میں بہت دیر تک سوچوں میں الجھا رہا پھر انٹرکام کی آواز سے چونکا۔

"مسٹر اقبال.......... سر آپ کا انتظار کر رہے ہیں"۔ مس نور کی آواز سن کر میں اٹھ بیٹھا۔

"مس نور وہ اس وقت کہاں ہیں؟"

"ڈرائنگ روم میں۔ ان کے مہمان آ گئے ہیں۔ انہوں نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں آپ کو ضرور بتا دوں تاکہ آپ ذہنی طور پر تیار ہو جائیں"۔

"ذہنی طور پر تیار ہو جاؤں؟ میں سمجھا نہیں مس نور.........."

"آئی ایم سوری سر.......... میں اس سلسلے میں کوئی وضاحت نہیں کر سکتی' سر کا حکم تھا جو میں نے آپ کو پہنچا دیا"۔

"اوکے.......... تھینک یو مس نور"۔ میں نے ریسیور رکھ دیا اور باتھ روم کی طرف چل پڑا۔

پندرہ منٹ بعد ہی میں ڈرائنگ روم کی طرف جا رہا تھا۔ میرا ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔ دل کسی نامعلوم خوف سے دھڑک رہا تھا' مس نور کی بات سننے کے بعد سے میں اب تک یہی سوچتا رہا تھا کہ آنے والا آخر کون ہے کہ مسٹر زید نے مجھے ذہنی طور پر تیار رہنے کو کہا ہے۔ کیا وہ کوئی ایسا آدمی ہے جسے میں جانتا ہوں اور یہ بات مسٹر زید کے علم میں بھی ہے؟ ایسی ہی بات میرے ذہن میں شور سا مچاتی رہی اور میں ڈرائنگ روم کے دروازے تک پہنچ گیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا اور یہ بات تعجب خیز تھی۔ اب سے پہلے میں نے کبھی اس دروازے کو بند نہیں پایا تھا۔ میں نے ہولے سے دستک دی۔ چند لمحوں بعد ہی دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والے مسٹر زید تھے مگر انہوں نے دروازے کو پوری طرح کھولے بغیر ہی مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا' میں آڑھا ہو کر اندر داخل ہو گیا۔ کمرے کی تمام لائٹس بجھی ہوئی تھیں صرف کونے میں رکھا لیمپ روشن تھا جس پر گہرے رنگ کے

شیڈ کی موجودگی کی وجہ سے روشنی بہت ہلکی تھی۔ میں نے وہاں صوفے پر ایک اور شخص کو بیٹھے دیکھا' روشنی اس کے جسم کے نچلے حصے پر پڑ رہی تھی مگر چہرہ تقریباً اندھیرے میں تھا اندھیرے میں بھی نہیں بلکہ چہرے پر پڑنے والی روشنی اتنی کم تھی کہ میں اس شخص کے نقوش نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اس دوران میں مسٹر زید نے ڈرائنگ روم کا دروازہ پھر لاک کر دیا تھا۔ وہ دروازہ بند کرنے کے بعد میرے برابر میں آ کھڑے ہوئے۔ "مسٹر اقبال' یہ ہیں وہ مہمان جن سے آپ کو ملوانا چاہتا تھا"۔

"گڈ ایوننگ سر!" میں اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر اس صوفے کی سمت بڑھا جہاں وہ شخص بیٹھا ہوا تھا۔

"گڈ ایوننگ مسٹر اقبال"۔ اس نے جواب دیا اور نرمی سے میرا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا انداز دوستانہ تھا۔

اس کی آواز سن کر مجھے یوں لگا تھا جیسے میری ہی آواز کی بازگشت در و دیوار سے ٹکرا کر دوبارہ گونجی ہو۔

"بیٹھیے مسٹر اقبال"۔ مسٹر زید نے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا اور میں اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"مسٹر زید.......... آپ نے ابھی تک مجھے اپنے مہمان سے متعارف نہیں کروایا"۔ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

"یہی میرے مہمان ہیں مسٹر اقبال"۔

"جی ہاں.......... آپ کے مہمان کا ہیولا میرے سامنے ہے اور میں ان کی آواز بھی سن چکا ہوں مگر.........."

"اوہ.......... آئی سی"۔ یہ کہہ کر مسٹر زید اٹھے اور انہوں نے سوئچ بورڈ کے پاس جا کر ایک بٹن دبا دیا کمرا ایک دم روشن سا ہو گیا اور میں سامنے بیٹھے شخص کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں جانتا تھا اسی لیے میں نے اتنا وقت لیا تھا۔ بہرحال یہ جمال ہے' میرا بھتیجا"۔

اور میں حیرت سے اس شخص کو دیکھ رہا تھا جو ہو بہو میرا اپنا عکس محسوس ہو رہا تھا۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

سوائے اس کے کہ اس کے بالوں اور مونچھوں کا رنگ بہت کالا نہیں بلکہ کچھ بھورا بھورا سا تھا' اس میں اور مجھ میں کوئی بھی فرق نہ تھا۔ وہ خود بھی مجھے دیکھ کر اتنا ہی حیرت زدہ تھا جتنا کہ میں۔

"یہ............ یہ............؟"

"ہاں جمال' یہ مسٹر اقبال ہیں' میرے دوست جنہیں پہلی بار دیکھ کر میری اپنی بھی ایسی ہی کیفیت ہوئی تھی جیسی اس وقت تم لوگوں کی ہو رہی ہے مگر مجھ میں قوتِ برداشت تم لوگوں سے زیادہ ہے اس لیے مسٹر اقبال میری اس حیرت کو محسوس نہ کر سکے۔ اب تمہاری سمجھ میں میرا تمام پلان آگیا ہو گا"۔

آخری جملے پر جمال چونک کر مسٹر زید کو دیکھنے لگا۔ پھر اس کی آنکھوں میں ستائش بھر گئی"۔ اوہ............ ونڈر فل............ ایکسی لینٹ"۔ وہ ران پر ہاتھ مار کر بولا۔

نہ معلوم کیوں میرا دل گھبرانے لگا۔ آنے والے خطرات کا مبہم سا احساس مجھے ہونے لگا تھا۔ مسٹر زید نے لفظ پلان کہا تھا اور اسی لفظ پر میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ جو کچھ میں سمجھ رہا تھا اگر وہی سب کچھ ہونے والا تھا تو یہ سب سے خطرناک بات تھی۔ میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی مگر میں خود کو کسی نہ کسی طور سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ دونوں میری طرف متوجہ تھے۔ جمال مجھے بالکل اس انداز میں دیکھ رہا تھا جیسے میں نے بکرا خریدنے والوں کو بکرے کو دیکھتے محسوس کیا تھا۔

"انکل آپ کے پلان میں کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب میں مسٹر اقبال سے پوری طرح واقف ہوں' ان کا اندازِ گفتگو' چال ڈھال ان کے حالات اور سب سے اہم ان کی اس گھر میں اہمیت سے واقفیت ہی معاملے کو آسان بنا سکتی ہے"۔

"ان تمام امور پر میں پہلے ہی سوچ چکا ہوں اور انہی معاملات کی نزاکت ہی کی بناء پر میں نے مسٹر اقبال سے کچھ روز اور ٹھہر جانے کی استدعا کی ہے' اب ان سے تمام کچھ سیکھنا تمہارا کام ہے۔ مجھے تو ایک اہم میٹنگ میں اسلام آباد جانا ہے جب میں واپس آؤں تو تمہیں مکمل ہونا چاہیے۔ میرا مطلب ہے کہ میں تمہیں مسٹر اقبال سمجھوں اور دھوکا کھا جاؤں' اتنا پرفیکٹ............"

"آپ فکر نہ کریں انکل' دو دن میرے لیے بہت ہیں۔" جمال نے مسرور لہجے میں

جواب دیا۔

میں جو اب تک ہونقوں کی طرح ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا اب وہ پلان سمجھ چکا تھا۔ خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ان کے اس پلان کا مقصد تھا کہ یا تو دنیا سے ہی میرا پتا صاف ہو جاتا یا پھر لمبی مدت کے لیے پھر اسی تہہ خانے میں قید ہو جاتا جہاں سے نکال کر مجھے اس عظیم الشان کوٹھی میں لایا گیا تھا۔

زید' جمال کو میری جگہ دے کر بیگ صاحب کی کوٹھی میں بحیثیت اقبال بھیجنا چاہتا تھا۔ وہ ایسا آسانی کے ساتھ کر سکتا تھا۔ کیونکہ جب جمال کو دیکھ کر میں خود دھوکا کھا گیا تھا تو بھلا فاریہ وغیرہ اسے کس طرح پہچان سکتے تھے' مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اگر مجھے اغوا کروانے کا مقصد یہی تھا تو پھر یوں آزاد کیوں چھوڑا گیا؟ یہ تو اتفاق تھا کہ اس پُراسرار گیلری میں جانے کا مجھے خیال آ گیا اور بہ قول زید کے ادریس میرے ہاتھوں زخمی ہو جانے کے بعد مر گیا۔ ورنہ تو میرا ٹکٹ لیا جا چکا تھا' میں واپس لاہور جانے والا تھا۔ مجھے فاریہ کو فون کرنے کی آزادی دی گئی تھی پھر اچانک مسٹر زید کا پروگرام بدل گیا' کیوں؟ بس یہی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"مسٹر اقبال............ اب آپ جمال سے باتیں کریں' مجھے تو جانا ہے' میں آج ہی رات کی فلائٹ سے جا رہا ہوں' انشاء اللہ بہت جلد آپ سے ملاقات ہو گی"۔

"مگر مسٹر زید............ میں آپ لوگوں کی گفتگو سے الجھ گیا ہوں۔ آپ کے ذہن میں کیا ہے؟"

"یہ آپ کو جمال بتا دے گا۔ مسٹر اقبال' ویسے آپ کو یہاں میری غیر موجودگی میں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔ آپ گھبرائیے نہیں............"

"مسٹر زید............ آپ مسلسل مجھ پر جبر کر رہے ہیں اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی ہے کہ گھبراؤں نہیں۔ جو کچھ میں سمجھا ہوں وہ کسی بھی طور مناسب نہیں ہے مسٹر زید............ آپ فاریہ کے سلسلے میں شاید غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ بے حد ذہین اور چالاک ہے۔ اسے دھوکا دینا آسان نہیں ہے۔ میں آپ سے وعدہ کر چکا ہوں کہ آپ کا کام کر دوں گا پھر یہ کھڑاگ پھیلانے کا فائدہ؟"

"مسٹر اقبال' میں پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں معاملات کو اپنے طور پر حل

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

کرنے کا عادی ہوں، کسی کا مشورہ اسی وقت قبول کرتا ہوں جب اس کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ دوسری بات یہ سچ ہے ہمارے درمیان معاملہ طے پا چکا ہے مگر یہاں غلطی آپ ہی سے ہوئی ہے اس میں میرا کوئی قصور نہیں، گویا یہ کلہاڑی اپنے پیروں پر خود آپ نے ہی ماری ہے"۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ جناب کہ پہلی بار فاریہ کو فون پر آپ ہی نے جمال کی کہانی سنائی تھی۔ اس سے پہلے میرے ذہن میں کچھ بھی نہ تھا، جمال والی بات سن کر ہی میرا ذہن اس نہج پر کام کرنے لگا اور پھر میں نے پروگرام بدل دیا۔ میں اپنے کسی معاملے میں کسی بھی شخص پر اعتماد کرنے کا عادی نہیں رہا، اس لیے میں نے یہ حل تلاش کیا ہے، اس معاملے میں جمال خود بھی ملوث ہے اس لیے یہ تمام تر احتیاط کر سکے گا۔ جبکہ آپ نادانستگی میں کوئی غلطی بھی کر سکتے ہیں۔ بہرحال پروگرام بدل جانے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم میں دوستانہ مراسم نہیں رہے یا خدانخواستہ یہاں آپ کو کوئی اذیت دی جائے گی۔ ایسا صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب آپ تعاون کرنے سے انکار کریں۔ جمال محض دو تین روز کے لیے وہاں جائے گا، یہ جیسے ہی خیریت سے واپس آئے گا آپ کو روانہ کر دیا جائے گا۔ اس سارے پلان میں آپ کی پریشانی والی کوئی بات نہیں"۔

وہ اس اطمینان سے باتیں کر رہا تھا جیسے کوئی ٹی وی پروڈیوسر آرٹسٹ کو ڈرامے کی سچویشن سے آگاہ کر رہا ہو اور اسے اس کا رول سمجھا رہا ہو، اسے قطعاً اس بات کا احساس نہیں تھا کہ ایئرکنڈیشنر چلنے کے باوجود میری کنپٹیوں سے پسینا بہہ کر رخساروں تک آ گیا ہے۔ میں سمجھ چکا تھا کہ مسٹر زید کی بکس والی کہانی سراسر جھوٹ پر مبنی ہے اور یہ کوئی ایسا کام ہے جو کسی کی تباہی کا سبب بھی بن سکتا ہے کس کی تباہی کا، یہ مجھے اب بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا مگر بہرحال جمال کا میرے روپ میں وہاں جانا کسی خطرے کا پیش خیمہ تھا۔

"اوکے مسٹر اقبال......... اب میں چلتا ہوں اگر اب بھی آپ کے ذہن میں کوئی الجھن ہو تو جمال موجود ہے"۔ پھر وہ جمال سے مخاطب ہوا۔ "جمال، میں بڑی تفصیل سے تمہیں ایک ایک بات بتا چکا ہوں، اقبال کی تمام کہانی ریکارڈ ہو چکی ہے۔ ٹیپ تمہیں زینی سے مل جائے گا۔ اسے سن لینا اور اچھی طرح ذہن نشین کر لینا، باقی جو کچھ پوچھنا ہو تو مسٹر

اقبال سے پوچھ سکتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تمہارے ساتھ مکمل تعاون کریں گے۔ ان کا ہر طرح خیال رکھنا اب تمہارا کام ہے، یہ میرے معزز مہمان ہیں"۔

"آپ فکر نہ کریں انکل، ہم اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے تعاون کریں گے"۔ اس نے مسکرا کر کہا مگر اس کی مسکراہٹ میں خباثت بھری ہوئی تھی اور آنکھوں میں میرے لیے دھمکی تھی۔

اب میں سمجھ چکا تھا کہ میرا کچھ کہنا سننا بیکار ہے۔ وہ جو بھی فیصلہ کر چکے ہیں اس پر قائم رہیں گے اور ان کا فیصلہ بدلنا میرے بس میں نہیں اس لیے میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ مسٹر زید نے کھانا ہمارے ساتھ ہی کھایا اور پھر ہم سے رخصت ہو کر چلے گئے۔ مجھے جمال کے قرب سے وحشت ہو رہی تھی۔ وہ مجھے بڑی گہری اور چبھنے والی نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ میں مسٹر زید کے رخصت ہوتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہوں......... خیریت.........؟" جمال نے چونکتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں مسٹر جمال میں......... سر میں درد محسوس کر رہا ہوں۔ سونا چاہتا ہوں، اگر آپ اجازت دیں تو........."

"اوہ شیور......... میں بھی آرام کروں گا، سفر کی تکان نے نڈھال سا کر دیا ہے اور ویسے بھی تھکا ہوا ذہن سوچنے سمجھنے اور خصوصاً سیکھنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے، ہمیں صبح فریش ہو کر ایک دوسرے سے ملنا چاہیے۔ اس دوران میں آپ بھی یقیناً خود کو تعاون پر آمادہ کریں گے، یہ سب اگر دوستانہ ماحول میں ہو تو آپ کے لیے بہتر رہے گا۔ ورنہ آپ کی اذیت مجھے اور انکل دونوں کو پریشان کر دے گی"۔ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور پھر اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے میری جانب بڑھا کر بولا۔ "اوکے سی یو"۔

میں نے خاموشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے شائستہ جملوں میں چھپی دھمکی کو میں جان چکا تھا۔ اس کی بات کا جواب دیے بغیر میں تیزی سے ڈرائنگ روم سے باہر آ گیا۔ میں سیدھا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میں کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ میں کسی نہ کسی طریقے سے فاریہ کو اطلاع کرنا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے مگر مجھے یقین نہیں تھا کہ میں اس سے رابطہ قائم کر سکوں گا میرا خیال تھا کہ اب فون میرے کمرے میں نہیں ہو گا۔ ایک ہی ذریعہ تھا میرے پاس جس سے کام لے کر میں فاریہ کو خبردار کر سکتا

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

تھا۔ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سائیڈ ٹیبل پر نگاہ ڈالی۔ ٹیلی فون اب بھی موجود تھا۔ اسے وہاں دیکھ کر میری جان میں جان آ گئی۔ آدھی پریشانی دور ہو گئی۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آدھی رات کو فاریہ کو فون کر کے تمام حالات سے آگاہ کر دوں گا۔ اس اطمینان کے بعد میں کپڑے بدل کر بستر میں لیٹ گیا۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ اب میں صرف یہ سوچنا چاہتا تھا کہ میں جمال کو کس طرح دھوکا دوں اسے مس گائیڈ کروں۔ مگر مجھ سے ایک فاش غلطی سرزد ہو چکی تھی۔ میں نے مسٹر زید کی کہانی پر یقین کرنے کے بعد اسے اپنی تمام رام کہانی بھی سنا دی تھی جسے غالباً وہ ٹیپ کر چکا تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ مسٹر زید کی سنائی ہوئی داستان سراسر جھوٹ پر مبنی ہو گی اس کے حقیقت ہونے کا کوئی ثبوت نہ تھا' ہاں یہ سب کچھ اس وقت حقیقت ہوتا جب وہ واقعی اپنے کہنے کے مطابق مجھے جانے دیتا اور یہ بھی سچ ہے کہ میں اس کا کام بھی بڑی دیانت داری سے کر دیتا مگر اب......... اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ کہانی مجھے محض اس لیے سنائی گئی تھی تاکہ میں اس سے متاثر ہو کر اپنی رام کہانی اسے سنا دوں' وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو چکا تھا۔ گویا اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اب تو صرف ایک ہی صورت رہ گئی تھی کہ میں کسی طور پر فاریہ کو اطلاع کر سکوں۔ جمال کو مس گائیڈ کروں یا یہاں سے فرار ہو کر لاہور پہنچ جاؤں۔ جمال کو مس گائیڈ کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ میں اپنی چال ڈھال بدل لوں۔ اپنی عادات کو تبدیل کر کے پیش کروں یا کسی ایسی عادت کو اپنا لوں جو مجھ میں قطعاً نہیں تھی اور جس کی بناء پر فاریہ کو جمال پر شک ہو جائے۔

تمام رات میرا ذہن الجھا رہا۔ میں ایسی ہی باتیں سوچتا رہا اور جانے کب مجھے نیند آ گئی۔ اگلے روز صبح سویرے ہی میری آنکھ کھل گئی تھی مگر میں یونہی بستر پر پڑا رہا۔ تقریباً گیارہ بجے کے قریب کسی نے ہولے سے دروازے پر دستک دی۔ میں نے کمبل چھوڑ دیا۔ نہ معلوم رات کے کس پہر میں نے سردی محسوس کر کے کمبل اوڑھ لیا تھا۔ شاید اے سی کی ٹھنڈک برداشت نہیں ہوئی تھی۔ میں اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا میرے سر میں شدید درد تھا اور مجھے حرارت محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ دروازے پر نور ہو گی' اور یہ ٹھیک بھی تھا۔ دروازہ کھولا تو سامنے ہی نور چائے کی ٹرالی لیے کھڑی تھی۔ ٹرالی پر ناشتے کی چیزوں کے علاوہ اخبار بھی رکھا تھا۔ یہ میرے لیے اچنبھے کی بات

تھی۔ آج سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ ناشتے کے ساتھ اخبار بھی لایا گیا ہو۔ اول تو اتنے دنوں میں مَیں نے اخبار پڑھنے کی خواہش کا اظہار ہی نہ کیا تھا اور دوسری بات یہ کہ اخبار کوریڈور میں رکھی اس ٹیبل پر ہوتا تھا جس پر ٹیلی فون رکھا تھا۔ میں نے مسٹر زید کو بھی اخبار وہیں سے اٹھا کر پڑھتے دیکھا تھا اور مس زینی کو بھی۔

"آیئے مس نور!" اتنا کہہ کر میں نے یونہی مس نور کے چہرے پر نگاہ ڈالی' تو چونک اٹھا۔ اس کا رنگ سفید ہو رہا تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ کانپ رہا تھا اور آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

میں نے حیرت سے اسے دیکھا اور وجہ معلوم کرنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس نے اشارے سے مجھے خاموش رہنے کو کہا اور ٹرالی پر سے اخبار اٹھا کر میری طرف بڑھا دیا۔ اس کے اشارے کرنے پر میں سمجھ گیا کہ یہاں ہونے والی گفتگو کہیں اور بھی سنی جا رہی ہے۔ بہرحال میں مس نور کے انداز پر خوش بھی ہو گیا کہ وہ میرے ساتھ ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ سے اخبار لے کر اشارے سے پوچھا کہ اس میں کیا ہے۔ اس نے پہلا صفحہ پلٹ کر اندر دیکھنے کو کہا۔ جوں ہی میں نے وہ صفحہ پلٹا' خوف سے سن ہو گیا۔

اندرونی صفحے پر جگو کی تصویر تھی اور نیچے لکھا تھا کہ "نامعلوم لاش برآمد" میں نے تیزی سے ساری خبر پڑھ ڈالی۔ لکھا تھا کہ سپر ہائی وے کے قریب جھاڑیوں سے ایک پینتالیس برس کے شخص کی لاش برآمد ہوئی ہے جسے انتہائی بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ لاش ایک دھوبی نے دیکھی اور متعلقہ تھانے میں اطلاع کی۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھیج دی گئی ہے۔ لاش کے ساتھ ایسی کوئی چیز یا کاغذ برآمد نہ ہو سکا جس سے مرنے والے کے بارے میں تفصیل معلوم ہو سکتی ہو۔

حالانکہ جگو کی موت سے میرا کوئی واسطہ نہ تھا مگر پھر بھی میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ اس خبر سے کم از کم مجھے ان لوگوں کی سفاکی کا علم تو ہو ہی گیا تھا اور اس خیال نے بھی مجھے بوکھلا دیا تھا کہ زید اگر جگو کی بے پروائی کی یہ کڑی سزا دے سکتا ہے تو اگر اسے یہ پتا چل گیا کہ ادریس میرے ہاتھوں مارا گیا ہے تو کیا ہو گا......... اب میرا یہاں سے جلد از جلد نکل جانا ہی میری زندگی کی ضمانت تھا۔

نور اب تک میرے سامنے کھڑی مجھے خوف زدہ نگاہوں سے تک رہی تھی۔ اب

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

یہی میرا آخری سہارا تھا فاریہ کو فون کرنے کا پروگرام تو رات کی گہری نیند نے خراب کر دیا تھا۔ اب اسے فون کرنے کے لیے مجھے پھر ایک طویل دن گزرنے کا انتظار کرنا تھا یا پھر اگر نور میری مدد کرتی تو میں کچھ کر سکتا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔ میں کمرے میں کاغذ اور پین ڈھونڈ رہا تھا۔ جو مجھے نہیں مل سکا۔ میں نے نور کو اشارے سے کہا کہ مجھے کاغذ اور پین چاہیے وہ سرہلا کر کمرے سے واپس چلی گئی۔

مجھے بھوک تو بالکل بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی مگر نے زبردستی ناشتا کر لیا تاکہ میری کسی حرکت سے جمال وغیرہ کو کسی قسم کا شک نہ ہو سکے۔ تقریباً بیس منٹ بعد نور جب ناشتے کے برتن واپس لینے آئی تو وہ کاغذ اور پین چھپا کر لے آئی۔ یہ چھوٹے کاغذوں کا ایک دستہ تھا جو میرے بہت کام آ سکتا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے دونوں چیزیں لیتے ہی اس پر لکھا کہ وہ میری مدد کرے ورنہ میرا انجام بھی جگو سے مختلف نہ ہو گا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں فرار ہونا چاہتا ہوں۔ آج ہی رات' اگر وہ میری مدد کر سکے تو اس کا یہ احسان میں زندگی بھر نہ بھولوں گا۔

یہ پڑھ کر نور نے نفی میں سرہلایا اور کاغذ پر مجھے لکھ دیا کہ مسٹر زید نے جانے سے قبل میری سخت نگرانی کا حکم دیا ہے۔ عمارت کے باہر بھی اور اندر بھی مجھ پر گہری نگاہ رکھی جا رہی ہے بلکہ اسے تو یہ بھی شک ہے کہ اس کمرے میں کوئی ایسی چیز بھی چھپی ہوئی ہے جس سے یہاں ہونے والی ہر آواز سنی جا سکتی ہے' کیوں کہ اس نے ایک آدمی کو میرے برابر والے کمرے میں ہیڈ فون کانوں پر لگائے دیکھا ہے اور اس نے یہ بھی بتایا کہ یہاں کی ہر آواز ٹیپ کی جا رہی ہے۔

یہ اطلاعات میرا دم نکالنے کے لیے کافی تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں فاریہ کو فون بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا اور نور ناشتے کے برتنوں کو ایک دوسرے سے ٹکراتی رہی تاکہ سننے والا یہ سمجھے کہ وہ وہاں خواہ مخواہ نہیں ٹھہری ہوئی بلکہ برتن سمیٹ رہی ہے۔ تبھی مجھے ایک ترکیب سوجھی اور میں نے کاغذ پر اسے فاریہ کا فون نمبر لکھ کر دیا اور صرف ایک جملہ لکھا کہ وہ اس فون پر فاریہ کو یا کسی کو بھی سنا دے وہ جملہ یہ تھا۔ "اقبال کسی کی قید میں ہے اور ایک دوسرا شخص اقبال کے روپ میں وہاں پہنچے گا' محتاط رہا جائے اور اسے گھر میں داخل نہ ہونے دیا جائے"۔

اس نے چپ چاپ وہ کاغذ اپنے گریبان میں چھپا لیا اور برتن ٹرالی پر رکھ کر واپس چلی گئی۔ میں نے اس کے جاتے ہی وہ تمام کاغذ جن پر بات چیت کی تھی اٹھائے اور باتھ روم میں چلا آیا۔ آتے ہوئے میں لائٹر بھی اٹھا لایا۔ ان کاغذوں کو واش بیسن میں رکھ کر میں نے لائٹر سے آگ دکھائی اور ان کے راکھ بن کر پانی میں بہہ جانے تک وہیں کھڑا رہا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے کاغذ کا وہ دستہ اور پین کارپٹ کا کونا الٹ کر اس کے نیچے چھپا دیا اور سگریٹ سلگا کر آنے والے حالات سے نبٹنے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ ابھی میرے پاس بہرحال دو تین روز تھے۔ جمال کو میری عادات و سکنات سیکھنے کے لیے اتنے دن تو لگ ہی جاتے۔ میں بہت دیر تک سوچتا رہا پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں جمال کو مس گائیڈ کروں گا تاکہ اگر میں یہاں سے نہ نکل سکوں یا نور فاریہ تک میرا پیغام نہ پہنچا سکے تب بھی میرا مقصد پورا ہو جائے............ اور فاریہ کو جمال پر شک ہو جائے۔ یہ سب میں اپنی تسلی کو کر رہا تھا ورنہ سچی بات تو یہ تھی کہ مجھے یقین نہیں کہ فاریہ اس معاملے کو ڈیل کر سکے گی اور جمال پر اسے کسی قسم کا شک ہو سکے گا۔ ہاں نور اگر فاریہ کو میرا پیام دینے میں کامیاب ہو گئی تو اس بات کی امید سو فیصد تھی کہ فاریہ بھی سمجھ جائے کہ وہ میں نہیں بلکہ جمال ہے۔

مجھے یاد تھا کہ خود اس نے بھی ایک بار مجھے بتایا تھا کہ میں جمال سے بہت ملتا ہوں اور یہ بات اس نے بیگ صاحب سے بھی کہی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ میری جمال سے مشابہت ان کے کام آ سکتی ہے۔ "خدا کرے فاریہ اس خوفناک کھیل کو سمجھ جائے"۔ میں نے دل سے دعا کی۔

اس وقت انٹرکام بول اٹھا میں نے ریسیور اٹھایا اور دوسری طرف جمال کی آواز سنتے ہی خود کو قطعی نارمل کر لیا۔ "گڈ مارننگ مسٹر جمال' کیسے ہیں آپ؟"

"مارننگ نہیں مسٹر اقبال' آفٹر نون کہیئے"۔

"سوری........... دراصل مجھے رات حرارت سی ہو گئی تھی اور نیند بھی بہت دیر سے آئی تھی اس لیے دیر سے آنکھ کھلی"۔

"کوئی بات نہیں........... آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"کچھ بہتر ہے مگر شاید بخار اب بھی ہے۔" میں نے جواب دیا اور یہ بات صحیح بھی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

تھی اور میں اپنی آنکھوں میں شدید جلن محسوس کر رہا تھا۔

"اوہ آپ فکر نہ کریں میں ابھی دوا لے کر حاضر ہوتا ہوں۔" اتنا کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر لیا۔

وہ میرے پاس آنے والا تھا اور میں جانتا تھا کہ وہ یہاں کیوں آنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے بخار میں وہ مجھے بلواتا بھی تو یہ نامناسب بات ہوتی۔ میں نے شکر ادا کیا کہ مسٹر زید اور مسٹر جمال میں کم از کم شائستگی تو تھی ورنہ وہ ایسی پوزیشن میں تھے کہ مجھ سے جبراً اپنا مطلب نکلوا سکتے تھے۔ بہرحال میں اس موضوع پر رات میں اور صبح سے اب تک سوچتا رہا تھا اور میں نے طے کر لیا تھا کہ مجھے کیا کہنا اور کیا کرنا ہے۔

میری توقع کے مطابق جمال تقریباً پندرہ منٹ بعد ہی میرے کمرے میں چلا آیا۔ اس کا موڈ خوشگوار تھا یا شاید اس نے اپنا مطلب نکالنے کے لیے خود کو بے حد خوش، مطمئن اور خوشگوار موڈ میں ظاہر کیا تھا۔

"سوری مسٹر اقبال میں کچھ لیٹ ہو گیا۔ یہ ٹیبلیٹس ہیں انہیں کھا لیں اور کمبل کو اچھی طرح لپیٹ کر بیٹھیں۔ کچھ ہی دیر میں ٹھیک ہو جائیں گے"۔ اس نے پیناڈول کی گولیاں دیتے ہوئے کہا۔ میں نے دونوں گولیاں پانی کے ساتھ نگل لیں۔ کمبل کو میرے گرد لپیٹنے میں اس نے میری مدد کی اور پھر سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"مسٹر اقبال، آئی ایم سوری کہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے ورنہ میں آج آپ کو آرام کرنے دیتا۔ خیر آپ اسی طرح لیٹے رہیے اس طرح آپ کو آرام مل جائے گا اور آپ میرے کام بھی آتے رہیں گے"۔ اتنا کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوا اس نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھا، جیسے میرے چہرے پر اپنی بات کا ردعمل دیکھنا چاہتا ہو۔ میں سپاٹ چہرے سے اسے تکتا رہا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ نے اب تک کافی سوچ لیا ہو گا۔ کسی نتیجے پر بھی پہنچ گئے ہوں گے، کچھ مجھے بتانا پسند کریں گے؟"

"مسٹر جمال.......... میں نے کافی کچھ سوچا ہے۔ میں ایک ہی شرط پر آپ سے تعاون کرنے کو تیار ہوں کہ.........." میں قصداً جھجک کر خاموش ہو گیا۔

"ہاں ہاں بولئے.......... اگر آپ کی شرط قابلِ قبول ہوئی تو یقین کیجیے میں اس شرط کو پورا کروں گا"۔ اس نے جلدی سے جواب دیا اور میں یہی دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اس

معاملے میں کس حد تک ایکسائیٹڈ ہے۔

وہ یہ مسٹر جمال.......... کہ میں نے بیگ صاحب کے گھر کا نمک کھایا ہے اور میں نمک کا حق ادا کرنا چاہتا ہوں۔ میری وجہ سے انہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچنا چاہیے اگر مجھے یہ پتا چلے کہ میری کسی حرکت سے انہیں کوئی تکلیف پہنچنے والی ہے تو.......... تو میں مرجانے کو ترجیح دوں گا مگر.........."

"ارے نہیں مسٹر اقبال.......... آپ یقین کیجیے کہ انہیں کسی بھی قسم کی کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی"۔

"اگر آپ فاریہ، زاریہ، بیگ صاحب اور سوہنی وغیرہ کو کوئی تکلیف نہ دینے کا وعدہ کریں تو میں آپ سے تعاون کرنے کو تیار ہوں۔" میں نے ہارے ہوئے جواری کی طرح کہا تاکہ وہ یہی سمجھے کہ میں نے حالات سے تنگ آ کر شکست تسلیم کر لی ہے اور میں واقعی اس سے تعاون کرنے پر آمادہ ہوں۔

"بس اتنی سی بات تھی۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا"۔ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"مسٹر اقبال میں وعدہ کرتا ہوں کہ انہیں کوئی بھی تکلیف نہیں ہو گی بلکہ میں انہیں گمان بھی نہیں ہونے دوں گا کہ میں اقبال نہیں بشرط کہ آپ مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دیں۔ دیکھیں نا اگر فاریہ کو یہ شک ہو جائے کہ میں اقبال نہیں ہو تو وہ کتنی اذیت محسوس کرے گی اور پھر یہ شک ہو جانے کے بعد مجھے بھی اپنا رویہ بدلنا پڑے گا، شاید سختی کرنا پڑے اور ایسا نہ آپ چاہتے ہیں اور نہ میں"۔

"میں تو سوچ بھی نہیں سکتا مسٹر جمال۔ آپ اپنے وعدے پر قائم رہیے گا"۔

"آپ فکر نہ کریں بس میرے سوالوں کا جواب دیتے رہیں"۔

"میں آپ پر اعتبار کر رہا ہوں۔ پوچھئے کیا پوچھنا چاہتے ہیں.......... مگر پلیز ایک زحمت دوں گا۔ میرا سگریٹ ختم ہو گیا ہے اگر وہ منگوا سکیں تو.........."

"اوہ کیوں نہیں.......... کون سا برانڈ پیتے ہیں آپ؟"

"پیتا تو گولڈ لیف ہوں مگر اس وقت جو بھی مل جائے"۔ میں نے کمال خوب صورتی سے جھوٹ بولا۔ میں سرے سے سگریٹ پینے کا عادی ہی نہیں تھا۔ بس کبھی کبھی پی لیا کرتا تھا اور یہ بات فاریہ جانتی تھی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"میں ابھی منگواتا ہوں"۔ یہ کہہ کر جمال نے انٹرکام پر میرے برانڈ کا سگریٹ لانے کی ہدایت کی اور پھر میری جانب متوجہ ہو گیا "سگریٹ آپ کب سے پیتے ہیں؟"

"شہر آکر ہی شروع کی تھی۔ تقریباً سات آٹھ مہینے ہو گئے ہیں"۔

"ہمیشہ گولڈ لیف ہی پیتے ہیں؟"

"جی!"

"فاریہ اور بیگ صاحب کے سامنے بھی پیتے ہیں؟"

"جی ہاں' شروع میں تو چھپ کر پیتا تھا مگر زاریہ کے اسپتال جانے کے بعد اور آپریشن کے روز میں نے تمام تکلف بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اس روز کے بعد مجھے بیگ صاحب نے بھی سگریٹ پینے کی اجازت دے دی' ورنہ میں تو لحاظ کرتا تھا"۔

آپ فاریہ کو کیا کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور بیگ کو............؟"

"جمال صاحب' حالانکہ میں پہلے والا بالا نہیں رہا مگر مالک کو مالک ہی سمجھتا ہوں اسی لیے بیگ صاحب کو "صاحب اور فاریہ کو بی بی کہتا ہوں البتہ فیکٹری میں کبھی کبھی میڈم بھی کہتا تھا کیوں کہ وہاں سب انہیں میڈم کہتے ہیں"۔

اس کے علاوہ بھی جمال نے بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں معلوم کیں اور میں ہر بات میں جدت یا تبدیلی پیدا کرتا رہا۔ یہی ایک صورت تھی کہ فاریہ پے درپے انہونی باتیں ہو جانے پر اس کی جانب سے مشکوک ہو سکتی تھی۔

"یعقوب کون ہے جس کے بارے میں آپ کو اطلاع ملی تھی کہ وہ واپس آگیا ہے اور فاریہ اسے جا کر لے آئی ہے وہ کون ہے' کہاں گیا ہوا تھا اور اس کی حیثیت کیا ہے؟"

مجھے حیرت ہوئی کہ وہ یعقوب کے بارے میں کیسے جانتا ہے جب کہ میں نے زید کو سنائی جانے والی کہانی میں بھی ایسی باتیں گول کر دی تھیں جس سے فاریہ کا کردار مشکوک ہوتا اور یعقوب کا ذکر تو سرے سے آیا ہی نہیں تھا۔ پھر اچانک مجھے یاد آیا کہ میرا ٹیلی فون بھی ٹیپ کیا جا رہا ہو گا۔ شاید اسی وجہ سے نور نے بات کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور اس کی یہ بات بھی سچی نکلی تھی کہ میرے کمرے کی ہر آواز اور میرا فون کہیں اور سنا جا رہا ہے۔

"وہ فاریہ کا ملازم تھا اور کسی وجہ سے ناراض ہو کر اپنی بیٹی کے پاس چلا گیا تھا' وہ

بیں بائیس برس سے وہاں ملازم تھا بیگ صاحب کی کسی بات سے روٹھ کر چلا گیا تھا۔ وفادار نوکر تھا اس لیے فاریہ اسے منا کر واپس لے آئی ہے"۔

"یہ سلطان کون ہے؟"

"یہ بھی فاریہ کا ملازم ہے"۔ میں نے نڈھال لہجے میں جواب دیا۔ میرا ذہن اس صورتِ حال سے تھک چکا تھا اور میرا بخار بھی تیز ہوتا جا رہا تھا۔ "مسٹر جمال میں بہت تھک گیا ہوں۔ کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھیے میرا بخار کم ہونے کی بجائے بڑھ گیا ہے۔" میں نے اپنی پیشانی اس کے قریب کرتے ہوئے کہا۔ اس نے ہاتھ سے میری پیشانی چھوئی۔

"اوہ............ سوری مسٹر اقبال' واقعی آپ کی حالت بہت خراب ہے۔ آپ آرام کریں میں ڈاکٹر کو بلواتا ہوں"۔ اتنا کہہ کر وہ تیزی سے کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔ بخار اتنا تیز ہو گیا تھا کہ میری آنکھوں سے گرم گرم پانی بہنے لگا اور مجھ پر غشی سی طاری ہو گئی۔

مجھے ہوش آیا تو میرے بیڈ کے قریب پڑی کرسی پر نور بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے دونوں ٹانگوں کو سکیڑ کر کرسی پر رکھ لیا تھا اور ایک چادر گھٹنوں پر ڈالی ہوئی تھی۔ میرا بخار کچھ کم ہو گیا تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا' کوئی اور موجود نہیں تھا۔ میرے سرہانے کچھ دواؤں کی شیشیاں رکھی تھیں اور چند گولیاں پڑی تھیں۔

"مس نور............ مس نور............" میں نے دھیرے سے اسے پکارا مگر وہ نہ اٹھی تو میں نے ہولے سے اس کا گھٹنا ہلایا۔

"کک............ کون............؟" وہ چونک کر جاگ اٹھی۔

"مس نور آپ جا کر آرام کریں"۔

"نہیں............ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے جمال صاحب نے آپ کا خیال رکھنے کو کہا ہے اور ایک گھنٹے کے بعد آپ کو دوا بھی دینا ہے"۔

"کیا............ کیا ٹائم ہوا ہے مس نور؟"

"رات کے تین بجے ہیں مسٹر اقبال' آپ کی طبیعت بہت خراب تھی۔ ڈاکٹر نے آپ کا معائنہ کر کے یہ دوائیں تجویز کی تھیں۔ دوائیں وقت پر لینا بہت ضروری ہے ورنہ

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

طبیعت مزید بگڑ جائے گی"۔

"رات کے تین........... یعنی تمام دن گزر گیا اور مجھے پتا بھی نہ چلا"۔ میں حیران ہو گیا۔

"آپ پر غشی طاری تھی مسٹر اقبال"۔

"آپ آرام کریں' دوا کے بارے میں مجھے بتا دیں' میں لے لوں گا"۔

"سوری مسٹر اقبال' میں جمال صاحب کا حکم نہیں ٹال سکتی۔ آپ سو جائیں میں ایک گھنٹے بعد خود ہی دوا دے دوں گی"۔

"اچھا........... جیسی آپ کی مرضی"۔ میں نے ذرا زور سے کہا اور مس نور کو کارپٹ کے نیچے سے کاغذ اور پین نکال کر لانے کو کہا۔ اس نے پہلے دروازے کی طرف دیکھا پھر خود پر لپیٹی ہوئی چادر کے اندر ہاتھ ڈال کر ہاتھ دوبارہ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا' اس کی مٹھی میں ایک کاغذ کا پرزہ دبا ہوا تھا۔ میں نے کاغذ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور بہت آہستگی سے کھولا تاکہ کاغذ کی آواز پیدا نہ ہو سکے۔

وہ نور کی تحریر تھی لکھا تھا کہ وہ فاریہ کو فون نہیں کر سکی اور اسے امید نہیں کہ وہ میرا پیغام اسے پہنچا سکے گی۔ اس نے لکھا تھا کہ دن میں اس نے کوٹھی سے باہر جانے کی کوشش کی تھی مگر اسے گیٹ سے باہر نہ جانے دیا گیا بلکہ بتایا گیا کہ مسٹر زید کی سخت ہدایت ہے کہ کوئی شخص کوٹھی سے باہر نہ جائے خواہ وہ کوئی بھی ہو' صرف جمال صاحب ہی باہر جا سکتے تھے۔

میں نے کاغذ کا وہ پرزہ مٹھی میں دبا لیا۔ اس تحریر نے مجھ میں مایوسی بڑھا دی تھی۔ گویا نور بھی میرے کسی کام نہیں آ سکتی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے سر کو تکیے سے ٹکا دیا۔ عین اسی لمحے ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوندا اور میں اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ میرے اس انداز پر نور بھی حیران ہو گئی۔ میں نے اسے کاغذ اور پین لانے کا اشارہ کیا۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر کاغذ اور پین اٹھا لائی میں نے جلدی جلدی اس پر لکھا کہ وہ کسی بھی طرح مجھے ہائٹروجن اور ایمونیا لا دے۔ یہ کام وہ آسانی کے ساتھ کر سکتی تھی کیوں کہ میری طبیعت خراب تھی اور ڈاکٹر مجھے ویسے بھی دیکھ کر گیا تھا اگر وہ چاہتی تو یہ دونوں چیزیں اس سے کسی طرح حاصل کر سکتی تھی۔

میری تحریر پڑھتے ہی نور کی آنکھوں میں بھی چمک سی لہرائی۔ شاید وہ جان گئی تھی کہ میرے ذہن میں کیا ہے۔ اس نے سر ہلا کر میری ہدایت پر عمل کرنے کا وعدہ کیا اور کاغذ پین لے کر لکھا کہ وہ بھی میرے ساتھ یہاں سے نکلنا چاہتی ہے۔ اس نے لکھا کہ محمد بخش کے مرنے کے بعد جب اس کا کوٹھی میں رہنے کا اتفاق ہوا تو اس نے یہاں عجیب عجیب باتیں ہوتی دیکھیں ورنہ اس سے پہلے وہ ان تمام باتوں سے ناواقف تھی اور ویسے بھی ان لوگوں سے اس کا کوئی ناتا نہیں اس لیے وہ یہاں نہیں رہنا چاہتی۔

میں نے اسے ساتھ لے جانے کا وعدہ کیا اور دونوں کاغذوں کو جلانے کو کہا۔ اس نے فوراً ہی ایش ٹرے میں کاغذ ڈال کر جلا دیئے اور ایش ٹرے کو دھو کر لے آئی۔ پھر اس نے کاغذ اور پین اسی جگہ پر رکھ دیئے جہاں سے اٹھا کر لائی تھی........... میں اب کافی مطمئن ہو گیا تھا۔ جو ترکیب میرے ذہن میں آئی تھی اس کے سوا یہاں سے نکلنے کا کوئی چارہ نہ تھا۔ شاید آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ میرے ذہن میں کیا تھا۔ میں اپنے بالوں اور مونچھوں کو بھورا کرنا چاہتا تھا۔ یہاں سے فرار ہونے کے لیے ضروری تھا کہ خود کو جمال کے روپ میں ڈھال لوں یعنی ان لوگوں کی چال کو انہی پر لوٹا دوں۔

ایسا میں اگلی رات کو ہی کر سکتا تھا اگر اس دوران میں نور نائٹروجن اور ایمونیا لا دیتی تو۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس میں کامیاب ہو جائے گی۔ میں آنکھیں بند کر کے لیٹا رہا اور سوچتا رہا کہ اپنی ترکیب کامیاب ہو جانے پر یہاں سے کس طرح نکلوں گا۔

چار بجے نور نے مجھے پکارا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ "سر آپ دوا لے لیں۔ وقت ہو گیا ہے"۔

پھر اس نے مجھے گولی اور سیرپ دیا۔ سرہانے رکھے ہوئے تھرمس میں سے گرم گرم سوپ نکال کر دیا اور تبھی مجھے احساس ہوا کہ یہ میرے لیے بہت ضروری تھا۔ مجھے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ دوا لینے اور سوپ پینے کے بعد میری حالت کچھ اور سنبھل گئی۔ تو میں نے نور کو چلے جانے پر مجبور کیا کہ وہ اپنے بستر پر جا کر سو جائے۔ اب میں خود کو پہلے سے بہتر محسوس کر رہا تھا اور اب دوا بھی صبح ہی لینا تھی۔

میرے اصرار پر وہ چلی گئی مگر گھڑی میں الارم لگا کر میرے سرہانے رکھ گئی۔ الارم دس بجے کا لگایا تھا اور مجھے تاکید کر دی تھی کہ میں دوائیں لے لو۔ اس کے جانے کے بعد

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

میں پھر حالات کے الجھ جانے کے بارے میں سوچتا رہا۔ اب میں اپنی تمام تر صلاحیتیں یہاں سے فرار ہونے میں صرف کرنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ حالات کوئی خطرناک شکل اختیار کر لیں۔ مجھے یہاں سے نکل کر فاریہ وغیرہ تک پہنچنا تھا۔ نہ معلوم ان لوگوں کا مقصد کیا تھا' وہ کون سا بکس تھا' کہاں تھا اور اس میں کیا تھا مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔ میں کافی دیر تک جاگتا رہا مگر پھر مجھ پر نیند غالب آ گئی۔ دس بجے الارم کی آواز نے مجھے جگا دیا۔ میں نے ہمت کر کے بستر چھوڑ دیا' باتھ روم میں جا کر گرم پانی سے نہایا اور کپڑے بدل کر واپس کمرے میں چلا آیا۔ کمرے میں نور موجود تھی۔ وہ میرے لئے چائے بنا رہی تھی۔

"سر آپ نے دوا لے لی تھی؟"

نہیں اب لوں گا۔" یہ کہہ کر میں بیڈ کے سرہانے تکیہ ٹکا کر بیٹھ گیا۔ نور نے مجھے چائے اور پانی بھی دیا تاکہ میں گولیاں کھا سکوں' میں نے دوا کھائی اور چائے پینے لگا۔ نور میرے لیے سلائس پر مکھن لگا رہی تھی۔ میں گہری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ نہ معلوم کیوں اسے دیکھ کر مجھے احساس ہو رہا تھا جیسے میں اسے پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں۔ یہ احساس مجھے اس سے پہلے بھی ہوا تھا مگر اس وقت میں اس بارے میں کچھ سوچنے کی پوزیشن میں نہیں تھا یا یوں کہہ لیجئے کہ یہ احساس اب سے پہلے اتنا شدید نہ تھا۔ اس نے شاید میری نگاہوں کے لمس محسوس کر لیا تھا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"نور تمہیں یاد نہیں کہ تم کس گاؤں کی ہو.......... کون ہو' تمہارے ماں باپ کون تھے یا کیسے تھے؟"

میری بات سنتے ہی ایک دم اس پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ ہاتھ کانپ گیا اور آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ "یہ یاد ہوتا سر تو.......... یہاں کیوں ہوتی' مگر آپ کو یہ سب کس نے بتایا؟"

"مجھے تمہارے بارے میں مسٹر زید سب کچھ بتا چکے ہیں۔ وہ بہت اچھے آدمی ہیں مس نورا!"

آخری جملے پر اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ سمجھ گئی کہ میں کیا چاہتا ہوں۔

"جی سر.......... آپ ٹھیک کہتے ہیں اگر یہ نہ ہوتے تو جانے میرا کیا حشر ہوتا؟"

"میں نے ایسے آدمی دنیا میں کم ہی دیکھے ہیں' اس لیے ان پر اعتماد کرنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ نرم دل اور ہمدرد آدمی ہیں۔ مجھے مسٹر زید اور مسٹر جمال دونوں نے متاثر کیا ہے"۔

"جی سر دونوں ہی بے حد اچھے انسان ہیں"۔

"ویسے نور تم اگر یاد کرنے کی کوشش کرو تو ہو سکتا ہے کہ کچھ یاد آ ہی جائے"۔

میں نے موضوع بدل دیا۔ میرا مقصد صرف ان باتوں سے یہ تھا کہ سننے والے یہ سمجھیں کہ ہمیں ان دونوں پر بے حد اعتماد ہے اور ہم ایسی کوئی حرکت نہیں کریں گے جو ان کی توقع کے خلاف ہو۔ دوسری طرف میں نور سے اس بارے میں کچھ معلومات بھی چاہتا تھا۔ ظاہر ہے میں نور کو ساتھ لے جانے کا وعدہ کر چکا تھا اور میرے پاس سوائے فاریہ کی کوٹھی کے دوسرا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ جہاں میں اسے لے جا کر رکھتا اور فاریہ کی کوٹھی میں پہلے ہی میں سوہنی' ماسی اور سلطان کو لے جا چکا تھا۔ وہ کوئی یتیم خانہ تو تھا نہیں کہ میں دنیا بھر کے لاوارث لوگوں کو لے جاتا رہوں۔ میں چاہتا تھا کہ اگر نور کو کچھ یاد آ جائے تو اسے اس کے اپنوں تک پہنچا دوں۔

"مجھے کچھ بھی یاد نہیں آتا سر' بس کبھی کبھی ایک خواب سا دیکھتی ہوں جیسے میں کسی گھنے درخت کی چھاؤں میں بنے ہوئے چبوترے پر بیٹھی ہوں اور میرے چاروں طرف بیر بہوٹیاں سی رینگ رہی ہیں پھر میری آنکھ کھل جاتی ہے یا میں چونک جاتی ہوں"۔

"خیر یہ تو کوئی نشانی نہ ہوئی تم کوشش کرو کہ کوئی چہرہ.......... کوئی بات.......... ایسی بات جس سے تمہارے ماضی کو تلاش کیا جا سکے' یا کوئی گھر' خاص قسم کا یا کوئی ایسی عمارت جس کی کوئی خاص بات تمہیں یاد ہو"۔

اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے دونوں کنپٹیوں کو دبایا اور نفی میں سر ہلانے لگی۔ "کچھ بھی یاد نہیں سر.......... جب کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتی ہوں وہی گھنے درخت کے نیچے بنا چبوترا اور بیر بہوٹیاں ذہن میں رینگنے لگتی ہیں اور بس.......... بس مجھے محمد بخش یا اس کی بیوی کے ہی یاد ہیں' یوں لگتا ہے جیسے آنکھ کھولتے ہی بس یہی چہرے دیکھے تھے میں نے"۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"اچھا خیر تم پریشان نہ ہو.......... چھوڑو یہ باتیں، تمہارے لیے یہی کیا کم ہے کہ تم یہاں محفوظ ہاتھوں میں ہو مسٹر زید تمہیں اپنی بیٹی کی طرح چاہتے ہیں۔ سوچو ان کی جگہ کوئی جابر شخص ہوتا تو وہ تمہارے ساتھ کیا کرتا؟ یہاں تمہیں کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہے کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ ایسی خراب دنیا میں یہ سب کچھ مل جانا، جنت مل جانے سے کم نہیں ہے نور، تم نے باہر کی دنیا نہیں دیکھی، مگر میں دیکھ چکا ہوں"۔

"جی سر، بابا بھی کہتا تھا اور اماں بھی"۔

"کون بابا.......... کون اماں؟"

"وہی سر، جنہوں نے مجھے پالا تھا۔ محمد بخش اور اس کی بیوی۔ وہی تو میرے بابا اور اماں تھے"۔

"اوہ.......... ہاں کیوں نہیں.......... جنم دینے والے سے پالنے والے کا رشتہ زیادہ گہرا ہوتا ہے"۔

"آپ ناشتا کر لیجیے"۔ اس نے سلائس کی پلیٹ میری طرف بڑھائی۔

"تم نہیں کرو گی؟"

"میں نے کر لیا ہے سر، صبح سویرے ہی کر لیا تھا"۔

"تم سوئی نہیں تھیں؟"

"سوئی تھی سر، مگر آٹھ بجے اٹھ گئی تھی کچن کا کام میں ہی سنبھالتی ہوں۔ سب کو ناشتا دینا ہوتا ہے"۔

اس کی بات ختم ہوتے ہی میں نے اس سے اشارے سے نائٹروجن اور ایمونیا کے بارے میں پوچھا۔ اس نے اشاروں ہی میں جواب دیا کہ ڈاکٹر ابھی تک نہیں آیا ہے اور یہ کہ میں مطمئن رہوں وہ یہ دونوں چیزیں ضرور حاصل کر لے گی خواہ کسی بھی طرح کرنا پڑے۔

پھر وہ مجھ سے مختلف باتیں پوچھتی رہی اور میں صرف اس لیے کہ سننے والے ہر بات سن رہے ہوں گے اس سے مسلسل جھوٹ بولتا رہا جس کی مجھے شرمندگی بھی تھی مگر یہ میری مجبوری تھی۔ وہ شاید یہ بات بھول گئی تھی اسی لیے اس نے بعض ایسے سوال بھی کیے جن کا صحیح جواب دینا میرے لئے نقصان دہ ثابت ہوتا۔ اس دوران میں، میں ناشتا بھی

کرتا رہا۔ ناشتا ختم کیا تو وہ چائے کے برتن اٹھا کر باہر چلی گئی۔ میں لیٹے لیٹے تھک چکا تھا مگر میں باہر نہیں جانا چاہتا تھا کیوں کہ میں جانتا تھا کہ مجھے فریش دیکھ کر جمال پھر میرے سر پر سوار ہو جائے گا۔ اس لیے میں کمرے میں ٹہلنے لگا اور خدا سے دعائیں مانگنے لگا کہ نور اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔

میرا ذہن بہت الجھا ہوا تھا طرح طرح کی سوچیں مجھے پریشان کر رہی تھیں۔ زینی مجھے اب تک نظر نہیں آئی تھی، شاید وہ بھی مسٹر زید کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔ بہرحال مجھے اس سے یا مسٹر زید سے کوئی سروکار نہیں تھا میں تو بس ہر حال میں یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ میں ٹہلتے ٹہلتے تھک کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اسی لمحے میری نگاہ فون پر پڑی اور مجھے خیال آیا کہ میں فاریہ کو فون ہی کر دوں۔ اگر اسے کچھ بتا نہ سکا تو کم از کم اپنی خیریت تو بتا ہی دوں گا اور ان لوگوں کی خیریت بھی معلوم کر لوں گا بلکہ موقع ملا تو ایسا کوئی جملہ بھی کہہ دوں گا جس سے فاریہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو جائے۔

اسی خیال کے تحت میں نے ریسیور اٹھایا۔ فون ٹھیک تھا۔ یہ دیکھ کر میری ہمت بڑھی اور میں سوچنے لگا کہ ممکن ہے جو کچھ میرے یا نور کے ذہن میں ہے وہ سب ہمارے اپنے ذہنوں کی اختراع ہی ہو۔ میں نے فاریہ کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف بیل بجنے لگی۔ میرا دل خوشی سے دھڑک اٹھا ورنہ سچی بات تو یہ تھی کہ مجھے امید ہی نہ تھی کہ میرا فون ٹھیک ہو گا بلکہ یہ یقین تھا کہ اب تک میرا فون کاٹ دیا گیا ہو گا۔ بیل اب بھی بج رہی تھی پھر اچانک کسی نے ریسیور اٹھایا ہی تھا کہ میرے کاندھے کے اوپر سے ایک ہاتھ فون کی طرف بڑھا اور دوسرے لمحے ہی لائن کٹ گئی۔ میں نے ہونقوں کی طرح اپنی پشت پر دیکھا۔ وہ جمال تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ مگر آنکھوں میں بے رحمی تھی۔

"سوری مسٹر اقبال.......... میں اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہوں مگر.........." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر میرے ہاتھ سے ریسیور لے لیا اور اسے واپس کریڈل پر رکھ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ "اصل میں انکل نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں آپ کو فی الحال فون نہ کرنے دوں بلکہ جب میں یہاں سے روانہ ہوں گا تب.......... یعنی میرے روانہ ہونے سے چند گھنٹے قبل آپ فاریہ کو اپنے پہنچنے کی اطلاع دیں گے اور پھر جب تک میں اپنا کام کر کے واپس نہ آ جاؤں اس وقت تک آپ اس سے رابطہ قائم نہیں کر سکیں گے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

بلکہ اگلی فلائٹ سے آپ وہاں پہنچ جائیں گے۔ اس طرح اسے یہ شک نہ ہو سکے گا کہ آپ آپ نہ تھے بلکہ کوئی اور.......... یعنی میں تھا۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟“

میں خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔

”آئی ایم رئیلی سوری مسٹر اقبال..........“ وہ شاید میری نگاہوں کی تاب نہ لا رہا تھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

”لیکن مسٹر جمال‘ وہ پریشان ہو گی.......... میں صرف اسے یہی بتانا چاہتا تھا کہ میں دو تین روز میں آ جاؤں گا“۔

”یہ تو آپ سلطان کو بتا چکے ہیں مسٹر اقبال‘ وہ مطمئن ہو گی..........“

میں لاجواب سا ہو گیا۔ میں واقعی سلطان کو بتا چکا تھا کہ میں دو تین روز بعد آؤں گا مگر اس وقت مجھے یقین تھا کہ میں واقعی چلا جاؤں گا۔ یہ بات تو مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھی کہ دو تین روز یہاں سے جانے والا میں نہ ہوں گا بلکہ جمال ہو گا۔

پھر جمال کچھ دیر تک خاموش رہا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔ اچانک اس نے سر اٹھایا‘ مجھے گہری نگاہوں سے دیکھا اور اپنے دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسا کر بولا۔

”مسٹر اقبال کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ کچھ اور سوچ رہے ہیں اور.......... مجھ سے تعاون نہیں کرنا چاہتے؟“

”میں کچھ اور سوچنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں مسٹر جمال اور آپ سے تعاون کرنا بہرحال میری مجبوری ہے‘ صرف اس لیے کہ میں ان لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا“۔

”آپ غلط سوچ رہے ہیں مسٹر اقبال.......... یہ آپ کی مجبوری نہیں ہے اس لیے کہ ہم بھی انہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہتے۔ یہ آپ اپنے دل سے نکال دیجئے۔ ہم پر اعتبار کر کے دیکھئے‘ آپ کو مایوسی نہیں ہو گی۔“ اس نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ اس کے لب و لہجے میں واضح تبدیلی آئی تھی اور میرے حق میں اچھا ہی تھا کہ اس نے میری اس حرکت سے مجھ پر کسی قسم کا شک نہیں کیا تھا۔

”آپ پر اعتبار ہی تو کر رہا ہوں مسٹر جمال‘ بلکہ آپ پر ہی نہیں‘ مسٹر زید پر‘ انہیں میں کچھ کچھ جان گیا ہوں‘ آپ سے البتہ اتنی ملاقات نہیں“۔

”مجھے بھی ان سے الگ نہ سمجھئے.......... چلئے چھوڑیئے اس بات کو یہ بتائیے کہ آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟“

”کافی بہتر ہے‘ آپ نے مس نور کو خواہ مخواہ زحمت دی“۔

”زحمت کیسی.......... آپ مہمان ہیں اور مہمان کا ہر طرح خیال رکھنا ہمارے فرائض میں شامل ہے۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں آپ کو؟“

”نہیں‘ شکریہ“۔ میں نے مختصر جواب دیا۔

”اگر آپ بہتر ہیں تو میرے کچھ سوالوں کا جواب دے دیں“۔

”جی پوچھئے“۔

پھر اس نے پے در پے کئی سوال کیے جن میں کچھ سوال فاریہ کی فیکٹری سے متعلق تھے اور کچھ بہادر اور سیماں سے‘ یہاں میرا ذہن پھر کھٹک گیا‘ اگر مسٹر زید کے مطابق سیماں ان کی بیٹی اور بہادر ان کے سالے تھے تو ظاہر ہے ان کا رشتہ جمال سے بھی اتنا ہی قریبی تھا خاص طور پر اس صورت میں کہ جمال زیادہ تر مسٹر زید ہی کے پاس رہا ہے۔ یہ بات بھی مجھے مسٹر زید نے ہی بتائی تھی۔ اگر ایسی بات تھی تو پھر جمال ان دونوں سے متعلق اس طرح کیوں سوال کر رہا تھا جیسے وہ ان دونوں کے بارے میں زیادہ نہ جانتا ہو۔

بہرحال میں نے الٹے سیدھے جواب دے کر اسے مطمئن کر دیا تھا۔ وہ تقریباً دو ڈھائی گھنٹے میرا سر کھاتا رہا پھر مجھے آرام کی تاکید کرتا ہوا چلا گیا۔ میں بستر پر لیٹ کر اس کو دیئے گئے جوابوں کے بارے میں سوچنے لگا کہ کہیں مجھ سے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی۔

کچھ دیر بعد دروازے پر آہٹ محسوس ہوئی مگر کسی نے دستک نہ دی۔ میں دستک کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک دروازے کا ہینڈل آہستگی سے گھوما۔ میں حیرت سے گھومتے ہوئے ہینڈل کو دیکھ رہا تھا کہ دروازہ دھیرے دھیرے کھلا اور سامنے نور کھڑی نظر آئی۔ میں جھپٹ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے ادھ کھلے دروازے ہی سے ایک کاغذ کا تھیلا اپنی چادر میں سے نکال کر میری جانب بڑھا دیا اور تیزی سے پلٹ کر میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے اسے آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔

کاغذ کے تھیلے میں شیشیوں کی موجودگی کو میں نے محسوس کر لیا تھا۔ یہ یقیناً ہائڈروجن اور ایمونیا کی شیشیاں تھیں۔ میں نے دروازہ بند کرتے ہی وہ تھیلا اپنے تکیے کے

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

نیچے چھپا دیا اور خود جلدی سے اسی تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ نور کے اس انداز نے خواہ مخواہ مجھے خوف زدہ کر دیا تھا۔ میں سمجھا تھا کہ شاید کوئی اسی طرف آنے والا ہے ورنہ وہ اس طرح نہ بھاگ جاتی مگر کافی دیر گزر جانے پر بھی کوئی نہ آیا تو میں مطمئن ہو گیا۔ میں نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ لاک کر دیا۔

پھر میں نے دونوں شیشیاں نکال کر چیک کیں اور انہیں بیڈ کے نیچے چھپا دیا۔ اب میں خود کو کافی چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا۔ میں نے وقت پر دوا بھی لے لی اور الماری سے ایک گہرے نیلے رنگ کا سوٹ نکال کر دیکھا۔ اسی قسم کا ایک سوٹ میں کل جمال کو پہنے دیکھ چکا تھا۔ اب مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ الماری میں لٹکے ہوئے یہ کپڑے بالکل میرے ناپ کے کیسے بن گئے تھے۔ یہ یقیناً جمال ہی کے کپڑے تھے جو مجھے فِٹ آتے تھے۔

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ہی ساتھ میرے اعصاب کا تناؤ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ رات کو حالات کیا رخ اختیار کریں گے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں اور نور پھنس جائیں اور پھر دنیا سے ہمارا نام و نشان تک مِٹ جائے اور یہ بھی ممکن تھا کہ ہم اپنے پلان میں کامیاب ہو جائیں۔

نور سے اب تک ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ اب شام ہو چکی تھی۔ میں نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا بلکہ تھرمس میں موجود سوپ پی لیا تھا۔ نور مجھے بتا چکی تھی کہ ڈاکٹر نے سخت پرہیز بتایا ہے اس لیے مجھے آج صرف سوپ پر ہی گزارا کرنا پڑے گا۔ میں نے پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ مجھے کیا ہو گیا ہے یا پرہیز کیوں ضروری ہے اصل میں میرا ذہن ایسے بکھیڑوں میں الجھا ہوا تھا جو ہر حال میں میری صحت سے زیادہ ضروری تھا۔

میں اپنے کمرے میں تھا کہ انٹرکام پر نور کی آواز سن کر کچھ ڈھارس سی ہوئی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میری طبیعت اب کیسی ہے اور میں چائے کے ساتھ کیا لینا پسند کروں گا۔ میں نے چائے کے ساتھ سینڈوچ لانے کو کہا۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد وہ میرے کمرے میں آئی اور آتے ہی ایک کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ جس میں میرے لیے خوش خبری تھی کہ جمال کو رات کسی ڈنر میں جانا ہے۔ وہ رات گئے واپس آئے گا اور چونکہ وہ شراب کا عادی ہے اس لیے نور کو سو فی صد یقین ہے کہ وہ حسبِ سابق نشے میں ڈوبا ہوا

ہو گا۔ اس نے مجھے ہدایت کی تھی کہ اس کے جاتے ہی میں اپنے بالوں اور مونچھوں کو رنگ لوں اور اس کے واپس آنے کے بعد یہاں سے نکلنے کے لیے تیار رہوں۔

یہ خبر میرے لیے بہت اہم تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ خدا ہماری مدد کر رہا ہے۔ میں نے اشارے سے اسے مطمئن رہنے کو کہا۔ وہ میرے کمرے میں زیادہ دیر نہ رکی۔ اس کے جانے کے بعد کھانے میں مصروف ہو گیا۔ سینڈوچ کھاتے ہی جیسے میری آنکھیں کھل گئی تھیں۔ چائے پی کر فارغ ہوا تو میں نے رقم کا وہ تھیلا اپنے تکیے کے غلاف میں رکھ لیا جو مجھے مسٹر زید نے دیا تھا۔ وہ شاید رقم دے کر بھول چکے تھے۔ بہرحال یہ رقم میرے لیے بے حد ضروری تھی۔ میں بستر پر لیٹ گیا اور آنے والے حالات کا احاطہ کرنے لگا۔

رات تقریباً نو بجے نور نے مجھے بتایا کہ مسٹر جمال تیار ہو کر جا چکے ہیں اس کا خیال تھا کہ وہ رات بارہ ایک بجے سے پہلے واپس نہ آ سکیں گے۔ میں نے اور نور نے اس رات ساتھ ہی کھانا کھایا۔ نور کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ مین گیٹ پر تین آدمی موجود ہیں۔ ایک اندرونی حصے میں اور دو باہری حصے میں۔ یہ سن کر میں پریشان ہو گیا مگر نور مطمئن تھی۔ اس کے خیال میں سب کچھ ہماری مرضی کے مطابق ہو رہا تھا۔ اس تمام سیٹ اپ میں سب سے بہترین اور اہم بات یہ تھی کہ مسٹر زید اور زینی یہاں موجود نہیں تھے ورنہ ان کی موجودگی ہمارے پلان کی ناکامی ثابت ہوتی۔

کھانے کے فوراً بعد ہی میں نے ہائیڈروجن اور ایمونیا سے اپنے بالوں کو رنگ لیا تھا اور اپنے کمرے میں بند ہو گیا تھا۔ نور نے کہا تھا کہ وہ مسٹر جمال کے گھر آنے کے بعد ہی مجھے اطلاع کر دے گی۔ اس نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں سلیپنگ سوٹ میں ہی رہوں البتہ احتیاطاً میں ایک جوڑا اپنے ساتھ رکھ لوں۔ نور نے خواب آور گولیوں کا بندوبست بھی کر لیا تھا جسے وہ جمال کو سلانے کے لیے استعمال کرنا چاہتی تھی۔

رات تقریباً ڈیڑھ بجے میں نے اپنے دروازے پر آہٹ محسوس کر کے دروازہ کھول دیا۔ نور دروازے پر موجود تھی اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک تھیلا تھا۔ اس نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں رقم پہلے ہی اپنی جیب میں رکھ چکا تھا۔ فوراً ہی اس کے پیچھے باہر آ گیا۔ ہم دبے پاؤں چلتے ہوئے کوریڈور سے باہر آ گئے باہر آتے ہی نور نے مجھے سنبھال

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

لیا۔ میں اس کی قربت میں بوکھلایا مگر اس کی سرگوشی نے مجھے فوراً ہی نارمل کر دیا۔
"تمہیں نشے میں نظر آنا ہے"۔ میں نے فوراً ہی جھومنا شروع کر دیا اور اپنا بوجھ نور پر ڈال دیا۔ نور مجھے تھامے ہوئے گیٹ کی طرف آ گئی اس دوران میں وہ مسلسل مجھے سرگوشی میں ہدایت دے رہی تھی۔ میں نور کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے گنگنانے لگا اور کبھی کبھی خاموش ہو کر لڑکھڑانے بھی لگتا تھا۔

ہم گیٹ پر پہنچ گئے۔ میں نے نور کی ہدایت کے مطابق چوکیدار کو گیٹ کھولنے کے لیے کہا۔ چوکیدار جو شاید نیند سے جاگا تھا بوکھلا کر گیٹ کی طرف بڑھا۔

"خان زادہ.......... صاحب کافی نشے میں ہیں، میں کچھ دور تک ٹہلا کر واپس لے آؤں گی۔ تم گیٹ بند نہ کرنا بلکہ یہیں کھڑے رہنا"۔ نور کی بات سن کر اس نے سر ہلایا۔
میری اور نور کی آواز سن کر باہر موجود دونوں افراد بھی قریب آ گئے مگر مجھے اور نور کو دیکھتے ہی مئودب ہو گئے۔

نور نے انہیں میری ضد کے بارے میں بتایا انہوں نے سر ہلایا پھر ان میں سے ایک شخص جو کافی لمبا تڑنگا تھا آگے بڑھا اور نور سے کہا کہ اگر وہ چاہے تو وہ ان کے ساتھ حفاظت کے خیال سے چلنے کو تیار ہے مگر نور نے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ میں زیادہ دور نہیں جاؤں گی بلکہ اس سڑک سے دوسری گلی میں جا کر دوسری جانب سے واپس آ جاؤں گی وہ پریشان نہ ہو۔

اس گفتگو کے دوران مسلسل میرا دل دھڑک رہا تھا مگر میں بڑبڑاتا رہا گنگناتا رہا اور ایسی اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتا رہا جنھوں نے چوکیدار سمیت ان دونوں کو منہ دبا کر مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ ان تینوں کو جُل دے کر ہم آگے بڑھ گئے۔ مجھے کافی دیر تک لڑکھڑا لڑکھڑا کر چلنا پڑا کیونکہ وہ تینوں بالکل پیچھے موجود تھے۔ جہاں تک یہ سڑک سیدھی تھی وہاں تک مجھے نشے باز کی اداکاری کرنا تھی گلی کے اختتام پر ہم جیسے ہی دوسری سڑک پر مڑے، میں اور نور دونوں سیدھے ہو گئے اور ہماری رفتار اچانک تیز ہو گئی۔ ہم خیریت کے ساتھ اس پُراسرار عمارت سے کافی دور نکل آئے تھے۔

نور نے کالے رنگ کی چوڑی سی چادر اوڑھی ہوئی تھی اور کاغذ کا وہ تھیلا بھی اس نے چادر میں چھپایا ہوا تھا جو اس کے پاس تھا اور جس میں اس نے میرا ایک جوڑا لے کر

رکھا لیا تھا۔ ظاہر ہے میں کراچی سے لاہور تک کا سفر سلیپنگ سوٹ میں تو کر نہیں سکتا تھا۔ کوٹھی سے دور نکلتے ہی مجھے اپنے کپڑوں کی فکر ہو گئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ کسی جگہ اپنے کپڑے بدل لوں مگر نور نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی اور مجھے گھسیٹتی ہوئی تیز رفتار سے چلتی رہی۔ کافی دور ایک پان کا کھوکھا کھلا ہوا تھا۔ اس کے برابر ہی میں ایک درمیانے درجے کا ہوٹل تھا جس کے اندر پڑی ہوئی کرسیاں ایک دوسرے کے اوپر اوندھی رکھی ہوئی تھیں البتہ ہوٹل کے باہر دو بینچیں پڑی ہوئی تھیں۔ قریب ہی بجری سے لدا ٹرک کھڑا تھا اور غالباً ٹرک ڈرائیور وغیرہ ہی ان بنچوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ہم تیز رفتار سے چلتے ہوئے اسی سڑک پر آ گئے۔

"نور اگر کسی نے دیکھ لیا تو کیا سوچے گا؟"

"کچھ نہیں سوچے گا۔ میں اور تم میاں بیوی ہیں، میری ماں اسپتال میں ہے۔ ابھی ابھی فون آیا تھا۔ ہمارے پاس گاڑی نہیں ہے اس لیے ٹیکسی تلاش کر رہے ہیں۔ اس کے بعد بھلا کسی کے سوچنے کی گنجائش ہی کہاں رہ جاتی ہے۔ تم اور میں ویسے ہی چہرے سے پریشان لگ رہے ہیں"۔

میں اس کی ذہانت پر حیران رہ گیا۔ اس کا یہ روپ میرے لیے قطعی نیا اور حیرت انگیز تھا ورنہ اسے دیکھ کر تو یوں لگتا تھا جیسے ابھی اس نے ٹھیک سے بولنا بھی نہیں سیکھا ہے۔ یہ بہترین کہانی تھی۔ اب میں بے خوف ہو کر قدم اٹھانے لگا۔ بہت جلد ہمیں ایک ٹیکسی مل گئی۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے میں نے پلٹ کر اس سڑک پر دیکھا جہاں سے ہم آئے تھے وہ سڑک سنسان پڑی تھی۔ گویا اب تک تو ہمارے فرار کی خبر نہیں ہوئی تھی اور یہ نیک فال تھی انہیں جس قدر دیر سے پتا چلتا ہمارے حق میں بہتر ہوتا۔

"کدھر صاب؟" ٹیکسی ڈرائیور کی کھردری آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"جناح اسپتال.......... جلدی.........." مجھ سے پہلے ہی نور بول پڑی۔

"ایمرجنسی ہے میم صاب؟" ڈرائیور نے فوراً گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں.......... جس قدر جلدی ہو سکے پہنچا دو"۔

"فکر نہ کرو میم صاب، یہ ٹیم ایسا ہے، ہم ہوائی جہاز کی طرح جائے گا"۔ اس نے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ ڈرائیور باتونی معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے سامنے لگا ہوا آئینہ بھی ایسی پوزیشن میں کر لیا تھا کہ میں اور نور اسے نظر آتے رہیں۔ اسٹریٹ لائٹس میں اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں آئینے میں صاف نظر آ رہی تھیں۔ مجھے کچھ الجھن سی محسوس ہوئی۔

"میم صاب یہ صاب بیمار ہے کیا؟"

"نہیں' میری ماں اسپتال میں ہے' یہ میرے شوہر ہیں"۔

نور کی بات سن کر اس نے آئینے سے مجھے دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں کچھ عجیب سی بات تھی۔ شاید وہ میری مسلسل خاموشی سے مشکوک ہو گیا تھا جس لیے مجھے یہ احساس ہوا ٹھیک اسی لمحے نور نے بھی مجھے کہنی مارتے ہوئے کہا۔ "آپ سے زاہد نے فون پر کیا کہا تھا.......... کیا ہو گیا امی کو؟"

"میرا خیال ہے کہ .... انہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ زاہد بے چارا تو بری طرح بوکھلایا ہوا تھا۔ اسی لیے میں نے دیر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ خدا کرے وہ ٹھیک ہوں"۔ میں نے مناسب جواب دیا اور کن انکھیوں سے آئینے کی طرف دیکھا۔

"صاب یہ ہارٹ بھی عجیب چیز ہے' ساری زندگی تنگ کرتا ہے اور پھر.......... خود ہی دغا دے جاتا ہے"۔

اس کی بات سن کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ شاید اس کی وجہ اس کا مضحکہ خیز انداز تھا۔

"میرا ایک بالکل جوان دوست تھا صاب.......... ہنستا کھیلتا' مسخرا پن کرتا اپنی ٹیکسی میں بیٹھا' ٹیکسی اسٹارٹ کی اور پھر جھٹکے سے گاڑی بند ہو گئی۔ ہم دوست سمجھے کہ وہ مسخرا پن کر رہا ہے۔ سر کو اسٹیئرنگ پر رکھے اوندھا پڑا ہے اور ہم قریب جائے گا تو گلا پھاڑ کر قہقہہ لگائے گا اور بس.......... مگر صاب صرف گاڑی بند نہیں ہوا تھا۔ اس کا اپنا گاڑی بھی بند ہو چکا تھا"۔

"اوہ.......... سو سیڈ.........."

"جی صاب؟"

"کچھ نہیں.......... یہ سن کر افسوس ہوا۔"

"افسوس تو سب کو ہوا تھا صاب' پر کیا کرے' اس کا گاڑی کیا بند ہوا سارے گھر کا گاڑی بند ہو گیا۔ پیٹ روٹی مانگتا ہے صاب اور روٹی نہیں ملتی تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے' اس کا بھی سب کچھ ختم ہو گیا"۔

"کیا مطلب؟" نور نے پوچھا۔

وہ باتیں تو کر رہا تھا مگر اس نے گاڑی کی سپیڈ کم نہیں کی تھی اور یہ بات میرے لیے اطمینان بخش تھی' اگر گاڑی کی سپیڈ کم ہوتی تو میں اسے ڈانٹ کر چپ کرا دیتا۔

"مطلب یہ میم صاب کہ اس کا ایک ماں اور ایک بہن تھا' روٹی بند ہوئی تو ماں بیمار ہو گیا' پھر مر گیا اور بہن.......... وہ ہمارا پاس ہے۔ ہم نے شادی کر لیا اس کے ساتھ۔ ابھی ہمارا ایک بچہ ہے' بالکل ہمارا دوست کی شکل"۔

اس کا جملہ ختم ہوا تو اس کی ٹیکسی کی رفتار ہلکی ہو گئی۔ "لو صاحب اسپتال آ گیا"۔

"وہاں اس گیٹ پر روکو"۔ نور نے بڑے سے کالے گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

ٹیکسی ڈرائیور کی باتوں میں وقت اور فاصلے کا کچھ پتا نہ چلا اور ذہن سے تفکرات بھی کچھ دیر کے لیے کم ہو گئے تھے۔ میں نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے حیرت سے نوٹ کو دیکھا۔

"نہیں صاب وہاں سے یہاں تک چار روپیہ بنتا ہے"۔

"میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں.........."

"لے لو ڈرائیور.......... ہم خوشی سے دے رہے ہیں' تم نے اتنی جلدی پہنچا دیا نا اس لیے.........." نور نے جلدی سے کہا۔ اس نے شاید میرے لہجے کی تلخی کو محسوس کر لیا تھا۔

میں اس کی مٹھی میں نوٹ ٹھونس کر اسپتال کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ میرے پیچھے ہی نور بھی آ گئی۔ اسپتال کے کاؤنٹر پر بیٹھا شخص اونگھ رہا تھا۔ ایک دو آدمی اور قریبی بنچ پر بیٹھے تھے جو ہمیں دیکھ کر کچھ متجسس سے ہو گئے تھے۔

میں بڑے اطمینان سے کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ "اے مسٹر.........." میں نے کاؤنٹر بجایا۔ کاؤنٹر پر بیٹھا شخص فوراً سیدھا ہو کر رجسٹر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"یس سر!"

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"ابھی تقریباً گھنٹا بھر پہلے یہاں کسی خاتون کو لایا گیا ہے' فاطمہ نام تھا"۔

"کوئی ایکسیڈنٹ کیس؟" اس نے مستعدی سے پوچھا۔

"نہیں.......... ہارٹ اٹیک.........." نور نے فوراً جواب دیا۔

"سوری سر.......... ایکسیڈنٹ کیس تو آیا ہے مگر.........."

"ممکن ہے انہیں سول اسپتال میں لے گئے ہوں"۔ نور نے مجھ سے کہا۔

"ہوں.......... چلو.........." میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور سیدھا گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ ہمارا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ میں کاؤنٹر پر بھی نہ جاتا اگر وہ ٹیکسی والا وہیں کھڑا نہ ہو گیا ہوتا تو.......... میں نے باہر آ کر دیکھا دور دور تک کوئی ٹیکسی نہ تھی۔ گویا وہ جا چکا تھا۔ ہم دونوں گیٹ سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔

"اب..........؟"

"ہمیں اسٹیشن جانا ہے' اسٹیشن یہاں سے قریب ہے۔ ٹیکسی مل جائے تو اچھا ہے مگر تمہارے کپڑے.........." اس نے میرے سراپے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر اچانک بولی۔ "یہ چادر اوڑھ لو"۔ اس طرح کافی حد تک کپڑے چھپ جائیں گے اسٹیشن پہنچ کر کپڑے بدلنا آسان ہو گا۔ ویٹنگ روم میں جا کر کپڑے تبدیل کر لینا"۔

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اس لیے میں نے چادر اپنے گرد لپیٹ لی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک ٹیکسی اسپتال کے گیٹ پر رکی' کچھ مسافر اترے اور ٹیکسی جانے کے لیے مڑی تو میں نے اسے روک لیا۔ ہم نے اسٹیشن کا کہا اور خاموشی سے بیٹھ گئے۔

رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ میں نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالی پونے تین بجے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ہم سٹی اسٹیشن پہنچ گئے۔ یہاں کافی رونق تھی اور بالکل نہیں لگ رہا تھا کہ رات کے ساڑھے تین بج چکے ہیں۔ میں سیدھا ویٹنگ روم میں چلا گیا۔ نور کے ہاتھ سے تھیلا میں اپنے ساتھ ہی لے گیا دس منٹ بعد ہی میں اور نور اسٹیشن پر بنی سیمنٹ کی بنچ پر بیٹھے تھے۔ میں نے چادر نور کو دے دی تھی کیوں کہ اب میں کپڑے تبدیل کر چکا تھا اور سلیپنگ سوٹ اتارتے ہی مجھ میں پھیلا خوف کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔ اب میں خود کو زیادہ بااعتماد محسوس کر رہا تھا ورنہ اس لباس میں گھومتے ہوئے بڑا خوف محسوس

ہو رہا تھا کہ لوگ میری جانب سے مشکوک نہ ہو جائیں۔

میں نے معلومات کے کاؤنٹر پر جا کر وہ لسٹ دیکھ لی تھی جس میں گاڑیوں کی آمدورفت کا وقت لکھا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی ہمیں ایک گاڑی لاہور جانے والی مل سکتی تھی۔ میں نے دو ٹکٹ لیے ایک تھرمس خریدا اور کچھ کھانے پینے کا سامان لے کر نور کے پاس پہنچ گیا۔ ہم دونوں پھر اسی سیمنٹ کی بنچ پر بیٹھ گئے۔ میری نگاہیں اس خالی پٹڑی پر جمی ہوئی تھیں جو اسٹیشن پر روشن بلبوں میں دور تک چمک رہی تھی اور جس پر وہ ٹرین آنے والی تھی جو ہمیں اس رستے پر لے جاتی جہاں زندگی کی ساری خوشیاں موجود تھیں مگر نور میرے لیے کسی مسئلے سے کم نہ تھی۔ میں اسے کسی حال میں بھی فاریہ کے گھر نہیں لے جانا چاہتا تھا اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے کہاں لے جاؤں۔

بہرحال فی الوقت تو ہمیں یہاں سے نکلنا تھا جس قدر جلد ہو سکے اس جگہ کو چھوڑ ۔ ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ ان لوگوں کو ہمارے فرار کا علم ہو گیا ہو۔ مجھے یقین تھا کہ ایسی صورت میں وہ سب سے پہلے اسٹیشن پر ہی چیک کریں گے۔ ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے تقریباً دس منٹ ہو گئے تھے۔ اس دوران میں' میں اپنی سوچوں میں ہی غرق رہا تھا۔ نور بھی کچھ سوچ رہی تھی شاید اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہی ہو' اچانک نور نے سختی سے میرا بازو تھام لیا۔ میں نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ اس کا رنگ سفید ہو رہا تھا اور نگاہیں اسی گیٹ کی طرف تھیں جہاں سے ہم داخل ہوئے تھے اور جس جگہ لوگوں کا ایک جمِ غفیر تھا۔

"وہ.......... وہ آ گئے.......... دیکھئے.......... وہ.........."

میں نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں اپنی نگاہیں دوڑائیں اور سن ہو کر رہ گیا۔ یہ وہی دونوں تھے جو کوٹھی کے باہر پہرہ دے رہے تھے۔ "اب کیا ہو گا؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا اور فوراً ہی میں نور کو کھینچتا ہوا ان سیڑھیوں کے قریب لے آیا جو اوپر بنے پُل سے ہوتی ہوئی دوسرے پلیٹ فارم پر اتر رہی تھیں۔ درمیان میں پچھلی پٹڑیوں میں ایک پٹڑی پر ایک مال گاڑی کھڑی تھی۔ سیڑھیوں سے اس پلیٹ فارم پر اترتے ہی مجھے محفوظ ہو جانے کا احساس ہو گیا کیوں کہ اب ہمارے اور ان دونوں کے درمیان مال گاڑی تھی۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ ان دونوں نے ہمیں دیکھا نہ ہو' ورنہ وہ اس

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

طرف بھی آ سکتے تھے۔ اسی خیال کے تحت میں وہاں بھی نہیں رکا اور نور کا ہاتھ تھامے ہوئے لکڑی کے اس جنگلے کے ساتھ ساتھ دوڑتا رہا جو پٹڑیوں کے اختتام پر بنا ہوا تھا۔ میں اس جنگلے کی دوسری طرف نکلنا چاہتا تھا مگر جنگلے میں لگی لکڑی کی پٹیاں اتنی قریب قریب جڑی ہوئی تھیں کہ ان میں سے گزر کر دوسری طرف جانا ناممکن تھا۔ یہ غنیمت تھا کہ اس طرف کوئی نہ تھا اور گہرا اندھیرا ہمارا ساتھ دے رہا تھا گو اندھیرے میں نور کئی مرتبہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچی تھی۔

ہم اس جنگلے کے ساتھ ساتھ بھاگتے رہے۔ میں نے اپنا ہاتھ جنگلے کی ان پٹیوں سے ٹکایا ہوا تھا تاکہ اگر کہیں گیپ آئے تو مجھے پتا چل جائے۔ کچھ دیر تک بھاگتے رہنے کے بعد ہی مجھے احساس ہوا کہ یہاں جنگلے میں کافی گیپ ہے۔ میں ٹھہر گیا۔ یہاں اندھیرا بھی اتنا نہیں تھا بلکہ دور کچی آبادی میں روشن بلب کی ہلکی ہلکی روشنی میں مجھے وہ جگہ نظر آ گئی جہاں شاید درمیانی لکڑی کی پٹی ٹوٹی ہوئی تھی............ پہلے میں اور پھر نور اس خلا سے دوسری طرف آ گئے۔ دوسری طرف کچھ ڈھلوان تھی پھر ایک کچی سڑک تھی اور اس سڑک سے کچھ فاصلے پر بے ترتیب کچھ پکے مکانات بنے ہوئے تھے۔ میں نے ڈھلوان سے اترنے سے پہلے اسٹیشن کی طرف دیکھا۔ اسٹیشن تو نظر نہ آیا کیوں کہ ہم اسے کافی دور چھوڑ آئے تھے البتہ ٹرین کی پٹڑی جو اب تک ہمارے ساتھ چل رہی تھی دور سے چمکتی نظر آ رہی تھی۔ میں صرف ان دونوں کو دیکھنا چاہتا تھا کہ انہوں نے ہمارا تعاقب تو نہیں کیا! دور دور تک کوئی ذی روح نظر نہ آیا تو مجھے کچھ اطمینان ہوا کہ ہم ایک مرتبہ پھر ان درندوں کی دسترس سے دور نکل آئے ہیں۔

ہم ڈھلوان سے اتر کر سڑک پر آ گئے۔ آگے سڑک کے اس طرف بنی آبادی میں سوائے کتوں کے اور کوئی بھی نہیں جاگ رہا تھا۔ صبح کے شاید چار بج چکے تھے یا شاید پانچ بج گئے ہوں گے ظاہر ہے اس وقت کسی کے جاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور یہ تو غریبوں کی بستی تھی' ان غریبوں کی جو یقیناً سویرے سورج نکلنے سے پہلے اٹھ کر اپنے اپنے دھندوں پر جاتے ہوں گے۔ رات کے اس پہر ہمارا یوں سڑک پر چلنا بھی مناسب نہ تھا' ممکن ہے پولیس ہی پکڑ لیتی کہ ہم کون ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ نور میرے پیچھے پیچھے سہمی ہوئی چل رہی تھی۔

"نور............ اب کیا کریں............ تم کیا سوچ رہی ہو؟"

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔ ہمیں کسی ایسی جگہ پہنچ جانا چاہیے جہاں رات گزاری جا سکے ورنہ............"

شاید وہ بھی وہی کچھ سوچ رہی تھی جو میرے ذہن میں تھا۔ عین اسی لمحے مجھے کسی گاڑی کے انجن کی سی آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا دور ایک موڑ سے گاڑی کی روشنی سڑک کے دوسری طرف پڑ رہی تھی۔ میں نے نور کا ہاتھ پکڑا اور بھاگ کر ایک کچے مکان کی دیوار کے پیچھے ہو گیا۔ روشنی اور انجن کی آواز قریب آتی گئی اور کچھ ہی دیر بعد وہ ٹرک ہمارے سامنے آ گیا۔ میں نور کے ساتھ دیوار کی آڑ میں دبک گیا۔ میرا خیال تھا کہ ٹرک آگے بڑھ جائے گا مگر اس وقت میرا دل حلق میں آ گیا۔ جب ٹرک عین اسی گھر کے دروازے پر رک گیا جس کی آڑ میں ہم کھڑے تھے۔

ٹرک والا اونچی آواز میں کوئی گانا گا رہا تھا مگر ٹرک سے اترتے ہی وہ خاموش ہو گیا' پھر کچھ دیر بعد ہمیں دستک کی آواز آئی۔ شاید یہ اسی ٹرک والے کا گھر تھا۔ چند لمحوں بعد ہی دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز آئی۔ ہم دونوں دم سادھے کھڑے تھے۔ اب ہوا میں خنکی بھی بڑھ گئی تھی اور مجھے کچھ سردی کا احساس ہو رہا تھا۔ نومبر کا آخری ہفتہ تھا' سردیوں کی آمد آمد تھی ظاہر ہے خنکی بڑھنا تھی۔ نور کے ہاتھ بھی ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ یہاں دور تک ایسی کوئی جگہ نہ تھی جہاں چھپ کر ہم رات گزارتے یا سردی سے بچ سکتے۔ اچانک ایک خیال نے مجھے چونکا دیا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی مگر نور نے یقیناً میری مسکراہٹ نہیں دیکھی ہو گی۔

"نور............ آؤ............" میں نے سرگوشی کی۔

"کہاں............؟" اس نے دھیرے سے پوچھا۔

"سنو............ اس ٹرک سے بہتر کوئی دوسری جگہ نہیں' یہاں ہم محفوظ بھی رہیں گے اور سردی سے بچاؤ بھی ہو جائے گا"۔

میری بات سنتے ہی نور نے سر ہلایا اور ہم دبے پاؤں ٹرک کی طرف آ گئے۔ میں نے سہارا دے کر پہلے نور کو سوار کرایا پھر خود بھی ٹرک پر چڑھ گیا۔ ٹرک دونوں اطراف سے بند تھا اور یہ ہمارے لیے بہتر ہی تھا۔ اندر دو تین بوریاں اور کچھ سوکھی گھاس پڑی تھی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

ایک طرف ٹرک کا ٹائر اور پانے وغیرہ بھی پڑے تھے۔ میں نے نور کو گھاس پر بٹھا دیا اور خود ایک بوری پر بیٹھ گیا۔ نور نے چادر سے خود کو اچھی طرح لپیٹ لیا تھا۔ میں نے اسے لیٹ جانے کو کہا۔ وہ فوراً ہی لیٹ گئی۔ وہ شاید بہت تھک گئی تھی۔ تھکا ہوا تو میں بھی بہت تھا بلکہ میں تو کافی کمزوری بھی محسوس کر رہا تھا اور میرا بدن بہت گرم ہو رہا تھا۔ شاید بخار دوبارہ چڑھ گیا تھا۔ پیاس کی وجہ سے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا کہ میں نے تھرمس میں پانی اور کچھ کھانے پینے کی اشیاء اسٹیشن سے خرید لی تھیں ورنہ جانے کیا ہوتا۔ پیاس کا احساس ہوتے ہی میں نے تھیلے سے تھرمس نکال کر نور کی طرف بڑھایا۔ نور میرے ہاتھ میں تھرمس دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی۔ اس نے غٹاغٹ پانی پیا اور بے دم سی پھر گھاس پر لیٹ گئی' پھر میں نے اپنی پیاس بجھائی اور ٹائر پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔

سچ کہتے ہیں کہ نیند کانٹوں پر بھی آ جاتی ہے۔ میں تو صرف تھکن اتارنے کے لیے لیٹا تھا مگر جانے کب آنکھ لگ گئی اور شاید نور بھی سو گئی تھی کیوں کہ جب میری آنکھ کھلی تو وہ سو رہی تھی۔ جاگتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ ٹرک رکا ہوا نہیں ہے بلکہ ہم کسی انجانی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ میں نے گھبرا کر نور کو جگا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور شاید وہ چیخنے ہی والی تھی کہ میں نے اس کے کھلے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ فوراً ہی سنبھل گئی۔ میں نے اشارے سے اسے خاموش رہنے کو کہا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ رات شاید ختم ہونے والی تھی کیوں کہ آسمان کے کنارے سرمئی ہو رہے تھے۔ ہم کسی پکی سڑک پر گامزن تھے۔ ٹرک والے نے ٹیپ آن کیا ہوا تھا اور کوئی سرائیکی زبان کا گانا پوری آواز سے بج رہا تھا۔ سڑک پر دور دور بجلی کے کھمبے لگے ہوئے تھے۔ دونوں جانب کوئی آبادی نہ تھی بلکہ زیادہ تر جھاڑیاں اور درخت اگے ہوئے تھے۔ فضا کی خنکی ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔ میں نے وہاں پڑی ہوئی بوریاں اپنے اور نور کے جسم پر ڈال دیں اور خاموش پڑے رہنے کا کہہ کر خود بھی لیٹ گیا۔ اس کے سوا کچھ اور کیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ یہ کم اطمینان کی بات نہ تھی کہ ہم اس جگہ سے دور نکل آئے تھے جہاں ٹھہرے رہنا ہمارے لیے کسی بھی لمحے عذاب بن سکتا تھا۔

نہ معلوم ہم کہاں جا رہے تھے اور ٹرک میں کتنے آدمی تھے اور اب تو دن بھی نکلنے ہی والا تھا۔ آسمان کا سرمئی پن' سرخی میں بدلتا جا رہا تھا۔ میں اور نور دونوں ہی دبکے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

پڑے تھے۔ راستہ اب بھی سنسان تھا دور دور تک کہیں آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اب یہاں خاموش پڑے رہنا ہی بہتر تھا۔ ویسے بھی ہم اس کے سوا کر بھی کیا سکتے تھے۔ نور کو پھر نیند آ گئی مگر مجھے تو صرف یہ فکر تھی کہ ٹرک کہاں جا کر رکتا ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہم سوتے میں پکڑے جائیں البتہ میں نے نور کو جاگنے پر مجبور نہ کیا۔

نہ معلوم ہم کب تک سفر کرتے رہے' سورج کی کرنیں دھیمے دھیمے روشنی پھیلاتی رہیں' سورج اپنا سفر پورا کرتا رہا اور ٹرک چلتا رہا۔ پھر اچانک ہی کھیت شروع ہو گئے۔ یہ کھیت گنے اور مکئی کے تھے' دہقان سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی ہل لے کر اپنی زمینوں پر نکل آئے تھے۔ میں نے ان کے لباس اور وضع قطع سے اندازہ لگایا کہ ہم اندرون سندھ سفر کر رہے ہیں۔ کچھ اور آگے جانے کے بعد آبادی بھی شروع ہو گئی۔ میں نے جھانک کر دیکھا دور کسی پٹرول پمپ کی تختی روشن تھی۔ وہاں کئی ٹرک اور پک اپ کھڑی تھیں۔ میری چھٹی حس نے اسی لمحے مجھے چوکنا کر دیا تھا۔ میں نے نور کو ہلایا۔ وہ اچھل پڑی۔ میں نے اشارے سے اسے اٹھ جانے کو کہا۔

اس نے اٹھ کر چاروں طرف دیکھا۔ ٹرک کی رفتار بھی دھیمی ہو گئی تھی۔ میں اور نور اپنے سامان لے کر ٹرک کے اس حصے کی طرف آ گئے جہاں سے ہم باآسانی چھلانگ لگا کر اتر سکتے تھے۔ میرا خیال صحیح تھا۔ ٹرک کچے میں اتر کر رک گیا۔ یہ بڑا غنیمت تھا کہ ٹرک کے پچھلے حصے کی طرف کوئی نہ تھا اور قریب ہی گنے کے کھیت تھے۔ میں نے کان لگائے۔ میں ٹرک والے کے اترنے کا انتظار کر رہا تھا چند ہی لمحوں بعد ٹرک کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پھر دروازہ ایک زور دار آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔ اب مجھے صرف یہ ڈر تھا کہ ٹرک والا اس طرف' کچھ لینے نہ آ نکلے مگر یہ ڈر تھوڑی ہی دیر بعد ختم ہو گیا کیوں کہ میں نے جھانک کر دیکھا تو ٹرک والا اس کیبن کی طرف جا رہا تھا جہاں غالباً چائے مل رہی تھی۔ کیوں کہ مٹی کے چولہے پر رکھی بڑی سی کیتلی سے بھاپ اٹھتی نظر آ رہی تھی۔ میں نے چند لمحے انتظار کیا اور اس کے بعد خود کو سنبھال کر' بڑی احتیاط سے نیچے اتر گیا۔ اس بات کا میں نے خاص خیال رکھا تھا کہ میرے کودنے سے آواز پیدا نہ ہو۔ میں نے اترتے ہی ہاتھ بڑھا کر نور کو اترنے میں مدد دی۔ اس کے اترتے ہی میں اس کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے کھیتوں کی طرف بھاگا۔ ہم بہت جلد محفوظ جگہ پہنچ گئے۔ یہ ایک کھڈ سا تھا اور

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

اس کے چاروں طرف درخت اگے ہوئے تھے۔ کھڈ میں بھی کافی جھاڑیاں تھیں مگر ہم کم از کم یہاں بیٹھ کر آگے کے متعلق کوئی پروگرام تو بنا سکتے تھے۔

نور کا سانس پھولا ہوا تھا۔ ہم کچھ دیر خاموش بیٹھے سانس درست کرتے رہے' پھر میں نے پیٹرول پمپ کی طرف جھانکا کسی کو ہمارے بارے میں علم نہیں ہو سکا تھا جس ٹرک میں ہم یہاں تک آئے تھے۔ وہ اب بھی وہیں کھڑا تھا۔ پھر ایک خیال کے تحت میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں جا رہے ہیں؟"

"یہاں بیٹھے رہنا بھی تو ٹھیک نہیں ہے۔ میں یہاں سے نکل کر کوئی انتظام کرتا ہوں۔ تم ایسا کرو کہ چادر کو اچھی طرح لپیٹ کر باہر چلی آؤ۔ یہاں چھپے رہنے سے کنارے کھڑے رہنا زیادہ بہتر ہے۔ ویسے بھی اب صبح ہو چکی ہے' کسی کو شک نہیں ہو سکے گا۔"

اتنا کہہ کر میں درختوں کی آڑ سے نکل کر ٹرک کے قریب پہنچ گیا۔ اسی لمحے میں نے ایک شخص کو چادر لپیٹے ٹرک کے قریب آتے دیکھا۔ آنے والے نے ٹرک کا دروازہ کھولا تو میں سمجھ گیا کہ یہی ٹرک ڈرائیور ہے۔ وہ شخص شکل سے سیدھا سادا اور نیک آدمی لگتا تھا یعنی اس کے چہرے پر ایسا خرانٹ پن نہیں تھا کہ مجھے خوف محسوس ہوتا یا میں اسے غنڈہ ٹائپ کا آدمی سمجھتا۔ اس شخص نے مجھے قریب دیکھ کر آنکھ ماری اور اچک کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اس کے اس انداز نے میرا حوصلہ بڑھایا اور میں جلدی سے اس دروازے کے قریب چلا آیا جسے وہ بند کرنے ہی والا تھا۔ "بھیا سنو!"

"فرماؤ شہزادے کیا بات ہے؟"

"دراصل............ میری بیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے"۔ میں نے جھجک کر کہا۔

"بیوی............؟ کیسی بیوی............ کون سی بیوی؟" اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ............ وہاں کھڑی ہے' درخت کے پاس............ اسے اسپتال لے کر جانا ہے' شہر............ اور تو کوئی سواری نہیں ملے گی اگر تم ہمیں شہر پہنچا دو تو............ میں کرایہ دے دوں گا۔"

"اوہ بات کرائے کی نہیں' تیری بیوی کی ہے' مجھے تو نظر نہیں آ رہی"۔ اس نے جھانک کر پیچھے کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ نور ٹرک کے بالکل پیچھے کھڑی تھی۔ میں نے اشارے سے اسے بلایا۔ وہ قریب چلی آئی۔

"اچھا اچھا............ ٹھیک ہے میں سکھر جاؤں گا' بڑی سڑک پر اتار دوں گا وہاں سے تمہیں تانگہ مل جائے گا"۔

شکریہ بھیا' یہی کافی ہے"۔

اسی طرف سے آ جاؤ"۔ اس نے دوسری جانب کا دروازہ کھول دیا۔ پہلے تو میں نے چاہا کہ اسے کہہ دوں کہ ہم پیچھے بیٹھ جاتے ہیں مگر یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ اسے شک نہ ہو جائے۔ اس کے برابر میں مَیں بیٹھ گیا پھر نور کو سہارا دے کر اوپر کھینچ لیا۔ ٹرک چل پڑا اور میں دل ہی دل میں ہنس دیا کہ ہم اب تک اسی ٹرک کے پچھلے حصے میں سفر کر رہے تھے اور کس قدر خوف زدہ تھے مگر اب اسی ٹرک کے اگلے حصے میں بے خوف بیٹھے ہیں۔ کراچی بہت دور رہ گیا تھا اور ویسے بھی اب مجھے مسٹر جمال وغیرہ کا ڈر نہیں تھا کیوں کہ انہیں گمان بھی نہ ہو گا کہ ہم کسی ٹرک پر سفر کر رہے ہوں گے۔ انہوں نے ہمیں اسٹیشن پر ڈھونڈا ہو گا یا ممکن ہے کہ ایئرپورٹ پر اور بسوں کے اڈوں پر تلاش کیا ہو۔

ٹرک والا زیادہ باتونی نہیں تھا یا شاید نے اس نے نور کی وجہ سے زیادہ بات نہ کی اور یہ اچھا ہی ہوا' مجھے سوچنے کا کافی وقت مل گیا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ سکھر پہنچتے ہی میں لاہور فون کروں گا اور فاریہ کو یہ بتا دوں گا کہ میں پہنچنے والا ہوں اور اسے یہ بھی خبردار کر دوں گا کہ میری بجائے جمال کا وہاں پہنچنے کا پروگرام تھا اس لیے اگر آج وہ پہنچے تو وہ خبردار رہے اور اسے کوٹھی میں نہ آنے دے۔ میں نے یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ فی الحال نور کو اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا تاکہ فاریہ مجھے پہچان سکے اور یہ بات میں فون پر ہی بتا دوں گا۔ کہ اگر میں اکیلا آؤں تو سمجھ جائے کہ وہ میں نہیں ہوں۔

"چلو بھیا............ سکھر آ گیا ہے"۔ ٹرک ڈرائیور کی آواز نے مجھے سوچوں کے جال سے نکال لیا میں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا ہم ایک چوڑی سڑک پر تھے اور ہمارے دائیں جانب ریل کی پٹڑیاں بکھری ہوئی تھیں اور بائیں جانب آٹو ورکشاپ بنی ہوئی تھی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"شکریہ بھائی"۔ یہ کہہ کر میں نے جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "اس میں سے اپنا کرایہ کاٹ لو"۔

"نہیں صاب اس کی ضرورت نہیں' مجھے تو آنا ہی تھا اس طرف........"

"پھر بھی کچھ........"

"بولا نا نہیں........ جاؤ بس دعا کر دینا میرے لئے"۔

میں نے پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور ہم دونوں ٹرک سے اتر گئے۔ قریب ہی بہت سے تانگے کھڑے تھے۔ میں نے ایک تانگے والے سے ٹیلی فون کے دفتر کا پتا پوچھا اور اس سے وہاں تک پہنچانے کو کہا۔ تانگے والا راضی ہو گیا تو ہم دونوں اس میں بیٹھ گئے۔ آدھے گھنٹے کے بعد اس نے ایک منزلہ عمارت کے سامنے تانگہ روک کر بتایا کہ یہی ٹیلی فون کا آفس ہے۔ میں اسے کرایہ دے کر نیچے اتر گیا۔ نور پہلے ہی اتر چکی تھی۔

چند ہی لمحوں بعد میں فاریہ سے فون پر بات کر رہا تھا۔ فاریہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "تم آخر کیا چاہتے ہو اقبال' سوہنی کی حالت خراب ہے' ہم سب پریشان ہیں اور تم کسی صورت واپس آنے کو تیار نہیں ہو"۔

"میڈم میری بات غور سے سنئے گا"۔ اتنا کہہ کر میں نے چاروں طرف دیکھا۔ لوگ مجھ سے کافی فاصلے پر تھے۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "میڈم میں اب تک کسی کی قید میں تھا اور مجھے قید کرنے والا زید نامی شخص تھا"۔ پھر میں نے اسے مختصراً سب کچھ بتا دیا یہ بھی کہ جمال کا میرے روپ میں وہاں جانے کا پروگرام تھا۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ میں اپنے بالوں کو بھورا کر چکا ہوں۔ اب غالباً مجھ میں اور جمال میں کوئی فرق نہیں مگر جمال اگر وہاں آیا تو وہ اپنے بالوں کو کالا کر کے آئے گا۔ دوسری بات یہ کہ وہ تنہا ہو گا جب کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ یہی میری پہچان ہے کہ میرے ساتھ نور ہو گی"۔

"سنو اقبال تم فوراً ائرپورٹ پہنچو........ سوری' اسٹیشن پہنچو اور کسی تیز رفتار ٹرین سے یہاں پہنچ جاؤ۔ میں تنہا اتنے مسائل سے نہیں نپٹ سکتی' تمہاری باتیں سن کر تو میں اور پریشان ہو گئی ہوں"۔

"میڈم اب تو پریشانی کی کوئی بات نہیں' میں یہاں سے فوراً ہی روانہ ہونے کی کوشش کرتا ہوں' بس آپ پوری احتیاط رکھئے' چوکیدار کو بتا دیجئے کہ اگر وہ اقبال کو تنہا

دیکھے تو بالکل اندر نہ آنے دے' سلطان کو بھی بتا دیجئے اور حوصلہ رکھئے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ خدا نے اب تک ہماری مدد کی ہے وہ آئندہ بھی ہماری حفاظت کرے گا"۔

یہ سب بتا کر میں نے فون بند کر دیا۔ فاریہ بے حد پریشان تھی اور اسے ہونا بھی چاہیے تھا۔ میرا اچانک وہاں سے غائب ہو جانا ہی اس کے لیے عذاب بن گیا ہو گا۔ نور اس دوران میں میرے قریب ہی کھڑی رہی۔ فون کرتے ہی ہم باہر آ گئے۔ ہم نے پھر تانگہ کیا اور اسٹیشن پہنچ گئے۔ میں نے ٹرینوں کا وقت معلوم کیا اور ٹکٹ خرید کر نور کو زنانہ ویٹنگ روم میں بٹھا کر خود باہر آ گیا۔ یہاں ہمیں تقریباً پون گھنٹے بعد ایک ٹرین ملنا تھی۔ میں نے یہ وقت بڑے عذاب میں کاٹا۔ ٹرین کی آمد کے ساتھ ہی اسٹیشن پر بھگدڑ مچ گئی تھی۔ میں نے زنانہ ویٹنگ روم سے نور کو بلایا اور مطلوبہ ڈبے میں سوار ہو گیا۔

گاڑی پندرہ منٹ تک اسٹیشن پر کھڑی رہی۔ اس دوران میری نگاہیں مسلسل اسٹیشن کا جائزہ لے رہی تھیں' ایک نامعلوم سا خوف مجھے اندر سے دبوچے ہوئے تھا کیوں کہ یہ ٹرین کراچی سے آ رہی تھی۔ پندرہ منٹ بعد جب گاڑی نے وسل دی اور رینگنے لگی تب جا کر مجھے سکون ہوا۔ رفتہ رفتہ گاڑی نے اسپیڈ پکڑ لی۔ نور کھڑکی سے لگی بیٹھی تھی اور باہر تیزی سے گزرنے والے مناظر کو دیکھ رہی تھی۔ ہمارے ڈبے میں زیادہ لوگ نہ تھے۔ اس لیے میں سامنے کی برتھ پر لیٹ گیا۔ نور کو بھی میں نے اوپر برتھ پر لیٹ جانے کو کہا۔ اس طرح ہم کافی حد تک محفوظ بھی ہو گئے تھے۔ مجھے تو لیٹتے ہی نیند آ گئی تھی معلوم نہیں نور بھی سوئی یا نہیں۔

میری آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرے سامنے والی برتھ خالی تھی۔ میں نے نیچے جھانک کر دیکھا نور وہاں بھی نہیں تھی۔ میں بوکھلا کر نیچے اتر آیا۔ اس کی چادر کھڑکی کے پاس ایک کونے میں رکھی تھی۔ چادر کے نیچے تھیلا بھی تھا مگر نور کہاں گئی؟ میں نے آگے بڑھ کر پیچھے والی سیٹوں پر دیکھا جہاں دو عورتیں' ایک مرد اور تین بچے کھانا کھا رہے تھے۔ نور وہاں بھی نہ تھی۔ وہ مرد مجھے عجیب سی نگاہوں سے گھورنے لگا۔

"سنئے........ یہاں........ میری بیوی تھی؟"

"وہیں ہو گی مسٹر' یہاں آپ کی بیوی نہیں ہے"۔ اس نے غصے سے جواب دیا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

میرے سوتے ہی کئی اسٹیشن آئے ہوں گے۔ ممکن ہے کہیں اتر گئی ہو۔ اسی خیال نے مجھے مزید بوکھلا دیا۔ میں تو فاریہ سے کہہ چکا تھا کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ اب اگر تنہا گیا تو وہ مجھے جمال سمجھے گی۔ میں نے سر تھام لیا۔ میرے اوپر جو افتاد پڑتی ہے وہ اپنی نوعیت کی انوکھی ہوتی ہے۔ لگتا ہے جیسے میں کسی دلدل میں پھنس گیا ہوں۔ جتنا نکلنے کی کوشش کرتا ہوں' اتنا ہی اس میں دھنستا چلا جاتا ہوں۔ اس وقت تو میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اپنے بال نوچ ڈالوں۔ کس مصیبت سے تو میں وہاں سے نکل کر آیا تھا اور اب ایک نئی مصیبت میرے سر پر کھڑی تھی۔ مجھے نور سے کسی ایسی بے وقوفی کی توقع نہ تھی کہ وہ خود ہی کسی اسٹیشن پر اتر جائے گی۔ ایسے حالات میں تو اسے تنہا ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اب صرف ایک ہی بات رہ گئی تھی کہ کسی نے اسے زبردستی اتار لیا ہو' مگر کس نے؟ یہ ایک سوال تھا جس کا جواب مجھے کافی دیر گزر جانے پر بھی نہیں سوجھا میرا دم گھٹنے لگا اور میں نے گھبرا کر اپنا سر کھڑکی سے باہر نکال لیا تاکہ تازہ ہوا سے پھیپھڑوں کو بھر سکوں۔

میں نے جوں ہی سر باہر نکالا گھبرا کر پھر اندر کر لیا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ لمحے کے سوویں حصے میں میری نگاہوں نے جو دیکھا ہے وہ حقیقت ہے یا میرا خوف حقیقت بن کر میرا منہ چڑا رہا ہے۔ میری ہمت نہ ہوئی کہ میں اس کی تصدیق کے لیے دوبارہ سر باہر نکال کر دیکھوں۔ پھر میں نے سامنے پڑی چادر کو سر اور چہرے پر اس طرح لپیٹ لیا جیسے پردہ کرنے والی عورتیں لپیٹتی ہیں اور ڈرتے ڈرتے سر کو پھر باہر نکال کر اس جانب جھانکا۔ وہ حقیقت تھی۔ وہ ان دو میں سے ایک شخص تھا جسے میں نے جمال کی کوٹھی کے باہر دیکھا تھا اور جس نے نور سے ساتھ چلنے کی اجازت مانگی تھی۔

یہ تصدیق کرنے کے بعد میرا تو دم ہی نکل گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ نور کو بھی وہی لوگ لے گئے ہوں گے' ممکن ہے نور نے اب تک انہیں میرے بارے میں نہ بتایا ہو۔ بہرحال اب مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا فوراً ہی کرنا تھا۔ یہ بات میں جانتا تھا کہ اب اگر میں ان لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا تو شاید زندہ نہ بچ سکوں مگر مسئلہ یہ تھا کہ اتنی تیز رفتار ٹرین سے کودنا یا فرار ہونا بھی میرے لیے ناممکن تھا پھر بھی میں نے نور کی چادر اپنے گرد لپیٹ لی اور تھیلا بغل میں دبا کر چوکنا ہو کے بیٹھ گیا۔ اب میری نگاہیں کھڑکی سے باہر اندھیرے میں بھٹک رہی تھیں۔ میں باہر کسی آبادی یا اسٹیشن کے آثار دیکھنے کی تمنا لیے دم سادھے بیٹھا

تھا۔ مجھے یہ تو اطمینان تھا کہ ٹرین رکے بغیر وہ لوگ کبھی مجھ تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ٹرین کی رفتار کم ہوتے ہی اسٹیشن آنے سے پہلے ہی دوسری جانب کود جاؤں گا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک ٹرین اپنی پوری رفتار سے دوڑتی رہی تب کہیں جا کر میں نے دور سے روشنیوں کو جگمگاتے دیکھا۔ میں چوکنا ہو گیا عین اسی لمحے میں اپنے سامنے نور کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"آپ اٹھ گئے ہیں میں سمجھی تھی کہ اب لاہور جا کر ہی آپ کو قلی کے ہاتھوں اتروانا پڑے گا"۔ وہ بڑی معصومیت سے بولی' وہ مجھ پر گزرنے والے عذابوں سے قطعی ناواقف تھی۔

"کہاں چلی گئی تھیں تم؟" میں نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

میرے اس غیر متوقع رویے سے وہ ششدر رہ گئی۔ "وہ........... وہاں اگلے ڈبے میں لڑکیاں لوڈو کھیل رہی تھیں' وہاں چلی گئی تھی۔ آپ تو سوئے ہوئے تھے مگر مجھے نیند نہیں آ رہی تھی"۔

میں اس کی معصومیت کے آگے بے بس ہو گیا۔ اس پر غصہ کرنا میری زیادتی تھی۔ بھلا اسے کیا معلوم تھا کہ میں نے یہ دو گھنٹے کس طرح گزارے ہیں اور کیا کچھ جان گیا ہوں۔ یہ احساس ہوتے ہی میں ٹھنڈا ہو گیا۔ اسے ٹرین کی رفتار کم ہونے سے پہلے ہی تمام حالات سے آگاہ کرنا ضروری تھا تاکہ وہ خود کو تیار کر سکے۔ لہٰذا میں نے اسے اپنے پاس بٹھا کر بتا دیا کہ ان دو پہرے داروں میں سے ایک اسی ٹرین میں موجود ہے۔ وہ یہ بات سنتے ہی فق ہو گئی۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ اب میرا پروگرام کیا ہے۔ کچھ لمحوں بعد ہی اسے حالات کی سنگینی کا احساس ہو گیا۔ اس نے خود کو بڑی جلدی سنبھال لیا مگر خوف اس کے چہرے پر جم کر رہ گیا تھا۔ شاید وہ بھی جانتی تھی کہ ان لوگوں کے ہاتھ لگ جانے کا کیا مطلب ہے۔

"نور دیکھو.......... اگر ہمیں مرنا ہی ہے تو ہم جرأت سے موت کا مقابلہ کرتے ہوئے مریں گے ورنہ ان لوگوں کے ہاتھوں چوہے کی موت مرجانا میں پسند نہیں کروں گا۔ ویسے بھی ہلکی رفتار میں ٹرین سے کود جانے میں کم از کم ایک فیصد تو زندہ رہ جانے کا امکان

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

ہے اگر ان کے ہتھے چڑھ گئے تو..........."

"نہیں سر......... میں چلتی ٹرین سے کود کر مرجانے کو ترجیح دوں گی........." اس نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

"شاباش، تم ہمت کرو، خدا ہماری مدد کرے گا"۔

"آپ فکر نہ کیجیے سر......... مجھے خدا پر پورا یقین ہے، وہی اب تک ہماری مدد کرتا رہا ہے اور آئندہ بھی انشاء اللہ وہ ہماری مدد کرے گا اور اگر ہماری قسمت میں موت ہے تو بھی اسے قبول کرلینا انسان کی بے بسی ہے، سو ہم بھی یہاں بے بس ہوں گے"۔

"چلو پھر اس طرف چلو۔ ہمیں دوسری طرف سے کودنا ہے، کیوں کہ اسٹیشن سیدھے ہاتھ پر آئے گا، روشنیاں بھی اس طرف زیادہ ہیں۔ ہمیں الٹے ہاتھ والے دروازے کے قریب رہنا چاہیے"۔ یہ کہہ کر میں اور نور ٹوائلٹ کے ساتھ بنے ہوئے دروازے کے پاس آ گئے۔ ٹرین کی رفتار اب کچھ کم محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ ٹھنڈی ہوا کا تیز جھونکا ہم دونوں کو کپکپا گیا۔ پہلے میں نے سوچا کہ چادر نور کو اوڑھا دوں تاکہ وہ مجھے بے حس یا خود غرض نہ سمجھے۔ مگر یہ سوچ کر ایسا نہیں کیا کہ چادر میں لپٹ کر کودنا اس کے لیے مشکل بھی ہو سکتا اور خطرناک بھی ٹرین کی رفتار ابھی اتنی کم نہیں ہوئی تھی کہ میں کودنے کی ہمت کرتا۔

روشنیاں اب قریب آتی جا رہی تھیں۔ رفتار مزید ہلکی ہو گئی تھی۔ جس طرف ہم کھڑے تھے وہاں پٹریوں کے بیچوں بیچ ایک پرانی سی عمارت بنی ہوئی تھی اور اس عمارت کی کھڑکی سے سرخ رنگ کی بتی ہلتی نظر آ رہی تھی۔ غالباً کوئی شخص سرخ رنگ کی لالٹین ہلا کر ٹرین کو رک جانے کا سگنل دے رہا تھا۔ یہ ہمارے لیے بہتر ہی تھا۔ ٹرین کی رفتار مزید ہلکی ہو گئی۔ اب یہ رفتار ایسی تھی کہ میں کود سکتا تھا۔ میں نے نور کو ہدایت کی کہ وہ ٹرین سے کودتے وقت اپنا منہ سامنے کی طرف رکھے یعنی اس طرف جس طرف ہماری ٹرین جا رہی ہے اور جسم کا سارا زور بھی اس طرف کو لگائے۔

نور نے سر ہلایا اور میں نے اسے بتایا کہ جس عمارت سے سرخ روشنی دکھائی جا رہی ہے اس سے کچھ پہلے ہی اسے کودنا ہے تاکہ عمارت میں موجود شخص ہمیں نہ دیکھ سکے اور اس عمارت سے ہمارا فاصلہ اتنا نہ ہو کہ پہنچنا مشکل ہو جائے کیوں کہ وہ عمارت ہمارے

چھپنے کی بہترین جگہ تھی۔ ورنہ اسٹیشن پر گاڑی ٹھہر جانے کے بعد ممکن ہے وہ لوگ ہمیں زیادہ سرگرمی سے تلاش کرتے۔

میری تمام باتوں کو نور نے سمجھ لیا تو میں کودنے کے لیے تیار ہو گیا اور پھر اس عمارت سے کوئی پچاس گز کے فاصلے پر میں نے اللہ کا نام لے کر چھلانگ لگا دی۔ زمین سے ٹکرا کر میری آنکھوں میں ستارے ناچ گئے اور سب کچھ گھومتا ہوا محسوس ہوا مگر ایسی حالت میں بھی میں قلابازیاں کھا کر سیدھا ہو گیا۔ میری نگاہیں اس دروازے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ جہاں نور کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے زمین سے اٹھنے کی کوشش نہیں کی کہ کسی کی نگاہ میں نہ آ جاؤں۔ ٹرین کچھ ہی دور گئی ہو گی کہ میں نے نور کو کودتے دیکھا اور پھر جیسے اسے اندھیرے نے نگل لیا۔

ٹرین اپنی رفتار سے آگے بڑھتی رہی۔ میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر چکرا کر بیٹھ گیا۔ میری دائیں ٹانگ کا گھٹنا درد سے پھٹ رہا تھا۔ شاید گھٹنے سے ٹرین کی پٹڑی ٹکرائی تھی۔ میں نے بیٹھے بیٹھے اسی طرف سرکنا شروع کر دیا۔ جس جگہ میرے اندازے کے مطابق نور نے چھلانگ لگائی تھی۔ ٹرین اب بھی دھیمی رفتار میں چلی جا رہی تھی پھر یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ وہ اسٹیشن پر رکے بغیر گزرتی چلی گئی۔ غالباً یہاں رکنا اس کے شیڈول میں نہ تھا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

میں نے ہمت کی اور کھڑا ہو کر اپنی ٹانگ کو جھٹکے دیے۔ گھٹنے میں اب بھی درد تھا مگر اس کی شدت میں کافی کمی ہوئی تھی۔ میں نے لنگڑا لنگڑا کر آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ اب تک میں نے نور کو اٹھتے نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ وہ ایک گٹھڑی کی صورت میں پٹریوں پر پڑی تھی اور دور سے آتی ہوئی روشنی میں صاف نظر آ رہی تھی۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

"خدایا وہ ٹھیک ہو"۔ میں نے دعا کی اور تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اسے یوں پڑے دیکھ کر میں اپنی تکلیف بھول گیا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو وہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ میں نے اسے چیک کیا وہ زندہ تھی مگر شاید بے ہوش ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے جب مجھ ایسا ہٹا کٹا آدمی چکرا کر رہ گیا تھا تو بھلا وہ نازک سی لڑکی یہ تکلیف کیسے برداشت کرتی۔ میں نے نور کے پاس آنے سے پہلے وہ تھیلا اٹھا لیا تھا جو میرے گرتے ہی میرے

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا تھا۔ میں نے تھرمس میں سے پانی نور کے چہرے پر پھینکا اور اس کے منہ کو کھول کر پانی کے چند قطرے ٹپکائے۔

میں جلد از جلد یہاں سے ہٹ جانا چاہتا تھا۔ ممکن ہے کوئی ٹرین ہی اس پٹڑی پر آ نکلتی یا اس عمارت میں موجود کوئی شخص ہمیں دیکھ لیتا۔ میں چاہتا تھا کہ جس قدر جلد ہو سکے اس عمارت کی آڑ میں ہو جائیں مگر گھٹنے کے درد کی وجہ سے میں نور کو اٹھا کر وہاں تک نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے نور کے رخساروں کو تھپتھپایا اور یہ دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی کہ نور ہوش میں آ رہی تھی۔ میں نے دھیرے دھیرے اسے پکارا تو وہ پوری طرح ہوش میں آ گئی۔

ہوش میں آتے ہی وہ جھٹکے سے اٹھی اور پھر چیخ کر لیٹ گئی۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ وہ عمارت اتنی زیادہ دور بھی نہ تھی۔ ممکن ہے کہ وہاں موجود شخص اس کی چیخ سن لیتا۔ "نور.......... ہمت کرو.......... جلدی.......... پلیز ورنہ.........."

وہ فوراً ہی ساری صورتِ حال سمجھ گئی اور پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر میرا سہارا لیا۔ اس کی بھی ٹانگ میں چوٹ آئی تھی۔ میرے گھٹنے کا درد بھی بڑھ گیا تھا مگر ہم دونوں ایک دوسرے کا سہارا لیے دھیرے دھیرے گہرے اندھیرے کی طرف بڑھنے لگے۔ فی الحال اس عمارت تک پہنچنا ہم دونوں کے لیے ممکن نہ تھا اور لوگوں کی نگاہوں سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ ہم گہرے اندھیرے میں گم ہو جاتے۔

تقریباً بیس منٹ بعد ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں پٹڑیوں کے آخری حصے میں مال گاڑی کا ایک خالی ڈبا تنہا کھڑا تھا۔ ہمیں اس خالی ڈبے کو دیکھ کر خوشی ہوئی تھی۔ باہر ٹھنڈ بھی کافی بڑھ گئی تھی اور رات بھی گہری ہو گئی تھی۔ باقی رات گزارنے کے لیے اس سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی۔ میں نے کسی نہ کسی طرح نور کو اس میں چڑھا دیا اور خود بھی ڈبے میں داخل ہو گیا۔ ڈبے میں عجیب سی بدبو پھیلی ہوئی تھی مگر باقی مصیبتیں اٹھانے سے بہتر تھا کہ ہم یہ بدبو برداشت کر لیتے۔ ڈبے میں گہرا اندھیرا تھا اور اس اندھیرے میں مجھے ایک پچھتاوے نے دبوچ لیا تھا کہ کاش میں لائٹر یا ماچس رکھ لیتا مگر ایسی کسی سچویشن کی ہمیں امید ہی نہ تھی اور جن حالات میں ہمیں وہ عمارت چھوڑنا پڑی تھی اس میں اتنا ہوش کہاں تھا کہ ماچس کا خیال آتا۔

اس گھپ اندھیرے میں اپنی یا نور کی چوٹ کا جائزہ لینا ناممکن تھا۔ میں نے نور کو لٹا کر اسے چادر اوڑھا دی اور خود بھی وہیں کونے میں لیٹ گیا۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟" نور نے کراہ کر پوچھا۔

"معلوم نہیں.......... یہ تو صبح ہی پتا چلے گا"۔

"میرے ٹخنے میں سخت تکلیف ہے سر"۔

"سوری نور.......... میں اس وقت' اس اندھیرے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ خود میرا گھٹنا بھی بری طرح دکھ رہا ہے۔ کسی چلتی ٹرین سے کودنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔" وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے میں آئے دن اس تجربے سے گزرتی رہتی ہوں"۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا.........."

"خیر یہ کیا کم ہے کہ ہم ان لوگوں کے ہاتھ سے بچ گئے اور زندہ بھی ہیں"۔

"ہاں.......... خدا بڑا کریم ہے نور' لوگ سچ کہتے ہیں کہ مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقت ور ہے"۔

اس نے گہرا سانس لیا اور چپ ہو گئی۔

"نور..........!" میں نے اسے پکارا۔

"ہوں!"

"تکلیف زیادہ تو نہیں' میرا مطلب ہے کہ برداشت کے قابل تو ہے نا!"

"ہاں.......... اس تکلیف سے مر تو نہیں سکتی البتہ صبح تک عذاب سہنا پڑے گا"۔

"سہنا تو پڑے گا مگر تکلیف اگر زیادہ ہو تو بتا دینا"۔

"تو کیا کریں گے"۔

"زندہ رہنے کی جدوجہد"۔

"نہیں میرے خیال میں صبح تک برداشت کرنا اتنا مشکل نہیں ہو گا"۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں بھلا کیا جواب دے سکتا تھا۔ میں اتنا بے بس ہو گیا تھا کہ میرے لیے ہلنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرا گھٹنا سوجتا جا رہا

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

ہے۔ یہ سوجن خطرے کی علامت تھی۔ ممکن ہے کہ گھٹنے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو مگر اس وقت تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ہمیں ہر حال میں صبح کا انتظار کرنا تھا۔

پھر ہم دونوں خاموش پڑے رہے۔ کافی دیر گزر جانے کے بعد نور کے ہلکے ہلکے خراٹے گونجنے لگے۔ مجھے کچھ اطمینان ہو گیا کہ اس کی تکلیف کی شدت اتنی نہیں تھی کہ اسے نیند نہ آتی۔ البتہ میرا درد مجھے سونے بھی نہیں دے رہا تھا۔ ویسے بھی میں ٹرین میں اتنی دیر سویا تھا کہ چاہتا بھی تو اب نیند نہ آتی۔ میں یونہی الٹی سیدھی سوچوں میں الجھا رہا اور رات گزرتی رہی۔

شاید صبح دم مجھے کچھ دیر کے لیے نیند آئی تھی۔ میرے گھٹنے کی تکلیف بھی کچھ کم ہو گئی تھی۔ آنکھ اس وقت کھلی جب ٹرین کی آواز نے مجھے نیند میں ہی اچھل جانے پر مجبور کر دیا۔ ٹرین اس قدر تیز رفتاری سے گزری کہ ہمارا ڈبا جھنجھنا گیا۔ نور بھی اٹھ بیٹھی تھی۔ برابر والی پٹڑی سے گزرنے والی ٹرین نے ہمیں صحیح وقت پر اٹھا دیا تھا۔ آسمان پر ملگجا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ چاروں طرف گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ڈبے سے باہر جھانکا۔ دور دور تک کوئی نہ تھا۔

"نور... ہمیں اسی وقت یہاں سے نکل جانا چاہیے"۔

"ہاں نکل تو جانا چاہیے مگر پاؤں کی تکلیف..........."

"تکلیف یہاں بیٹھے رہنے سے تو ختم نہیں ہو گی نا' اس کے لیے ہمیں آبادی کی طرف جانا پڑے گا اور آبادی یہاں سے کافی فاصلے پر ہے کچھ اور برداشت کر سکو تو ہم کسی ایسی جگہ پہنچ جائیں گے جہاں سے سواری مل سکے"۔

نور نے ہمت کی اور میں نے نیچے اتر کر اسے سہارا دے کر اتار لیا۔ میرے گھٹنے کی تکلیف گو کچھ کم ہو گئی تھی مگر ختم نہیں ہوئی تھی۔ مجھ سے دائیں ٹانگ پر زور نہیں ڈالا جا رہا تھا پھر بھی میں نے اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کیا' اظہار کر کے بھی کیا کر لیتا۔

ہم دونوں اسی طرف اتر گئے جہاں کچھ ڈھلوان کے بعد ایک کچا راستہ سا بنا ہوا تھا۔

ہم اس راستے پر چلتے رہے کچھ آگے چل کر راستے کے بائیں جانب ایک نہر شروع ہو گئی تھی۔ میں نے تھرمس میں اس نہر سے پانی بھر لیا اور کچھ دیر ہم اس نہر کے کنارے بیٹھ گئے۔ میں نے اور نور نے ہاتھ منہ دھویا۔ کچھ بسکٹ کھائے اور پھر چلنے کو تیار ہو گئے۔

اب آسمان پر شفق پھیلی ہوئی تھی۔ سورج کی کرنیں آسمان کے کناروں سے لپٹی دھیرے دھیرے سر اٹھا رہی تھیں۔ دور کہیں سے پن چکی کی گھوں گھوں سنائی دے رہی تھی۔ زندگی کی ان آوازوں نے ہمیں بڑا حوصلہ دیا اور ہم ایک نئے حوصلے کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ اسی لمحے دور کہیں سے ماہیا گانے کی آواز سن کر میں اور نور دونوں ٹھٹک کر رک گئے۔ آواز قریب آتی جا رہی تھی اور پھر ہمیں وہ بیل گاڑی بھی نظر آ گئی جو اسی طرف آ رہی تھی۔ بیل گاڑی پر گھاس لدی ہوئی تھی اور اسے چلانے والا بلند آواز سے گیت گا رہا تھا۔

نور کی آنکھوں میں چمک سی بھر گئی۔ وہ بڑے اشتیاق سے اسے دیکھنے لگی۔ نہر کے کنارے لگے درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں پن چکی کی گھوں گھوں اور ماہیا کی لے نے عجیب سا سماں باندھ دیا تھا۔ گاؤں کا یہ ماحول مجھے زمانوں بعد نصیب ہوا تھا۔ میں اپنی تکلیف بھول کر اس ماحول میں کھو گیا۔ میں نے قریبی درخت سے کمر کو ٹکا لیا اور آنکھیں موند لیں۔ بند آنکھوں میں میرا اپنا گاؤں اور اس کے سب منظر واضح نظر آنے لگے۔ بس فرق صرف اتنا تھا کہ سوہنی کے گورے گورے نرم پیروں میں بندھی پائل کی آواز میرے چاروں طرف رقص کرتی محسوس ہو رہی تھی ورنہ یہ سب آوازیں وہی تھیں جو میں نے آنکھ کھولنے کے بعد سے گاؤں سے بھاگ آنے تک سنی تھیں۔

"سر.........وہ قریب آ گیا ہے' اس سے بات کریں یہ ہمیں قریبی گاؤں تک چھوڑ دے"۔ نور نے مجھے چونکا دیا۔

میں درخت کے تنے کو چھوڑ کر راستے کے کنارے آ گیا۔ اسی لمحے اس نے ہمیں دیکھ کر گانا بند کر دیا۔ میں اس کے قریب آنے کا انتظار کرتا رہا۔ اس نے میرے قریب آ کر بیلوں کو روک لیا۔ میں نے سلام کیا اور اسے بتایا کہ ہم میاں بیوی قریبی گاؤں تک جانا چاہتے ہیں اور یہ کہ ہمارے تکلیف ہے۔

"قریبی گاؤں تو بہت دور ہے جی' تکلیف کہاں ہے؟" اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اصل میں ہم منہ اندھیرے نکل گئے تھے۔ راستے میں کھڈ آیا تو دیکھا ہی نہیں دونوں ہی گر پڑے' میرے گھٹنے میں چوٹ آئی اور میری بیوی کے ٹخنے میں"۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"پر تم دونوں کدھر سے آئے ہو' یہاں تو کوئی لاری بھی نہیں آتی"۔

اس کے سوال نے مجھے بوکھلا دیا۔ ہم نہ اس جگہ کے بارے میں جانتے تھے نہ قریبی کسی گاؤں کا نام ہی معلوم تھا۔ "وہ دراصل ہم بہت دور سے آ رہے ہیں۔ ایک ٹرک سے آئے تھے اس نے یہاں راستے میں اتار دیا۔ پتا نہیں یہ کون سی جگہ ہے ہمیں تو لاہور جانا ہے مگر اس تکلیف کی وجہ سے چلا نہیں جا رہا"۔

"لاہور تو بہت دور ہے بادشاہو.......... آگے آٹھ کوس دور چک نمبر ستاون ہے وہاں حکیم مل جائے گا۔ میں اس طرف تو نہیں جا رہا ہوں پر تمہیں ایسی جگہ اتار سکتا ہوں جہاں سے تم آسانی سے چک نمبر ستاون پہنچ جاؤ گے"۔

"شکریہ بھائی یہی کافی ہے"۔ اتنا کہہ کر میں نے نور کو سہارا دے کر بیل گاڑی میں سوار کر دیا اور خود بھی اچک کر بیٹھ گیا۔ بیل گاڑی آگے بڑھنے لگی۔ نور پچھلے حصے میں بیٹھی تھی اور میں اگلی طرف' بیل گاڑی والے کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کا جائزہ لیا۔ وہ پچیس چھبیس برس کا گبھرو جوان تھا چہرے پر بلا کی معصومیت تھی مگر آنکھوں میں تیرتی چمک اس کے ذہین ہونے کا ثبوت تھی۔

ہم خاموشی سے سفر کرتے رہے۔ تقریباً گھنٹا بھر بعد ہم ایک گاؤں کے قریب پہنچ گئے۔ اس نے گاڑی روک لی۔ "یہاں اتر جاؤ' اس کھیت کو پار کرو گے تو سامنے ہی پگڈنڈی مل جائے گی۔ گاؤں میں جا کر کسی سے بھی حکیم محمد حسین کا پتہ کر لینا۔ اچھی دوا دیتا ہے"۔

میں اس کا شکریہ ادا کر کے نیچے اتر گیا۔ نور بھی اتر چکی تھی۔ بیل گاڑی والا واپس مڑ گیا۔ میں اور نور گنے کے اس کھیت کی طرف بڑھنے لگے جو دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اچانک بوندیں پڑیں تو میں حیران ہو گیا۔ بادل اچانک ہی گھر آئے تھے اور موٹی موٹی بوندیں گرنے لگی تھیں۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تقریباً دس گز کے فاصلے پر ایک گھنا درخت تھا جس کے نیچے سیمنٹ کا ایک چوڑا چبوترا سا بنا ہوا تھا۔ میں نے نور کا ہاتھ پکڑا اور اس کے نیچے پہنچ گیا۔ پانی تو یہاں بھی ٹپک رہا تھا مگر کم تھا۔ بارش اب تیز ہو گئی تھی۔ آسمان گہرے بادلوں میں چھپ کر رہ گیا تھا۔ بارش کم ہونے کا کوئی امکان نہ تھا اور آبادی ابھی کافی دور تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ہمیں کھیت میں کچھ اور لوگ بھی نظر آ گئے جو

بارش میں بھیگتے ہوئے کسی پناہ کی تلاش میں بھاگ رہے تھے۔ ہم دونوں میں بھاگنے کی ہمت ہوتی تو ہم بھی یہ کوشش ضرور کرتے مگر ہم دونوں ہی مجبور تھے اس لیے درخت کے تنے سے کمر ٹکا کر بیٹھ گئے۔ میں نے نور کے ٹخنے کا جائزہ لیا۔ ٹخنے پر بڑا سا نیل پڑا ہوا تھا اور وہ کافی سُوج گیا تھا۔ میرے گھٹنے کی سوجن تو کم ہو گئی مگر تکلیف میں چلنے کی وجہ سے اضافہ ہی ہوا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے تک تیز بارش ہوتی رہی اور پھر جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی اسی طرح اچانک بند ہو گئی اور بادل تیز ہواؤں کے زور پر اڑتے ہوئے دوسری طرف پہنچ گئے کہیں کہیں سے سورج کی کرنیں جھانکنے لگیں اور آسمان نکھر گیا۔ یہ خوب صورت منظر بھلا شہر میں کہاں نظر آتے تھے۔ وہاں تو کثیف دھوئیں میں لپٹی فضا اور سر اٹھائے آسمان کی طرف تکتی ہوئی اونچی اونچی عمارتیں دم گھونٹنے لگتی تھیں۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ میں ان کھلی اور صاف فضاؤں کو چھوڑ کر شہر جاؤں مگر فاریہ اور سوہنی کی پریشان صورتیں میری نگاہوں میں چکرانے لگتی تھیں اور میں خود کو مجبور پاتا تھا۔

فاریہ کا خیال آتے ہی میرے ذہن میں ہزاروں باتیں گھومنے لگیں۔ میں اس سے کہہ چکا تھا کہ میں فوراً پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں اور یہ بھی بتا چکا تھا کہ میں سفر میں ہوں۔ اس لحاظ سے تو آج مجھے لاہور پہنچ جانا چاہیے تھا۔ میں جانتا تھا کہ فاریہ کی پریشانی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جائے گی۔

اب پوری طرح سورج کی کرنیں پھیل چکی تھیں' بادل برس کر کہیں دور جا چکے تھے۔ پانی زمین میں جذب ہو چکا تھا۔ میں نے نور سے پوچھا کہ وہ خود میں چلنے کی ہمت پاتی ہے یا نہیں۔ وہ بیچاری سر ہلا کر چبوترے سے اتر آئی۔ اسی لمحے میری نگاہ زمین پر رینگتی ہوئی مخملی بیر بہوٹی پر پڑی' اگر میں اسے نہ دیکھ لیتا تو وہ بیچاری میرے پاؤں تلے آ کر کچلی گئی ہوتی۔ میں نے جھک کر اس مخملی اور خوب صورت کیڑے کو اٹھا لیا اور اسے اپنی ہتھیلی پر رکھ کر نور کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

"دیکھو کتنی خوب صورت ہے.......... یہ بھلا شہر میں کہاں ہوں گی"۔ یہ کہہ کر میں نے سر اٹھا کر نور کو دیکھا۔ وہ سکتے کے عالم میں میری ہتھیلی پر رینگتی ہوئی بیر بہوٹی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں' رنگ سفید ہو رہا تھا اور وہ دھیرے دھیرے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

چبوترے پر بیٹھ رہی تھی۔

"نور........... کیا بات ہے........... کیا ہوا نور؟" میں نے گھبرا کر پوچھا اور بیر بہوٹی زمین پر پھینک کر اس کے قریب آیا۔ "کیا تکلیف بڑھ گئی ہے؟"

"نہیں........... یہ........... یہ بیر بہوٹیاں........... ہٹا دو انہیں........... مار دو........... مار دو..........." وہ ایک دم چیخ پڑی۔

"نور........... نور کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"پتا نہیں سر........... یہ بیر بہوٹیاں ہمیشہ مجھے خوف زدہ کرتی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے........... جیسے........... اوہ..........." اس نے ایک دم اپنا سر تھام لیا۔

مجھے یاد آ گیا کہ وہ اس سے پہلے بھی مجھے بتا چکی تھی کہ وہ خواب میں ان بیر بہوٹیوں کو دیکھتی رہی ہے۔ "مگر نور یہ تو بے حد خوب صورت اور بے ضرر کیڑے ہیں، تم ان سے خوف زدہ کیوں ہو؟"

"پتا نہیں........... مگر یہ جگہ..........." اس نے سر گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ "یہ بیر بہوٹیاں........... اور........... اور یہ چبوترا........... ہاں........... ہاں میں پہلے بھی یہاں آ چکی ہوں، میں شاید اس جگہ سے واقف ہوں سر"۔ وہ ایک اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اوہ........... نور یاد کرو شاید یہاں تمہارا ماضی چھپا ہوا ہو۔ یاد کرو نور، یہ جگہ........... تم اس سے پہلے کبھی تھیں یہاں؟"

"نہیں........... میں تو ہوش سنبھالنے کے بعد ہی سے اس کوٹھی میں قید ہوں سر پھر........... یہ جگہ........... میرے ذہن میں کانٹے سے چبھ رہے ہیں، آپ شاید ٹھیک کہتے ہیں، ممکن ہے یہاں میرا ماضی چھپا ہوا ہو"۔ وہ اس طرح بول رہی تھی جیسے سوتے میں بول رہی ہو۔ اس کی نگاہیں اب بھی اپنے چاروں طرف چکرا رہی تھیں۔ "میں ان بیر بہوٹیوں سے کیوں ڈرتی ہوں سر؟"

"کوشش کرو نور"۔

"اس نے سر تھام لیا"۔ "نہیں یاد آتا..........."

"وہ خواب یاد کرو جو تم نے مجھے سنایا تھا"۔

"اس خواب میں بھی تو کوئی واضح بات نہیں ہوتی سر، بس یہ بیر بہوٹیاں سی رینگتی

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

نظر آتی تھیں اور پھر........... پھر ماں کا چہرہ سامنے آ جاتا تھا"۔

"ماں؟" میں چونک گیا۔

"محمد بخش کی بیوی سر........... میں ماں کی حیثیت سے اسے ہی جانتی ہوں"۔

"اوہ........... خیر چھوڑو ان باتوں کو........... جھٹک دو ذہن سے، جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا"۔ کہنے کو تو میں نے اسے یہ بات کہہ دی تھی مگر خود میرے ذہن میں بھی کانٹے سے چبھنے لگے تھے۔ نہ معلوم کیا بات تھی جو مجھے عجیب سی کیفیت میں مبتلا کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے میرا ذہن کوئی خاص بات یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو مگر وہ کیا بات تھی، یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"چلو نور........... ابھی ہمیں بہت سفر کرنا ہے، اس تکلیف سے جان چھڑانی ہے"۔ میں نے الجھے ہوئے ذہن کو بھول جانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

نور اٹھ گئی۔ اس کی نگاہیں اب بھی خلا میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ میں اس کا ہاتھ تھامے ہوئے پھر اسی پگڈنڈی کی طرف چل پڑا جو گاؤں کو جاتی تھی۔ ابھی ہم گاؤں سے کافی فاصلے پر تھے کہ ہمیں ایک بیل گاڑی مل گئی جو اسی گاؤں کو جا رہی تھی۔ میں نے اسے روک کر بیٹھ جانے کی اجازت لی، بیل گاڑی والے کو کرائے کی پیشکش بھی کی تھی مگر اس نے انکار کر دیا کیوں کہ وہ اسی گاؤں جا رہا تھا ہم دونوں بیل گاڑی میں بیٹھ گئے، بیل گاڑی والا ایک شفیق بوڑھا تھا۔ اس نے ہماری تکلیف کے بارے میں سن کر ہمیں ایک دو روز اپنے گھر مہمان رہ جانے کی دعوت بھی دی اور ہمیں سیدھا حکیم کے پاس لے گیا۔

حکیم نے میرے گھٹنے اور نور کے ٹخنے کا اچھی طرح معائنہ کر کے دوا ملی اور چوڑی پٹی سے کس کر باندھ دیا۔ اس کے ملنے سے کافی آرام آیا تھا۔ شاید کوئی پٹھا چڑھ گیا تھا جو مساج کی وجہ سے ٹھیک ہو گیا۔ نور نے بتایا کہ اس کی تکلیف بھی کچھ کم ہے حکیم صاحب نے ہمیں دو روز کی دوا دے دی اور ہم اسی بوڑھے کے ساتھ اس کے گھر آ گئے کیوں کہ وہ بوڑھا وہیں حکیم صاحب کے گھر ہمارے ساتھ بیٹھا رہا تھا اور بہ ضد تھا کہ اس حالت میں ہمیں سفر نہیں کرنا چاہیے۔ کہتا تو وہ ٹھیک ہی تھا، یہ بات بڑی غنیمت تھی کہ ہمیں کچھ دیر آرام کرنے کے لیے چھت بھی میسر آ گئی تھی۔

میں اور نور اس کے ساتھ اس کے گھر پہنچ گئے جہاں اس کی بیوی اور ایک بیٹی کے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

سوا کوئی اور نہ تھا۔ بوڑھے کی طرح اس کی بیوی اور بیٹی بھی ہم سے بڑی محبت کے ساتھ ملیں اور بہت جلد ہم سب آپس میں گھل مل گئے۔ کھانا کھا کر میں تو سو گیا اور شام کو اٹھا مگر نور اس کی بیٹی کے ساتھ گھومتی پھری۔ شام کو اس نے مجھے بتایا کہ وہ یہاں کے بہت لوگوں سے مل آئی ہے۔ "سر! یہاں کے سبھی لوگ بہت اچھے ہیں اور یہ........... یہ گاؤں' اس میں بنے مٹی کے یہ کچے گھروندے اور ان میں سے اٹھتی ہوئی سوندھی سوندھی خوشبو تو میرے سارے وجود میں بس گئی ہے"۔

"اصل میں تم نے اپنی تمام زندگی پکے پتھر کی بنی ہوئی اس کوٹھی میں گزاری ہے' جہاں انسان بھی پتھر ہی لگتے تھے۔ تم نے باہر کے لوگوں کو دیکھا ہی کب تھا نور کہ تمہیں اچھے اور برے کے معیار کا پتا چلتا"۔

"جی سر........... مگر........... کچھ ہے' کوئی ایسی بات' جو مجھے بے خود کیے ہوئے ہے"۔ اس نے خواب آلود لہجے میں جواب دیا۔

میں نے غور سے نور کو دیکھا۔ وہ بہت بدلی بدلی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ افسردگی' وہ خاموشی جو اس کی شخصیت کی پہچان بن گئی تھی کہیں فضاؤں میں تحلیل ہو چکی تھی اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار بھی نہیں تھے شاید اس کا ٹخنہ ٹھیک ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھتا' وہ بوڑھا' جسے اب میں اور نور بابا کہنے لگے تھے آ گیا۔

"ہاں پُتر اب ٹھیک ہے تیرا پاؤں؟"

"جی بابا' بہت بہتر ہے' بابا آپ کو ہماری وجہ سے کافی پریشانی ہو گئی"۔

"او نہ پُتر........... ایسی باتیں نہ کیا کر' تیری اور تیری بیوی کی وجہ سے اس گھر میں رونق آ گئی ہے ورنہ تو یہ آنگن جانے کب سے سنسان پڑا تھا"۔

"سنسان........... کیوں بابا' تیری بھی تو بیٹی ہے نا؟"

"ہاں بیٹی تو ہے پر رونق تو زمانوں پہلے ہی رخصت ہو گئی تھی"۔

"میں سمجھا نہیں بابا..........."

اسی وقت بابا کی بیٹی شادو بھی آ گئی۔

"چل باہر چلتے ہیں پھر سمجھاؤں گا"۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ سونے سے طبیعت کی ساری کسلمندی ختم ہو گئی تھی۔ ہم باہر چلے

آئے۔ بابا مجھے لیے آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ بالکل خاموش تھا مجھے اس کی خاموشی سے الجھن سی ہونے لگی تھی۔ وہ اچانک ایک مکان کے سامنے رک گیا۔ مکان کے دروازے پر لگی کنڈی میں بڑا سا تالا جھول رہا تھا۔ بوڑھے نے اپنی صدری کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چابی نکالی اور تالا کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ "یہ میرے بھائی کا گھر ہے پُتر..........." اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

میں نے چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔ گھر میں رکھی ہر چیز بڑے قرینے سے رکھی تھی لگتا تھا جیسے ابھی ابھی کسی نے صفائی کی ہو۔

"کہاں ہے آپ کا بھائی؟"

"وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اسے اس کے بھائی نے زہر دے کر مار دیا۔"

"کیا مطلب........... آپ کا بھائی........... اس کے بھائی نے زہر دے کر مار دیا........... میں کچھ سمجھا نہیں بابا"۔

"وہ میرا سگا بھائی نہیں تھا۔ میرا سالا تھا........... شادو کا ماموں........... میرا بچپن کا یار' میرا سجن..........."

"مگر کیوں مار دیا اس کے بھائی نے؟"

"لالچ پُتر........... لالچ آدمی کو اندھا کر دیتا ہے۔ ٹھہر میں تجھے شروع سے بتاتا ہوں۔ عنایت اپنے باپ کا بڑا بیٹا تھا۔ بہت جی دار اور نیک آدمی تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی بدمعاش تھا۔ جب تک اس کا باپ زندہ رہا' دنیا بھر کے عیب تھے اس میں۔ شہر میں شادی بھی کر لی مگر ماں باپ یا بھائی کو نہ بتایا مگر جیسے ہی اس کا باپ مرا وہ بیوی کو لے کر گاؤں آ گیا۔ باپ ساری جائیداد بڑے بیٹے عنایت کے نام کر گیا تھا۔ اسے چھوٹے بیٹے سے نفرت تھی مگر جب امانت واپس گاؤں آیا تو عنایت نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اسے زمین دی' مکان دیا' اس کے گھر کا خرچا بھی دیتا تھا۔ اس کا ہر طرح سے خیال رکھتا تھا پھر بھی وہ مطمئن نہیں تھا اور عنایت کی دولت ہتھیانے کے چکر میں رہتا تھا۔ عنایت کا ایک بیٹا تھا اور ایک بیٹی۔ امانت جانتا تھا کہ عنایت کی موت کے بعد اسے کچھ نہ مل سکے گا اور اس کا بیٹا اس کی جائیداد کا وارث بن جائے گا' بیٹی کا رشتہ مانگا تو عنایت نے کہا کہ وہ فیصلہ بچوں کے بڑے ہو جانے کے بعد کرے گا۔ ابھی امانت کا بچہ بھی چھوٹا تھا اور شانی بھی۔ مگر پتر...........

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

قدرت نے عجیب دکھ دیا کہ وہ شانی کے ہوتے ہوئے بھی اس سے محروم ہو گیا۔ شانی ایک روز اپنے بھائی کے ساتھ گھومنے گئی تو............ پھر کبھی واپس نہ آئی۔ اسے گاؤں کے چپے چپے میں تلاش کیا گیا۔ مگر جانے اسے آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔

شانی کے دکھ نے عنایت کی بیوی کو بستر سے لگا دیا‘ تبھی عنایت نے اپنے بیٹے کے لئے میری بیٹی شادو کو مانگ لیا اور مجھ سے التجا کی کہ میں شادو کو شانی کی ماں کے پاس چھوڑ دوں۔ میں نے بچپن ہی میں اپنی شادو کا نکاح عنایت کے بیٹے سے کر دیا ورنہ برادری والے باتیں بناتے‘ مگر یہ ترکیب بھی عنایت کی بیوی کو نہ بچا سکی۔ وہ مہینا بھر میں ہی جان دے بیٹھی۔

عنایت پر غموں کے پہاڑ ٹوٹ گئے تھے۔ جانے اس نے بیٹی اور پھر بیوی کا صدمہ کیسے برداشت کیا مگر وقت کسی کی بڑھتی ہوئی تکلیف پر ٹھہرتا تو نہیں‘ گزرتا ہی چلا جاتا ہے‘ سو گزر گیا۔ عنایت کا بیٹا جوان ہو گیا۔ میں نے عنایت کی تنہائی کی وجہ سے شادو کو رخصت کرنے کا فیصلہ کر لیا مگر............ اسی روز معلوم ہوا کہ امانت نے اپنے بھائی اور بھتیجے کو کھانے میں زہر دے دیا ہے عنایت کا بیٹا اتفاق سے بچ گیا کیوں کہ اس نے کھانا نہیں کھایا تھا مگر عنایت کے بدن میں زہر سرایت کر گیا۔ اسے اس کا بیٹا اسپتال لے گیا مگر وہ بچ نہ سکا۔ اور پھر............ چچا کے ڈر سے بھتیجا بھی گاؤں چھوڑ کر بھاگ گیا۔

وہ میری بیٹی کا سہاگ............ میری شادو کا خاوند............ جانے وہ دنیا میں ہے یا اس ظالم نے اسے بھی مروا دیا مگر............ وہ زندہ ہوتا تو ایک بار تو میرے پاس تو آتا............ مجھے خبر تو کرتا............ میری بیٹی کی مانگ تو بھرنے سے پہلے ہی اُجڑ گئی پُتر‘ اور اسی دن سے میرے گھر میں ویرانی نے بسیرا کر لیا۔ ہمارے ہاں ویسے بھی دوسری شادی نہیں ہوتی اور پھر شادو............ خدا نہ کرے وہ بیوہ ہو‘ مگر پھر بھی............"

وہ بولتا رہا میرے سر میں دھماکے ہوتے رہے۔ یہ تمام کہانی میری سنی ہوئی تھی۔

"اوہ بابا............ آؤ............ جلدی!"

"کیا ہو گیا پُتر؟" وہ میرے اس طرح کہنے پر حیران ہو گیا۔

"تم آؤ بابا............" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

اس نے باہر آ کر تالا ڈالا اور میرے ساتھ تیز قدم اٹھانے کی کوشش کرتا ہوا اپنے

گھر تک آ گیا۔ میں نے ایک دم دروازہ کھول دیا۔ وہ سامنے کھڑی تھی۔

اس پر نگاہ پڑتے ہی مجھے یاد آ گیا کہ اسے دیکھ کر مجھے یہ احساس کیوں ہوا تھا کہ میں پہلے بھی اسے کہیں دیکھ چکا ہوں۔ اس میں خان کی مشابہت تھی۔ پلکیں جھپکا کر باتیں کرنے کا انداز تو بالکل خان جیسا ہی تھا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کک............ کیا ہو گیا............ آپ ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟" نور نے ہکلا کر پوچھا اور میرے ساتھ کھڑے ہوئے بابا کو دیکھنے لگی۔

"بابا............ یہ............ یہ شانی ہے!"

"کک............ کیا؟" اس بار بابا ہکلا گئے۔

"جی بابا............ یہ آپ کی بچھڑی ہوئی شانی ہے............ خان کی بہن‘ آپ کی بھتیجی"۔ میں نے بڑے ڈرامائی انداز میں کہا۔

میری بات سن کر بابا اچھل پڑے۔

"تو............ تو مذاق تو نہیں کر رہا پُتر............ میرا دل بہت کمزور ہو چکا ہے"۔

"نہیں بابا............ خدا کی قسم یہ مذاق نہیں ہے"۔ یہ کہہ کر میں نے نور کی طرف دیکھا جو کسی مجسمے کی طرح کھڑی مجھے اور بابا کو تک رہی تھی۔ شاید وہ بھی میری بات کو مذاق ہی سمجھ رہی تھی۔ "شانی!" میں اس سے مخاطب ہوا۔ اسے اپنا یہ نام یقیناً اجنبی لگا ہو گا۔ پھر بھی اس نے میری طرف دیکھا۔ "شانی یہ تمہارے چاچا ہیں............ میں نے تمہارے ماضی کو تلاش کر لیا ہے شانی............ مجھے یاد آ گیا ہے کہ تم بیر بہوٹیوں سے کیوں خوف زدہ تھیں۔ وہی حسین اور مخملی کیڑے تو تمہیں تمہارے اپنوں سے جدا کر گئے تھے۔ خان تمہارے لیے بیر بہوٹیاں تلاش کرنے گیا تھا‘ اسی چبوترے پر بٹھا کر اور تبھی محمد بخش کی بیوی نے تمہیں اغوا کر لیا تھا"۔ میں نے دھیرے دھیرے اسے بتایا مگر وہ یونہی ساکت کھڑی رہی۔

اس دوران میں شادو اور ماسی بھی قریب آ گئیں تھیں۔ یہ سن کر کہ نور ان کی بچھڑی ہوئی شانی ہے۔ ان دونوں کے چہروں پر خوشی برسنے لگی تھی۔ ماسی نے لپک کر نور کو سینے سے لگا لیا۔ شادو بھی اس سے لپٹ گئی۔ بابا خوشی سے بوکھلایا بوکھلایا اِدھر اُدھر ناچ رہا تھا مگر نور سپاٹ چہرہ لیے کھڑی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میری بات پر یقین نہیں کر رہی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

ہے۔ تبھی میں نے ان سب کو اپنے گرد بٹھالیا اور انہیں اپنے محسن "خان" سے ملاقات کے بارے میں بتانے لگا۔

میں نے محسوس کر لیا تھا کہ خان کے ذکر پر شادو کی آنکھوں سے ویرانی ختم ہو کر ان میں دیپ جل اٹھے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسا ہونا قدرتی تھا۔ وہ تینوں ہی خان کی زندگی کے بارے میں مشکوک تھے اور آج انہیں پتا چل گیا تھا کہ وہ نہ صرف یہ کہ زندہ ہے بلکہ ٹھیک ٹھاک ہے اور ایک نہ ایک دن ضرور لوٹ کر آئے گا اور شادو جو اب تک بیواؤں کی سی زندگی گزار رہی تھی ایک دم سہاگن سہاگن سی لگنے لگی تھی۔

میں نے انہیں بتایا کہ خان نے شانی کے بچھڑنے کا قصہ سنایا تھا تو اس کی آنکھوں میں کتنی پیاس تھی۔ اس کو یقین تھا کہ اس کی بہن بھی دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں موجود ہے اور ایک نہ ایک دن وہ اسے تلاش کر لے گا۔

مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ میں نے خان کی بہن کو تلاش کر کے' اسے ان درندوں کی چنگل سے آزاد کر کے اور اسے اس کے اپنوں میں پہنچا کر اپنے محسن کے احسان کا بدلہ اتار دیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ میری زندگی' خان کی مرہون منت تھی' وہ اگر اس روز میری مدد نہ کرتا تو شاید میں اس کے ساتھیوں یا پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن چکا ہوتا۔

مجھ سے خان کی تمام کہانی سننے کے بعد جب بابا نے ایک ایک بات کی تصدیق کر دی تو نور کے بے جان پتلے میں کچھ زندگی محسوس ہوئی۔ وہ اپنے چاروں طرف بیٹھے لوگوں اور مناظر کو یوں دیکھنے لگی جیسے وہ کچھ یاد کر رہی ہو۔

"نور.......... اب تو تمہیں یقین آ گیا نا.......... اور پتا ہے خان تم سے بہت ملتا ہے۔ تمہیں دیکھ کر مجھے کئی بار احساس ہوا تھا کہ تمہارے نقوش جانے پہچانے سے لگ رہے ہیں مگر اس وقت مجھے یاد نہیں آیا تھا اور ویسے بھی مجھے یہ گمان نہ تھا کہ تمہارا خان سے کوئی رشتہ ہو سکتا ہے اور جب تم نے بیر بہوٹیوں والی بات اور خواب سنایا تھا تب بھی میرے ذہن میں کچھ سرسراہٹ ہوئی تھی مگر اس وقت مجھے یہ یاد نہیں آیا تھا کہ یہ بیر بہوٹیوں والی کہانی میں خان سے سن چکا ہوں لیکن آج بابا نے مجھے تمہارے والدین اور بھائی کے بارے میں بتایا اور یہ بتایا کہ ان کی بھتیجی شانی کس طرح غائب ہو گئی تھی تو مجھے سب کچھ یاد آ گیا' بالکل یہی بات میں خان سے سن چکا تھا۔ مجھے خوشی ہے شانی کہ تمہیں

میں یہاں تک بحفاظت لے آیا۔ اگر خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں خان کو کیا جواب دیتا؟"

"وہ.......... کہاں ہیں؟" نور کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ اس کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں اور نچلا ہونٹ کانپ رہا تھا۔

"سوری شانی.......... یہ میں نہیں جانتا مگر یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میری اس سے ملاقات ضرور ہو گی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ پھر مجھ سے ضرور ملے گا اور اب تو میں اسے خود تلاش کروں گا۔ تم فکر نہ کرو جس خدا نے تمہیں تمہارے اپنوں میں پہنچا دیا وہ تمہارے بھائی سے بھی تمہیں ملا دے گا۔"

"پر پُتر یہ تو تُو نے بتایا ہی نہیں کہ تمہیں شانی کہاں سے ملی۔ وہ کون ظالم لوگ تھے جو اس کے ماں باپ کو ایسا ناسور لگا گئے تھے اور تیری اس سے شادی کس طرح ہوئی؟؟" ماسی نے پوچھا جو ابھی تک شانی کا سر اپنے کاندھے پر لگائے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

پھر مجھے ان لوگوں کو نور کی ساری کہانی سنانا پڑی۔ میں نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ نور میری بیوی نہیں بلکہ یہ ڈھونگ ہم نے محض اس لیے رچایا تھا تاکہ لاہور پہنچنے تک کوئی ہم پر شک نہ کرے اور ہم زید کے کتوں سے بچے رہیں جو ہماری بو سونگھتے پھر رہے تھے۔

"سوہنے ربا' تو بڑا کریم ہے.......... ارے ذرا کی ذرا میں سارے دکھ دور کر دیے"۔ ماسی نے جھولی پھیلا کر کہا۔ "اے ربا.......... میرے خان کو بھی ملا دے.......... میری دھی کی خوشی بھی لا دے.........."

"اری اٹھ ری شادو کی ماں.......... تیل کا کپا لے لے۔ میں اگر بتی لے کر آتا ہوں۔ اپنی شانو کو اس کے گھر لے کر جائیں گے' چوکھٹ پر تیل اور پانی ڈالیں گے.......... اگر بتی جلائیں گے۔ اٹھ جا اب اس گھر کی ویرانی ختم ہو جائے گی۔ میں سپارے پڑھواؤں گا اس آنگن میں' لڈو بانٹوں گا پورے گاؤں میں.......... مگر.......... نہیں.........." آخری جملہ کہتے کہتے اچانک وہ چپ ہو گیا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا اور چہرے پر خوف کے گہرے آثار اتر آئے۔

"کیا ہوا بابا!" میں نے چونک کر پوچھا اور ماسی اور شادو کے چہروں پر نگاہ ڈالی۔ یوں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

لگا جیسے وہ لوگ بھی بابا کی بات سن کر ایک دم خوف زدہ ہو گئے ہوں۔ ان کے چہروں پر بھی خوف پھیل گیا تھا۔

"کیا بات ہے بابا.......... مجھے بتاؤ"۔ میں نے ایک دم بابا کے کاندھے پکڑ لیے۔ اس کی نگاہیں خلا میں تیرتی ہوئی میرے چہرے پر آ کر ٹھہر گئیں۔

"پتر.......... اگر امانت کو پتا چل گیا کہ .... شانی .... آ گئی ہے اور خان بھی زندہ ہے تو.........."

اوہ.........." میں نے گہرا سانس لیا۔ نور کے چہرے پر ابھی تک مخمصے کے آثار تھے۔ اب اس کیفیت میں خوف بھی اتر آیا۔ وہ اتنی مشکلوں سے تو ظالموں کے پنجے سے آزاد ہوئی تھی اور یہاں ایک اور ظالم اس کا منتظر نکلا۔

"نہیں بابا.......... تم ابھی کسی کو شانی کے بارے میں نہ بتاؤ بلکہ اسے نور کہا کرو.......... جب خان آ جائے گا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا"۔

"ہاں.......... یہ ٹھیک ہے بابا.........." شادو ایک دم بول اٹھی۔

"اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں"۔ میں نے کہا۔

بات بابا اور ماسی کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ انہوں نے اپنے ارمان دبا لیے تھے۔

"اچھا اب اٹھ جا' پکنے کو بھاجی تو لا دے یا اپنی بھتیجی کو بھوکا مار دے گا"۔ ماسی نے اپنے تئیں مذاق کیا۔

"او نہ کر ایسی گلاں.......... جھلی ایسی بدفال منہ سے نہیں نکالتے۔ رب کرے میری بچی سدا جیتی رہے۔ دنیا کی خوشیاں دیکھے.......... اور بھاجی کیا.......... میں مرغی لاتا ہوں۔ شہر سے آئی ہے میری بچی' بھاجی کیوں کھانے لگی"۔ بابا نے نور کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں نور کے لیے بے انتہا پیار تھا۔

"نہیں بابا میں بھاجی کھاؤں گی.........." نور نے دھیرے سے جواب دیا۔ نہ معلوم کیوں اس کے انداز میں اب بھی اداسی تھی۔ اب مجھے اس کی اداسی پر حیرت تھی۔ اسے تو بے حد خوش ہونا چاہیے تھا۔ وہ برسوں کے بعد قطعی اتفاقی طور پر اپنوں میں پہنچ گئی تھی۔

"شانی..........!" میں نے اسے پکارا۔

"ہوں.........." وہ چونک گئی۔ "آپ تو مجھے شانی مت کہئے سر!"

"کیوں.......... تمہیں اچھا نہیں لگا کہ تم اپنی شناخت ڈھونڈ چکی ہو۔ اپنوں کے درمیان ہو اور بہت جلد تم اپنے بھائی سے بھی مل سکو گی!"

"اچھا کیوں نہیں لگے گا سر مگر.........."

"مگر کیا؟"

"سر یہ اجنبیت بڑی جان لیوا چیز ہوتی ہے۔ یہ کس قدر تکلیف دہ بات ہے کہ میں جب تک نور رہی اپنے گرد اجنبیت کے لامتناہی سلسلے کو محسوس کرتی رہی اور اپنی شناخت کھو جانے کا دکھ سہتی رہی اور اب جبکہ مجھے میری شناخت مل گئی ہے تو بھی میں اپنے گرد اسی اجنبیت کو محسوس کر رہی ہوں۔ میں خود سے بحیثیت نور مانوس تھی پھر بھی خود کو تلاش کرنے کی جستجو میں لگی رہی اور اب شانی کے نام کی اجنبیت نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا ہے۔ میں اپنے اس نام یا حیثیت سے بھی انسیت محسوس نہیں کر رہی ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے دو مختلف قسم کی کیفیتیں مجھے دو حصوں میں تقسیم کر دیں گی"۔

"تم اس قدر فلسفیانہ انداز میں بھی سوچ لیتی ہو..........؟" میں نے اس کے جملوں سے نکل کر فضاؤں میں پھیل جانے والی سنجیدگی کو ختم کرنے کے لیے ذرا شوخ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں سر' یہ کچھ اتنا گہرا فلسفہ بھی نہیں کہ جسے بیان نہ کیا جا سکے۔ میں تو جو کچھ محسوس کر رہی ہوں وہی کہہ رہی ہوں۔ ہاں البتہ آپ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ میں اپنی کیفیت بیان کرنے میں مہارت سے کام لے رہی ہوں۔ ممکن ہے عام طور پر لوگ اپنی کسی کیفیت کو بیان کرنے پر قادر نہیں ہوتے۔ اس لیے لوگ ان کی باتوں کو فلسفیانہ نہیں سمجھتے ہوں"۔

"شانی.......... میرا مطلب ہے نور.......... تم اتنی گہرائی میں جا کر نہ سوچو' تمہیں ہرحال میں ان دو شخصیتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے' ایک شخصیت نور' قطعی تنہا ہے' جس کا کوئی تعلق نہ کسی سے ہے اور نہ ہی کسی کا تعلق اس شخصیت سے' جبکہ دوسری شخصیت کا تعلق بلکہ بڑا گہرا تعلق بہت سے لوگوں سے ہے اور ان سب معصوم لوگوں کی خوشیاں تمہاری اس دوسری شخصیت سے وابستہ ہیں۔ تمہیں اس سلسلے میں بہت

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

جلد فیصلہ کرنا ہے۔ میں بھی زیادہ دیر تک یہاں نہیں رک سکتا۔ تمہیں تو تمہاری منزل مل گئی مگر میری منزل ہنوز مجھ سے بہت دور ہے"۔

میرے آخری جملے پر چونک کر اس نے مجھے دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں عجیب سی بات تھی۔

"کیا............ کیا ہوا؟"

"سر............ کہیں آپ نے مجھے میری منزل دلانے کے لیے تو یہ سب............ میرا مطلب ہے کہ............"

"نور............ تم مجھ پر شک کر رہی ہو؟" میں اس کی بات سمجھ گیا تھا۔

"سوری سر............ مگر............"

"میں اب اس سلسلے میں تم سے کوئی بات نہیں کروں گا جو تمہارا جی چاہے فیصلہ کر لو مگر ایک بات یاد رکھنا نور کہ میں خان کو جواب دہ ہوں۔ اگر تم نے کوئی غلط قدم اٹھایا اور میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں یا یہاں سے کہیں اور چلی گئیں تو............ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ اگر خان کو پتا چلا کہ تم مجھے ملی تھیں اور پھر............"

"سر............ میں ایسا نہیں کروں گی مگر............ یہ اجنبیت............"

"بے وقوفی کی باتیں نہ کرو نور' ہر نئی کیفیت اجنبی ہوتی ہے اس سے مانوس ہونا پڑتا ہے تم ان لوگوں کی خوشیوں کو ختم کرنا چاہتی ہو جو تمہیں پا کر بے حد خوش ہیں۔ سوچو اگر انہیں احساس ہو گیا کہ تم یہاں اگر خود کو اور ان کو پا کر غم زدہ ہو تو وہ کیا محسوس کریں گے۔ یہ تمہارے اپنے ہیں نور' انہیں اپنانا تمہارا فرض ہے۔ تم جو زندگی گزارتی آئی ہو وہ قطعی بے حس تھی۔ اب تم زندگی کو صحیح طور پر پرکھ سکو گی۔ اسے پرکھنے کی کوشش تو کرو' اور ہاں سنو............ اب اس موضوع کو کلوز کر دو بہتر ہے۔ دیکھو شادو کتنی خوش ہے۔ خان کی زندگی نے اس کے چہرے کی ویرانی کیسے ختم کر دی ہے............ جاؤ وہ جو اب تک بیواؤں کی سی زندگی گزار رہی تھی اسے سہاگن کر دو۔ اس کے بے رنگ کپڑے اتار کر اسے رنگین لبادے میں لپیٹ دو۔ اس کے ہاتھوں میں چوڑیاں اور کانوں میں موتیا کے بالے پہناؤ۔ تم اس کی نند ہو' تمہارا قرب اسے اچھا لگے گا۔ اس کی تنہا خوشیوں میں شریک ہو کر تم خود بھی خوشی محسوس کرو گی نور' اور دوسروں کی خوشیاں' اپنی خوشیوں

سے بڑھ کر حسین ہوتی ہیں"۔

میری باتوں نے اسے رفتہ رفتہ اپنے گرد و پیش کا احساس دلا دیا۔ وہ مسکرائی اور دھیرے سے بولی۔ "تھینک یو سر............ تھینک یو............"

مجھے خوشی ہوئی کہ اس نے حالات کی نزاکت کو محسوس کر لیا۔ مجھے یقین تھا کہ کچھ ہی روز میں اس پر چڑھا ملمع اتر جائے گا اور وہ بھی کسی تتلی کی طرح گاؤں کی نکھری فضاؤں میں گنگناتی پھرے گی۔ وہ تصنع جو شہر کی زندگی نے اس میں بھر دیا تھا بہت جلد ختم ہو جائے گا۔

نور اٹھ کر اسی کوٹھری میں چلی گئی تھی جہاں کچھ دیر پہلے شادو گئی تھی۔ میں تنہا رہ گیا تو پریشان کن خیالات نے مجھے دبوچ لیا۔ فاریہ کا خیال' زید وغیرہ کا خوف' سوہنی کی پریشانی اور ایسی ہی زہریلی سوچیں مجھے پریشان کرنے لگیں۔ میں مطمئن تھا کہ نور اب محفوظ ہاتھوں میں ہے مگر مجھے بہرحال یہاں سے نکلنا تھا۔ آج ہمیں بابا کے گھر میں دوسرا دن تھا۔ میں نے ان دنوں میں اپنی داڑھی منڈوانی چھوڑ دی تھی تاکہ جب میں یہاں سے نکلوں تو زید اور جمال کے کتے مجھے نہ پہچان سکیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ اب بھی ہم لوگوں کو تلاش کر رہے ہوں گے۔

اب مجھے یہاں سے فوراً ہی نکلنا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگلی صبح میں لاہور کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔ جو کچھ میری قسمت میں لکھا تھا وہ تو ہر حال میں ہونا ہی تھا۔ میرے سوچنے یا پریشان ہونے سے میری قسمت تو بدل نہیں سکتی تھی اور یہی بات تو یہ تھی کہ میں نے خود کو حالات کے تیز دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔

اسی وقت بابا آ گیا۔ وہ بے حد خوش تھا۔ اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ٹوکری ماسی کے حوالے کی اور دونوں ہاتھوں کو ملتا ہوا میرے قریب آ گیا۔

"پتر............ تو نے خان کو دیکھا ہے نا............ وہ کیسا ہو گیا ہے؟"

"وہ بڑا گبھرو جوان ہے بابا' بڑا نڈر' بڑا بہادر' پہاڑوں جیسا مضبوط مگر دل کا اتنا نرم ہے جیسے برف کا گالا ہو"۔

"ہاں............ ہاں میں جانتا ہوں............ وہ بالکل اپنے باپ جیسا تھا۔ اس کے باپ کی ذات میں بڑا دبدبہ تھا پتر' ہر شخص اسے دیکھ کر دبک جاتا تھا پر جب وہ بولتا تھا تو یوں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

لگتا جیسے آسمان سے شبنم گر رہی ہو۔ جب تک امانت نہیں آیا تھا گاؤں میں بڑا سکون تھا۔ چھوٹا موٹا جھگڑا ہو بھی جاتا تھا تو خان کا باپ منٹوں میں فیصلہ کر دیتا تھا۔ اس کے فیصلے انصاف کے ہوتے تھے۔ پتر سارا گاؤں سر جھکا دیتا تھا۔ سب کا نقصان اپنے پلے سے پورا کرنے کو ہر وقت تیار رہتا تھا وہ گبھرو............ پر جانے کیا ہو گیا............ کس کی نظر کھا گئی اس کے بھرے گھر کو؟"

"اللہ نے چاہا تو اب اس کے گھر کا آنگن پھر سے بھر جائے گا بابا............ تم شانی کی کسی اچھی جگہ شادی کرنا' کسی چھیلے اور شریف جوان سے اور جب خان آ جائے نا تب ہی کرنا۔ ورنہ وہ ناراض ہو جائے گا"۔

"ہاں ہاں پتر میں جانتا ہوں کوئی بچہ تو نہیں ہوں۔ وِیر کے بنا بھلا کیسے بہن کی ڈولی اٹھ سکتی ہے' خدا اسے سلامت رکھے' میری شادو کا سہاگ ہے وہ' وہ آ گیا تو میری دونوں بیٹیاں سکھ ڈھویا کریں گی"۔

"آئے گا بابا............ جب میں اسے بتاؤں گا کہ شانی گھر کی دہلیز پر ٹکی اس کا انتظار کر رہی ہے تو وہ ساری دنیا چھوڑ کر آئے گا"۔

"پتر............ تو جلدی سے جا کر اسے بتا دینا............ کہ............ کہ پتر' بہن کے سوا بھی کوئی اس کا انتظار کرتا ہے۔ دو آنکھیں اور بھی ہیں جو ساری ساری رات بند در کو تکتی رہتی ہیں اور ہم بوڑھے ماں باپ ان دو آنکھوں کو تکتے تکتے رات بتا دیتے ہیں"۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے کندھے پر پڑے رومال سے اپنی بوڑھی آنکھوں سے بہتے گدلے پانی کو پونچھ لیا۔

"ہاں بابا............ مجھے احساس ہے' آپ دکھی نہ ہوں میں یہاں سے جاتے ہی اسے تلاش کروں گا اور جلد از جلد یہاں بھیجوں گا"۔

وہ میری بات سن کر دعائیں دینے لگا۔ اس رات ہم نے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ نور نے خود کو ایڈجسٹ کر لیا تھا۔ وہ بھی خوش تھی اور ان سب کی اپنائیت کو پوری طرح محسوس کر رہی تھی۔ میں نے پہلی بار اسی رات شادو کی آنکھوں میں جھلملاتے تارے دیکھے جن سے رنگین روشنی کی کرنیں سی پھوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔ نور نے اس کی خالی کلائیوں میں چوڑیاں اور کانوں میں موتیا کے بالے پہنا دیئے تھے۔ بڑے بڑے پھولوں والا چھینٹ کا

سوٹ اور کناری لگے دوپٹے میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ بابا اور ماسی اسے یوں سنگھار کیے دیکھ کر بے حد خوش تھے۔

"خدا بڑا کریم ہے نیک بختے............" اس نے ماسی کو مخاطب کیا۔ "جب میں ان دونوں کو یہاں لا رہا تھا تو مجھے گمان بھی نہ تھا کہ رب نے دونوں جہاں کی خوشیاں میری جھولی میں ڈال دی ہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ میں انہیں حکیم کے پاس چھوڑ کر چلا آتا۔ مگر میرے مولا کی حکمت تو دیکھ' میرے دل کو اتنا نرم کر دیا کہ مجھ سے ان دونوں مسافروں کی تکلیف دیکھی نہ گئی اور میں نے سوچا کہ یہ دونوں بھلا اس گاؤں میں کہاں جائیں گے اور زخمی حالت میں تو ان کے لیے سفر بھی مشکل تھا بس جانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں انہیں زبردستی یہاں لے آیا۔ سچ ہے کہ ہر کام میں خدا کی مصلحت ضرور ہوتی ہے"۔

ہم سب ایسی ہی باتیں کرتے رہے۔ نور نے بھی خان کے بارے میں ایک ایک بات دوبارہ پوچھی۔ میں ان سب کو خان کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک بات بتا کر ان کی خوشیوں کو دوبالا کرتا رہا۔ وہ سب یوں مجھے گھیرے میری باتیں سن رہے تھے جیسے میں انہیں الف لیلہ کی داستان سنا رہا ہوں۔ وقت گزرتا رہا اور ہمیں احساس بھی نہ ہو سکا کہ رات کتنی ڈھل چکی ہے۔ گاؤں کے لوگ سرِ شام سو جانے کے عادی ہوتے ہیں۔ باہر کتوں کے بھونکنے کی اور چوکیدار کے "جاگتے رہنا" کی صدا نے ہمیں چونکا دیا۔

میں اور نور تو خیر دیر سے سونے کے عادی تھے مگر شادو اور ماسی کی پلکیں بھاری ہو کر آنکھوں پر جھک آئی تھیں۔

"چلو پتر اب سو جاؤ۔ رات بہت بیت چکی ہے"۔ بابا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ نور اور شادو اٹھ کر کوٹھری میں چلی گئیں۔ بابا نے حسبِ سابق اپنا اور میرا پلنگ چھپر کے نیچے ڈال لیا اور ماسی نے موٹے کھیس ہماری پائنتی کو رکھ دیے۔ آج ٹھنڈک کچھ بڑھ گئی تھی۔ میں کھیس اوڑھ کر لیٹ گیا۔ بابا بھی میرے برابر پڑی چارپائی پر لیٹ گیا۔ نیند میری آنکھوں سے دور تھی۔ میں نے اگلے روز کے پروگرام کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اچانک ایک خیال نے مجھے چونکا دیا۔

"بابا............!" میں نے چونک کر اسے مخاطب کیا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"ہاں پُتر.......... بول، میں سن رہا ہوں"۔

"بابا، میں صبح یہاں سے شہر روانہ ہونا چاہتا ہوں"۔

"کیا.......... یہ بات تُو نے پہلے کیوں نہ کہی؟"

"پہلے کب؟"

"شانی کے سامنے.........."

"نہیں بابا.......... میں یہ بات اس کے سامنے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بات یہ ہے بابا کہ وہ مجھے کافی دنوں سے جانتی ہے اور مجھ سے کافی مانوس بھی ہے مگر آپ لوگوں سے.......... میرا مطلب ہے کہ آج ہی اسے پتا چلا ہے کہ آپ سب اس کے اپنے ہیں مگر درمیان کے برسوں کے فاصلوں نے اپنوں کی سی اپنائیت چھین لی تھی بابا.......... وہ دھیرے دھیرے ہی آپ لوگوں کی اور اس ماحول کی عادی ہو گی۔ مجھے ڈر تھا کہ میرے جانے کی بات سن کر وہ ڈر جائے گی۔ ممکن ہے وہ میرے ساتھ جانے کی ضد بھی کرے جبکہ میں اسے یہیں چھوڑنا چاہتا ہوں۔ ایسے خطرناک حالات میں اس کا باہر نکلنا ٹھیک بھی نہیں ہے اور ویسے بھی میں اسے کہاں کہاں لیے پھروں گا"۔

"نہیں نہیں پُتر.......... اسے یہیں رہنا چاہیے.......... مگر.......... تمہیں یوں اچانک غائب دیکھ کر وہ پریشان تو ضرور ہو جائے گی نا!"

"ہاں مگر آہستہ آہستہ وہ آپ سب کی عادی ہو جائے گی"۔

"ٹھیک ہے پُتر.......... دل تو نہیں چاہتا کہ ابھی تمہیں جانے دوں"۔

"نہیں بابا.......... میں آپ کو سب کچھ بتا چکا ہوں۔ میرا لاہور پہنچنا بہت ضروری ہے ورنہ دشمن میری غیر موجودگی میں اپنا کام کر جائے گا"۔

"یہی سوچ کر تمہیں نہیں روک رہا۔ پُتر، جاؤ اللہ بیلی ہے۔" اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"بابا مجھے ایک پرانا سا لباس چاہیے۔ شلوار قمیض اور واسکٹ، ایک موٹی چادر بھی جو مجھے راستے میں سردی سے بچا سکے۔ میں یہ سب چیزیں بازار سے اس لیے نہیں خریدنا چاہتا کہ ان کا نیا پن دشمنوں کو چوکنا کر سکتا ہے"۔

"میں سمجھ گیا پُتر، تُو فکر نہ کر سو جا۔ میں یہ سب چیزیں تجھے صبح سویرے ہی دے

دوں گا اور تجھے اسٹیشن پر بھی چھوڑ آؤں گا۔ اسٹیشن یہاں سے کافی دور ہے"۔

مجھے نیند تو نہیں آئی مگر کچھ ریسٹ ضرور مل گیا۔ میرا ذہن الجھا رہا۔ میں نور کو یہاں چھوڑ دینے پر خوش بھی تھا اور افسردہ بھی بلکہ مجھے یہ پریشانی تھی کہ میں فاریہ کو بتا چکا تھا کہ نور میرے ساتھ ہے مگر میں محض اس معمولی وجہ کی بنا پر اسے اپنے ساتھ خطرات میں نہیں پھنسانا چاہتا تھا۔ یہ ہی بہتر تھا کہ وہ یہاں رہے۔ فاریہ کو میں ویسے بھی کسی وقت حالات سے آگاہ کر سکتا تھا۔ بس مجھے صرف یہی ڈر تھا کہ اس دوران میں جمال وہاں نہ پہنچ گیا ہو۔ یوں تو میں یہ بات فاریہ کو بتا چکا تھا اور وہ اس سلسلے میں محتاط بھی ہو گی مگر وہ بہرحال ایک عورت تھی۔ بیگ صاحب تو پہلے ہی بیمار تھے اور سلطان بہادر ضرور تھا مگر چالاک نہیں تھا جبکہ جمال اور زید کے سلسلے میں بہادر کے علاوہ چالاکی کی بھی ضرورت تھی۔ میں رات بھر یہی دعائیں مانگتا رہا کہ وہ سب جمال اور زید کے شر سے محفوظ رہیں۔

جانے کیا کیا سوچتا رہا اور رات بے آواز قدموں سے گزرتی رہی۔ احساس ہی نہ ہوا کہ سمے بیتا جا رہا ہے۔ اتنی لمبی رات لمحوں میں گزر گئی۔ احساس اس وقت ہوا جب پیڑوں پر بیٹھی چڑیوں نے دھیرے دھیرے چہچہانا شروع کیا اور میری نگاہ آسمان کے سرمئی کناروں پر ٹھہر گئی۔ چڑیوں کا شور ذرا اور بڑھا تو بابا انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا۔ اٹھتے ہی اس نے مجھ پر نگاہ ڈالی اور مجھے جاگتا دیکھ کر مسکرایا۔

"اٹھ گیا پُتر؟"

"سویا ہی کب تھا بابا؟"

"ہیں.......... تیرا مطلب ہے کہ تُو رات سے جاگ رہا ہے!؟"

"دن اور رات کی تمیز ہی ختم ہو گئی بابا پتا ہی نہیں چلتا کہ کب دن ہوا اور کب رات ہو گئی"۔ میں نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا اور اٹھ بیٹھا۔

"او نہ پُتر، یہ تُو نے اچھا نہیں کیا، رات کو سو لینا چاہیے تھا۔ لمبا سفر ہے جانے کیسے گزرے؟" وہ اپنی چادر کو جسم پر لپیٹتے ہوئے بولا۔

"میں جانتا ہوں بابا کہ سفر کیسا گزرے گا اور جب نیند کو آنا ہوتا ہے تو وہ آ ہی جاتی ہے"۔

وہ بڑبڑاتا ہوا پانی کے پمپ کے پاس جا بیٹھا۔ میں بھی اس کے قریب چلا آیا۔ میں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

نے پمپ چلایا اور نلکے سے پانی کی دھار نکلنے لگی۔ بابا نے تشکرانہ انداز میں میری طرف دیکھا اور منہ دھونے لگا۔ منہ ہاتھ دھو کر اس نے اپنی چادر کے کونے سے صاف کیا اور پمپ چلانے لگا۔ میں نے بھی کُلی کی اور منہ ہاتھ دھو کر اٹھ گیا۔

ہماری باتوں کی اور پمپ چلنے کی آواز سے ماسی اٹھ گئی تھی۔ اس نے جلدی جلدی آگ جلائی اور چائے کی پتیلی اس پر چڑھا دی۔ بابا نے اسے بتا دیا کہ میں سفر پر روانہ ہونے لگا ہوں۔ یہ بات سن کر وہ بھی حیران ہو گئی۔ اس نے مجھے ایک دو روز رکنے کو بھی کہا۔ میں نے معذرت کر لی تو وہ شادو اور شانی کو اٹھانے جانے لگی۔ میں نے لپک کر اسے پکڑ لیا اور بابا نے اسے سمجھایا کہ میں نور کے سامنے نہیں جانا چاہتا کیوں کہ ممکن ہے وہ خود بھی چلنے کو تیار ہو جائے۔ بعد ماسی کی سمجھ میں بات آ گئی اور اس نے میرے لیے روغنی روٹیاں ڈالنا شروع کر دیں۔ بابا نے مجھے شلوار' قمیض' واسکٹ اور ایک موٹی چادر کے علاوہ سفید پگڑی بھی دی۔ میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا۔ پگڑی باندھ کر تو میری شخصیت بالکل ہی بدل گئی اور میں قطعی مطمئن ہو گیا۔ داڑھی کے بال بھی اچھے خاصے بڑھ گئے تھے جس نے میرے نقوش کو چھپا دیا تھا۔ شخصیت کی اس تبدیلی نے مجھ میں کافی حوصلہ اور خود اعتمادی بھی پیدا کر دی تھی۔ اب میرا خیال تھا کہ میں کسی سے چھپے بغیر بھی سفر کر سکتا ہوں۔

کچھ دیر بعد میں ناشتا کر کے تیار ہو گیا' ماسی نے سفر کے لیے روغنی روٹی اور رات کی بھاجی باندھ دی تھی۔ تھرمس میرے پاس تھا ہی۔ میں نے اس تھرمس میں گرم گرم چائے بھروالی۔ میں ایک نظر نور کو دیکھنا چاہتا تھا مگر میں نے اپنی اس خواہش کو دبا لیا اور بابا سے رخصت چاہی۔

"رب راکھا پُتر........ خیر نال جا........ پر پہنچنے کے بعد اپنی خیریت ضرور بھیجنا"۔

یہ کہہ کر بابا نے کاغذ کا ایک پرزہ میری طرف بڑھا دیا۔ اس کاغذ میں گاؤں کا پتا اور مکان کا نمبر لکھا ہے پُتر........ چٹھی ضرور بھیجنا ورنہ ہم سب پریشان ہوں گے اور پُتر........ خان کو ضرور بتانا کہ ہم سب اس کے منتظر ہیں........ اور........ وہ شادو........ شانی کا سن کر تو وہ فوراً آئے گا نا؟"

"ہاں بابا آپ پریشان نہ ہوں۔ میں خان کو ڈھونڈ کر یہاں ضرور بھیجوں گا........

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

بس آپ دعا کیجئے کہ میں ان درندوں کے ہاتھ نہ لگ جاؤں۔ منزل پر پہنچ گیا تو یہ میرا وعدہ ہے بابا کہ خان کو آپ کے اور شانی کے بارے میں ضرور بتاؤں گا"۔

"اللہ بیلی پُتر۔ وہ سب کا راکھا ہے۔ سب پر قادر ہے' پُتر مارنے والے سے بچانے والا زیادہ قریب ہوتا ہے"۔

ماسی کی پلکیں بھی بھیگ چکی تھیں۔ مجھے ان کی بے لوث محبت اور خلوص نے بڑا متاثر کیا تھا۔ میں صرف اس بات پر حیران تھا کہ شہروں کی طرف جانے والے رستے گاؤں کی اس بے لوث محبت کو اپنے ساتھ شہروں تک کیوں نہیں لے جاتے جہاں انسان' انسان سے نفرت کر رہا ہے' ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہا ہے' ایک دوسرے کا حق چھین رہا ہے' جہاں نفرتوں کی بیلیں چڑھائی جاتی ہیں۔ عداوتوں کی فصلیں اگائی جاتی ہیں اور سارے موسموں میں صرف اور صرف گناہ کاٹے جاتے ہیں۔ کوئی بھی اس موسم کے بدل جانے کا تمنائی نہیں ہے۔ جہاں اونچا اور بڑا صرف اسے سمجھا جاتا ہے جس کی دیواریں اونچی ہوں' جس کی کوٹھی بڑی ہو جس کی کار لمبی ہو اور بس........ اور گاؤں کے یہ چھوٹے کچے مکانوں میں رہنے والے سیدھے سادے لوگ' جن کے مکانوں کی دیواریں ان کے قدوں سے ذرا سی اونچی ہوتی ہیں وہ اندر سے کتنے بڑے' کتنے اونچے اور کتنے عظیم ہوتے ہیں۔ یہ بابا اور ماسی کی عظمت اور بڑائی ہی تو تھی کہ اجنبی ہوتے ہوئے بھی ہمیں اپنے چھپر تلے پناہ دی۔ یہ تو بعد کی بات ہے کہ نور ان کی بچھڑی ہوئی شانی نکلی ورنہ پہلے روز تو وہ اور ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔

"پُتر ایک پیالہ چائے اور پیتا جا........!" ماسی نے کہا۔

"نہیں ماسی مجھے دیر ہو جائے گی۔ میں سویرے والی گاڑی سے لاہور پہنچنا چاہتا ہوں اور پھر........ اگر نور اٹھ گئی تو........"

"اونہہ اوئے........ چل پُتر تُو سچ کہتا ہے"۔ بابا نے ہاتھ اٹھا کر ماسی کو منع کر دیا اور اپنے گرد چادر لپیٹ کر کھڑا ہو گیا۔

بابا نے اپنی بیل گاڑی نکالی۔ بیلوں کو گاڑی میں جوتا اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ماسی دروازے پر کھڑی تھی۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے خدا حافظ کہا اور بابا نے بیل گاڑی آگے بڑھا دی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

گاؤں میں زندگی کے آثار رینگنے لگے تھے۔ ملگجے اندھیرے میں لوگ بیلوں کو ہانکتے ہوئے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔ گھروں کی چمنیاں دھواں اگل رہی تھیں اور کہیں دور سے پن چکی کی گھوں گھوں گونج رہی تھی۔ میں دل میں خدا کو یاد کرتا ہوا گاؤں کے ان معصوم نظاروں کو اپنی بصارت میں سمیٹ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ نظارے اس بار مجھ سے بچھڑے تو جانے کب نصیب ہوں۔ آج کے بعد پھر دشمنیوں' نفرتوں اور عداوتوں کی ایسی سرنگ میں محوِ سفر ہوں گا جہاں صرف عذابوں کے کثیف دھوئیں کے سوا کچھ نہ ہو گا۔

بابا بھی خاموش تھا۔ ہم بہت جلد پکی سڑک پر پہنچ گئے۔ اب آسمان پر سرخی چھا گئی تھی اور کہیں کہیں گہرے سرمئی بادل اُڑ رہے تھے۔ ہوا میں خنکی کی وجہ سے سردی میرے رونگٹے کھڑے کر رہی تھی۔ میری ناک بالکل سُن ہو گئی تو میں نے چادر سے آدھے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ بابا مجھے ایسا کرتے دیکھ کر مسکرایا۔

"سری لگ رہی ہے؟"

"ہاں بابا.......... عادی نہیں رہا ایسی سردی کا"۔

"بس تھوڑا سا راستہ اور ہے"۔ اس نے مجھے تسلی دی۔

کچھ ہی دیر بعد مجھے آف وہائٹ کلر کی وہ چھوٹی سی عمارت نظر آ گئی جہاں گیٹ کے پاس لکڑی کے اسٹول پر ایک آدمی بیٹھا اونگھ رہا تھا اور اس کے پیچھے وہ کھڑکی بھی نظر آ رہی تھی جہاں تین چار آدمی کھڑے تھے۔ کھڑکی بند تھی۔ میں اور بابا اتر کر اس عمارت کے گیٹ میں داخل ہو گئے۔ میں اور بابا بھی کھڑکی کے پاس ہی کھڑے ہو گئے۔ میں نے اپنی بائیں جانب دیکھا جہاں ریل کی پٹڑیاں پھیلی ہوئی تھیں اور آسمان پر پھیل جانے والی شفق ان پر منعکس ہو رہی تھی۔

ذرا دیر بعد ایک لڑکا چائے کی بڑی سی کیتلی اور دوسرے ہاتھ میں پیالے لیے ہمارے قریب آ گیا۔ "بابو جی! چائے؟"

"ہاں.......... دو پیالے دو"۔ میں نے دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے کہا۔

اس نے جلدی سے دو پیالوں میں چائے نکال کر میری طرف بڑھا دی۔ میں نے ایک پیالہ بابا کو دیا اور دوسرا خود لے کر کھڑا ہو گیا۔ سردی میں گرم گرم چائے پی کر جان آ

گئی بدن میں۔ میں نے چائے کے پیسے ادا کرنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا اور تبھی مجھے احساس ہوا کہ میں ایک بہت بڑی غلطی کر بیٹھا ہوں۔

میرے پاس کافی پیسے تھے۔ مجھے نور کو کچھ نہ کچھ ضرور دینا چاہیے تھا۔ معلوم نہیں بابا وغیرہ کی کیا آمدنی ہے۔ وہ کیسے گزر اوقات کرتے ہیں اور اب میں نور کو بھی ان کے پاس چھوڑے جا رہا تھا۔ مجھے اپنی بے حسی پر غصہ آیا مگر اب بھی وقت تھا۔ میں نے جیب سے رقم نکال کر اس میں سے دو ہزار روپے الگ کیے اور قمیض کی اوپر والی جیب میں رکھ لیے۔ اسی وقت کھڑکی کھل گئی۔ وہاں کھڑے چاروں آدمی ٹکٹ لینے لگے۔ بابا مجھے بتا چکا تھا کہ آدھے گھنٹے بعد مجھے لاہور جانے والی ٹرین مل جائے گی۔ یہ غالباً اس نے اسٹیشن پر ہی کسی سے معلوم کیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر ٹکٹ لیا اور کھانے کا تھیلا اٹھا کر پتھر کی بینچ پر آ بیٹھا۔ بابا میرے ساتھ ہی تھا۔ وہ خاموش اور اداس اداس سا تھا اور جانے کن سوچوں میں گم تھا۔

میں نے اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ کچھ ہی دیر بعد زمین ہلتی ہوئی محسوس ہوئی اور ساتھ ہی ٹرین کی وسل سنائی دی۔ میں نے آواز کی سمت نگاہ ڈالی۔ دور سے ٹرین آتی نظر آ گئی۔

"پتر.......... اپنا خیال رکھنا' خان کو ہماری دعائیں پہنچا دینا پتر.......... اور لوٹ کر ضرور آنا۔ ریل یہاں دیر تک نہیں رکے گی پتر' تو جلدی سے بیٹھ جانا اور ہاں چھٹی ضرور لکھنا ورنہ شانی بھی بہت پریشان ہو جائے گی"۔

"ہاں بابا.......... مجھے احساس ہے.......... بابا یہ.......... یہ رکھ لو بابا شانی کو ضرورت ہو گی"۔ میں نے جیب سے نوٹ نکال کر اس کی مٹھی میں دبا دیے۔

اس نے مٹھی کھول کر دیکھی۔ "نہیں پتر.......... نہیں.........."

بابا میں تمہارا بیٹا نہیں ہوں کیا..........؟"

"وہ تو ٹھیک ہے پتر مگر.........."

"نہیں بابا.......... اگر مگر کچھ نہیں۔ اگر بیٹا نہیں سمجھتے تو پھر ٹھیک ہے.......... لاؤ واپس کرو"۔

وہ جھجک گیا۔ اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر رک چکی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

تھی۔ میں نے بابا کو مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا اور خداحافظ کہہ کر ڈبے میں سوار ہو گیا۔ بابا کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

"پُتر بالے............ ہم غریب ضرور ہیں پر............"

"بابا............ میرا دل مت دُکھاؤ' تمہاری ان باتوں سے اجنبیت کا احساس ہونے لگا ہے۔ اب تک میں جس اپنائیت کی لذت میں ڈوبا ہوا تھا وہ ختم ہوتی محسوس ہو رہی ہے"۔

"او نئیں............ تُو دُکھی نہ ہو پُتر............ سفر کرتے ہوئے آدمی کو دُکھی نہیں ہونا چاہیے ورنہ دُکھوں کا سفر بھی لمبا ہوتا چلا جاتا ہے۔ ٹھیک ہے لے میں نے رکھ لیے۔ اب تو خوش ہو جا پُترا!" اس نے روپے اپنی واسکٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

عین اسی لمحے گاڑی نے وسل دی اور فوراً ہی رینگنے لگی۔ میں نے ہاتھ ہلایا۔ بابا کا ہاتھ ہلنے لگا اور پھر ہم ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔

گویا میری زندگی کا ایک اور انوکھا باب ختم ہو چکا تھا اور شاید کوئی اور نیا اور بالکل انوکھا باب کھلنے والا تھا۔ اب تو میرا جی چاہنے لگا تھا کہ اپنی آنکھیں بند کر لوں پھر جو کچھ میرے ساتھ ہوتا رہے اس کو بس سہتا رہوں خاموش اور اندھا بن کے اس لیے کہ دونوں آنکھیں استعمال کرنے کے باوجود میں ایسے گڑھوں میں گرتا رہا ہوں جن میں صرف اندھے ہی گر سکتے ہیں۔ راہ میں اچانک آ جانے والے یہ گڑھے میرے لئے وبالِ جان بن گئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے میں اپنی زندگی کا تمام سفر کسی دلدل میں کرتا رہا ہوں۔ یہاں سے نکلنے کی جدوجہد میں میرے اعصاب تک زخمی ہو چکے تھے مگر یہ خوف ناک دلدل ہر بار میری آس بندھا کر مجھے پھر اپنے اندر کھینچنا شروع کر دیتی تھی۔

میں نے ذہن سے خیالات کو جھٹک دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ آسمان پر تیرنے والے بادل اب شفق رنگ ہو چکے تھے۔ سورج آگ کے گولے کی طرح آسمان سے سر نکال رہا تھا۔ میری دونوں جانب ہرے بھرے کھیت لہلہا رہے تھے اور کھیتوں میں عورتیں اور مرد اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ یہ حسین منظر بس لمحے بھر کو میری آنکھوں میں ٹھنڈک سی اتار کر پیچھے کی طرف بھاگ جاتے اور ایک نیا منظر میرے سامنے ہوتا۔ بالکل میری اپنی زندگی کی طرح۔

ٹرین کی رفتار بہت تیز ہو گئی تھی۔ باہر سے آنے والی ہوا بھی ٹھنڈی تھی۔ میں نے کھڑکی بند کر دی اور تھرمس کے ڈھکنے میں چائے نکال کر چسکیاں لینے لگا۔ اس دوران میں مَیں نے اپنے چاروں طرف بیٹھے لوگوں کو دیکھا جو تقریباً سبھی اونگھ رہے تھے۔ بعض تو کمبل میں لپٹے پڑے خراٹے لے رہے تھے۔ شاید یہ وہ لوگ تھے جو کراچی سے آ رہے تھے۔ میں نے فرداً فرداً سب کے چہروں کو بہ غور دیکھا سبھی میرے لیے اجنبی تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسی لمحے میرے برابر بیٹھا آدمی جو اونگھ رہا تھا ٹرین کے جھٹکے سے میرے اوپر آ گرا۔

"اوہ............ معاف کرنا پرا............" وہ جلدی سے سیدھا ہو کر بولا۔

"کوئی گل نئیں بادشاہو............ جے میں سُتا ہوندا تے فیر میں ڈِگ جانا سی"۔ میں نے ٹھیٹ پنجابی میں جواب دیا۔

"تُسی کیہڑے شہر دے او؟" وہ اب پوری طرح جاگ چکا تھا۔

"لہور دا............ تُسی؟"

"اسی ساہیوال دے آں"۔ اس نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔

"شہر لہور چلے او؟"

"آہو............ ساڈی ماسی لہور ہے' تُسی تے لہور دے او نا اے پتا دیکھو' میں اگے کدی لہور نئیں گیا۔ اس پتے تے میری ماسی کام کر رہی اے"۔

یہ کہہ اس نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ اب میں اس کی گفتگو سے الجھ گیا تھا۔ میں کچھ سوچنا چاہتا تھا مگر وہ مسلسل بولے جا رہا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے کاغذ لے کر اس پر سرسری نگاہ ڈالی اور یہ نگاہ ڈالنا ہی میرے اعصاب کو جھنجھنا گیا۔ ایڈریس فاریہ کی کوٹھی کا تھا۔

میں نے چونک کر اس نوجوان کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ وہ تیس پینتیس برس کا ہٹا کٹا جوان تھا۔ حلیئے سے وہ قطعی اَن پڑھ اور اَن کلچرڈ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی نگاہوں میں تجسس کے ساتھ ساتھ معصومیت بھی تھی۔

"کی ہویا؟" اس نے اسی معصومیت سے پوچھا۔

"کچھ نئیں............ اے تے کسی وڈی کوٹھی دا پتا اے............ محلہ وی امیراں دا

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

اے تیری ماسی بہت امیر اے؟"

"آہو........." اس نے فوراً سینہ پھیلا لیا۔ "او میری ماسی بھی اے تے سس بھی۔ ماسی دی دھی میری بیوی اے"۔

"کی ناں اے تیری ماسی دا؟"

"حمیدہ.......... حمیدہ ناں اے میری ماسی دا"۔

اور میں سیٹ کی پشت سے ٹک گیا۔ گہرا سانس لے کر میں نے آنکھیں موند لیں۔ میرے اعصاب کا تناؤ کم ہو گیا ورنہ تو میں ڈر ہی گیا تھا کہ خدا جانے اب کون سا چکر چلنے والا ہے۔ وہ ماسی حمیدہ کا داماد تھا۔ مجھے یاد آ گیا کہ حمیدہ نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ اس کی ایک بیٹی ہے اور وہ کراچی میں رہتی ہے۔ میرے اعصاب سے خوف کا بھوت اترا تو میں فریش ہو گیا۔ میں نے فوراً تھرمس میں سے چائے نکال کر اس نوجوان کی طرف بڑھائی۔

"پا جی تُسی کچھ آکھیا نئیں!" اس نے کپ ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا۔

"کی......... کی نئیں آکھیا؟"

"تُسی جاندے او اے پتا؟"

"آہو......... میں وی........." میں کہتے کہتے رک گیا۔ مجھے خیال آ گیا کہ میں ابھی اس خوف ناک جال سے نکل نہیں سکا ہوں۔ مجھے ہر حال میں محتاط رہنا چاہیے۔

"توں فکر نہ کر پا......... میں تینوں پچا دیاں گا"۔

یہ سن کر وہ بہت خوش ہو گیا۔ اب مجھے اس سے کچھ اپنائیت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے اس کا نام پوچھا۔ اس کا نام رحمت علی تھا اور لوگ اسے رحمتے کہتے تھے۔ میں بھی اسے رحمتے کہنے لگا۔ اسی سے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی یعنی حمیدہ کی بیٹی کے گھر تیسرا بچہ ہونے والا ہے اور رحمتے ماسی حمیدہ کو ساتھ لے جانے کے لیے لاہور جا رہا ہے۔ اس کی ماں معذور ہے۔ اس لیے وہ ان ایام میں ان کے کام نہیں آ سکتی جبکہ اس کے باقی دونوں بچے بھی ابھی چھوٹے ہی ہیں۔ ان بچوں کی دیکھ بھال، معذور ساس کی دیکھ بھال اور پھر ایسی حالت میں اس کی بیوی تنہا کیسے سب کچھ سنبھال سکتی تھی۔ اسی لیے اس نے ماں کو لینے بھیج دیا تھا۔

اس نے تو بڑی سادگی سے اپنے لاہور آنے کی وجہ بتا دی مگر میں اس خبر سے پریشان

ہو گیا تھا۔ گھر میں اتنے لوگ تھے۔ ظاہر ہے کہ کام بھی بڑھ گیا ہو گا اور پھر زاریہ کی دیکھ بھال ماسی سے بہتر کوئی دوسرا کر بھی نہیں سکتا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے کام کاج کی فکر سے زیادہ اس بات کی پریشانی تھی کہ ان حالات میں اس کوٹھی سے کسی کا بھی جانا بہتر نہ تھا مگر میرا خیال تھا کہ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ کوئی گھر ہی کا آدمی بھٹک بھی سکتا تھا۔ جس طرح مجھے نوٹوں کی اتنی موٹی گڈی دے دی گئی تھی۔ اسی طرح یہ نوٹوں کی گڈی کسی اور کو بھی دی جا سکتی تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ بھی میری طرح فاریہ سے وفاداری نبھائے۔ بہرحال میرے سوچتے رہنے سے تو کوئی فائدہ نہ تھا اس لیے میں نے اس معاملے پر سوچنا چھوڑ دیا اور رحمتے سے دوسری ہلکی پھلکی باتیں کرنے لگا۔

بارہ بجے کے قریب میں نے اور رحمتے نے کھانا کھایا۔ رحمتے کی بیوی نے جو سالن پکا کر اسے دیا تھا وہ کھا کر ماسی حمیدہ کے ہاتھ کا مزہ آ گیا۔ ہم کھانا کھا کر کچھ دیر کے لیے لیٹ گئے۔ مجھے لیٹتے ہی نیند آ گئی کیوں کہ میں تمام رات کا جاگا ہوا تھا۔ مجھے رحمتے نے جھنجوڑ کر اٹھایا۔

"کی ہویا یار؟" میں لیٹے لیٹے بڑبڑایا۔

"اٹھو پا جی لاہور آ گیا"۔ اس نے سیٹ کے نیچے سے ایک چھوٹا سا بیگ نکالتے ہوئے کہا اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ یہ سنتے ہی کہ ہم لاہور پہنچ گئے ہیں میں چوکنا ہو گیا۔ میں نے کھڑکی سے اسٹیشن کی طرف دیکھا۔ اسٹیشن پر ایک بڑا ہجوم تھا۔ قلی تیار کھڑے تھے، جوں ہی ہماری گاڑی کی رفتار کم ہوئی قلی بھاگ بھاگ کر ڈبوں میں سوار ہو گئے۔ میں اب بھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ میری نگاہیں اسٹیشن پر کسی جانے پہچانے چہرے کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

جانے پہچانے چہروں سے میری مراد ہے کہ وہ لوگ جو میرے پیچھے سائے کی طرح لگے ہوئے تھے یعنی مسٹر زید اور مسٹر جمال کے کرائے کے غنڈے، مجھے کہیں ایسا کوئی چہرہ نظر نہ آیا جس کی وجہ سے میں بے حد خوش ہو گیا۔ رحمتے اپنا بیگ اٹھا کر میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ اسٹیشن پر اتر گیا۔ ہم دونوں اس گیٹ کی طرف بڑھے جہاں سے دوسرے مسافر باہر جا رہے تھے۔ میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

"ٹکٹ!" گیٹ پر کھڑے گیٹ کیپر نے کہا تو میں چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

گیا۔ عین اسی لمحے ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے پاس کھڑے شخص پر میری نگاہ پڑی اور میں سُن ہو گیا۔ وہ انہی تینوں میں سے ایک تھا اور بڑے اطمینان سے سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ اسے یقیناً میری نگرانی کے لیے یہاں چھوڑا گیا ہو گا مگر اس وقت اس کی نگاہ دوسری جانب تھی اور یہی میرے لیے غنیمت تھا۔ میں جلدی سے رحمتے کی آڑ میں ہو گیا۔ اب میرا یہاں سے باہر جانا خطرناک ہو سکتا تھا مگر گیٹ کیپر میری ہی طرف متوجہ تھا۔

میں نے ایک ہاتھ سے رحمتے کو پکڑ کر پیچھے کی طرف کھینچا اور ایک کنارے ہو گیا۔

"دیتا ہوں یار، نہیں معلوم کہاں گیا ٹکٹ؟" میں نے گیٹ کیپر سے کہا اور اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔

اس نے مشکوک نگاہوں سے میری جانب دیکھا اور پھر دوسرے مسافروں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں فوراً ہی وہاں سے کھسک گیا۔ رحمتے کا ہاتھ میں نے مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ وہ بے چارہ میرے اس انداز پر کافی بوکھلایا ہوا تھا مگر منہ سے ایک لفظ بھی نہیں بولا۔

میں اسے لیے پلیٹ فارم نمبر چھ پر پہنچ گیا۔ میں کوئی ایسی جگہ تلاش کر رہا تھا جہاں سے میں اسٹیشن سے باہر نکل سکوں مگر کافی تلاش کے بعد بھی مجھے ایسی کوئی جگہ نظر نہ آئی۔

"کی ہویا پا جی؟" رحمتے صبر نہ کر سکا تو بول اٹھا۔

اسی وقت ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے میرے ذہن میں کوندا اور میں رحمتے کو لیے ایک ایسے حصے میں پہنچ گیا جہاں روئی کی بڑی بڑی گانٹھیں رکھی تھیں۔

"رحمتے تیرے پاس کاغذ پنسل ہے؟"

"نہ..... کی ہویا توں مینوں دس تے سئی!"

"دیکھو رحمتے........... میں نے بھی اسی کوٹھی میں جانا ہے جہاں تیری ماسی حمیدہ کام کرتی ہے۔ تیری ماسی جانتی ہے مجھے........... مگر باہر میرا ایک دشمن کھڑا ہے۔ میں جیسے ہی باہر نکلوں گا وہ مجھے پکڑ لے گا۔ اب تُو ہی مجھے بچا سکتا ہے"۔

"مینوں کی کرنا اے؟"

"تُو صرف اتنا کر کہ........... کسی نہ کسی طرح کوٹھی چلا جا، کسی بھی تانگے والے کو ایڈریس دکھائے گا تو وہ تجھے پہنچا دے گا۔ تُو جا کر حمیدہ کو بتا دینا کہ اقبال تیرے ساتھ ہی

کراچی سے یہاں تک آیا ہے مگر اس دشمن کی وجہ سے وہ اسٹیشن پر ہی رک گیا ہے۔ یہ بات حمیدہ اپنی مالکن کو بتا دے گی اور وہ یہاں آ کر مجھے لے جائے گی"۔ اتنا سمجھا کر میں نے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر رحمتے کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

سو روپے دیکھ کر رحمتے کی آنکھوں میں چمک بھر گئی۔ اس نے زور زور سے سر ہلا کر مجھے تسلی دی کہ وہ سب کچھ اسی طرح کرے گا جیسا میں نے کہا ہے۔

پھر میں نے رحمتے کو جانے دیا اور خود روئی کی گانٹھوں کی آڑ میں بیٹھ گیا۔ اب میں اطمینان سے یہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔ رحمتے کو بھیج کر میں کافی مطمئن ہو گیا۔ اب میں رات ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اسٹیشن پر کافی رش تھا۔ اس لیے مجھے یہ اطمینان تھا کہ کوئی بھی میری طرف متوجہ نہیں ہو گا پھر بھی زیادہ دیر تک یہاں نہیں رک سکتا تھا۔ دوسری بات یہ بھی تھی کہ ضروری نہیں تھا کہ رحمتے صحیح پتے پر پہنچ ہی جاتا اور اگر پہنچ بھی جاتا تو کیا ضروری تھا کہ وہ گھنٹے دو گھنٹے میں ہی پہنچ جاتا اور فاریہ گھر پر ہی ہوتی اور پھر فوراً ہی معاملے کو سمجھ کر مجھے ڈھونڈنے بھی نکل جاتی۔ گویا میں فی الحال مشکل میں تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ٹیلی فون بوتھ بھی اس گیٹ سے باہر ہی تھا۔ ورنہ میں فاریہ کو فون کر کے اپنے پہنچ جانے کی اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ ہی اسے مسئلے کی سنگینی کا بھی احساس دلا دیتا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

بہرحال فی الوقت میں یہ سب سوچنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے رات ہونے کا انتظار تھا۔ رات کے اندھیرے میں میرے لیے فرار ہونا زیادہ مناسب تھا۔ زیادہ دیر بیٹھے رہنا بھی میرے لیے مشکل تھا۔ ایسی صورت میں ریلوے کے عملے یا ریلوے پولیس کی نگاہوں میں بھی آ سکتا تھا۔ یہی سوچ کر میں اٹھ کھڑا ہوا اور پُل کراس کر کے پلیٹ فارم نمبر دو پر چلا گیا۔ وہاں میں نے ایک ٹھیلے پر کھڑے ہو کر مرغ چھولے کھائے۔ گرم گرم چائے پی اور وہیں بینچ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا۔ یہاں بس اس لیے آرام سے لیٹ گیا کہ میری ہی طرح کچھ دوسرے لوگ بھی مختلف بینچوں پر لیٹے ہوئے تھے۔

"اے باؤ...........!" اچانک ایک بھاری آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ میرے سامنے ایک لمبا تڑنگا آدمی کھڑا تھا۔ اس کا حلیہ کسی کاؤ بوائے کا سا تھا۔ میلی

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

اور گھٹنوں پر سے گھسی ہوئی جینز' کالی چمڑے کی جیکٹ' سر پر بڑا سا ہیٹ اور جیکٹ کے اندر گردن میں پڑا ہوا سرخ قالین کا مفلر' وہ چہرے سے بڑا سخت ظالم اور سفاک محسوس ہونے کے باوجود نہ معلوم کیوں مجھے اچھا لگا۔ اس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات تھی جو مجھے لمحوں میں متاثر کر گئی۔

"اکیلے ہو کیا؟" اس نے میرے بیٹھ جانے کے بعد میرے برابر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تم ساتھ ہو!" میں نے مختصر جواب دیا۔

وہ بے ساختہ ہنس پڑا پھر غور سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "صورت سے تو سمجھ دار نہیں لگتے"۔

"شاید یہی خدا کی مصلحت ہے!"

وہ پھر ہنسا۔ "کافی تیز ہو!"

"شکریہ!" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ میں بہ ظاہر مطمئن بیٹھا تھا۔ مگر میرے اندر اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ میں اس کی ڈرامائی ملاقات کے سلسلے میں مشکوک تھا۔ اس کی اس طرح آمد اور تعارف حاصل کرنے کے مقصد سے بھی ناواقف تھا۔ ممکن ہے وہ محض باتیں کرنے کی غرض سے آ گیا ہو مگر حالات نے مجھے ہر معاملے پر شک کرنے کی عادت ڈال دی تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ نہ تو اس کی قومیت کا پتا چلتا تھا اور نہ ہی اس کے انداز سے کسی قسم کی غیریت محسوس ہوئی تھی جو بہرحال اچنبھے کی بات تھی۔

"آپ سے شاید یہ میری پہلی ملاقات ہے!" میں نے اسے ٹٹولتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔

"مجھے جنگل کہتے ہیں!" اس نے بڑے اخلاق سے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

"جنگل.........! بڑا عجیب و غریب اور خوفناک نام ہے"۔ میں نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "اور آپ کی شخصیت سے میل بھی نہیں کھاتا۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ آپ کا نام ٹام ہو گا یا شاید جیکسن قسم کا کوئی نام ہو مگر........."

"جس اخلاق سے تم بات کر رہے ہو لگتا ہے مجھے اپنا نام بدلنا ہی پڑے گا"۔ پھر اس نے چاروں طرف دیکھا اور بڑی رازداری سے بولا۔ "یار ہم بھی تمہاری ہی کیٹگری کے آدمی ہیں۔ یہ غیریت چھوڑو اور سگریٹ پیئو۔ میں تو بیڑی پیتا ہوں یا پائپ......... ویسے

دوستوں کے لیے سگریٹ ضرور رکھتا ہوں۔" اتنا کہہ کر اس نے جیکٹ کی جیب سے کے ٹو کا پیکٹ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ "اب کام کی بات کرتے ہیں استاد"۔ اس کا لہجہ اچانک ہی بدل گیا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ دوست کہ یہ اسٹیشن میرا ہے......... یہاں کا کوئی سوکھا تنکا بھی میری مرضی کے بغیر نہیں لے جا سکتا۔" اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا......... ہاتھ کا دباؤ دوستانہ نہیں تھا۔

"میں سمجھا نہیں.........!"

"معصوم نہ بنو اور یہ بتاؤ کہ ناواں کتنا ہاتھ لگا؟"

اس کے ایک جملے ہی سے میں ساری بات سمجھ گیا۔ وہ شاید جیب کترا تھا اور مجھے بھی جیب کترا ہی سمجھ رہا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے فوراً جھینپنے کی اداکاری کی اور کھیس نکال کر اسے دیکھنے لگا۔

"بولو......... بولو.........!"

"ابھی تک تو کچھ ہاتھ نہیں لگا جنگل......... اب کے ٹرین آئی تو شاید کچھ بن آئے"۔ میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو دوست' میں یہاں ہر آدمی سے آدھا وصولتا ہوں تب اسے کام کرنے کی اجازت دیتا ہوں۔ منظور ہے تو........." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں فوراً تیار ہو گیا۔ "ٹھیک ہے استاد اپن کو تو دو وقت کی روٹی چاہیے بس......... اکیلے ہیں آگے پیچھے کوئی نہیں کہ زیادہ کی ہوس کریں"۔

"شاباش......... یہ ہوئی نہ کام کی بات۔ اپنی زندگی کا بھی یہی اصول ہے کہ کھاؤ اور کھانے دو۔" وہ خوش ہو گیا۔ "چل تجھے گلابی چائے پلاتا ہوں"۔

میں اٹھ کر اس کے ساتھ چل دیا۔ ہم سیڑھیاں اتر کر پھر اسی طرف آ گئے جہاں بیرونی گیٹ تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے باہر دیکھا۔ وہ شخص اب بھی موجود تھا۔ میرا ذہن یہاں سے باہر نکلنے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا۔ رحمتے کو گئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹا ہو چکا تھا۔ اصولاً تو اسے اب تک گھر پہنچ جانا چاہیے تھا اور اگر وہ گھر پہنچ گیا تھا تو فاریہ کو اب تک

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

یہاں آ جانا چاہیے تھا مگر مجھے فاریہ ہی نہیں اور کوئی بھی نظر نہیں آیا۔

جنگل میرے کاندھے پر ہاتھ رکھے جانے کیا کیا بول رہا تھا۔ میں نے اس کی باتوں پر بالکل دھیان نہ دیا تھا۔ اگر وہ میری طرف دیکھ کر ہنستا تھا تو میں بھی ہنس دیتا اور اگر سنجیدہ ہو جاتا تو میں بھی سنجیدگی کا مظاہرہ کرتا یوں جیسے میں اس کی تمام گفتگو سن رہا ہوں مگر میرا ذہن اپنی ہی گتھیوں میں الجھا ہوا تھا۔

ہم چائے کے اسٹال پر پہنچ گئے۔ جنگل نے چائے کا کپ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

میں نے ایک بار پھر پلٹ کر زید کے اس آدمی کو دیکھا۔ وہ اب کافی بور نظر آ رہا تھا اور چند قدم آگے بڑھ کر سیڑھیوں پہ بیٹھ گیا تھا۔

"کیا بات ہے یار.......... کیا سوچ رہا ہے؟" جنگل نے مجھے الجھا ہوا دیکھ کر پوچھا۔

"اور ہاں تیرا نام کیا ہے؟"

"قادر نام ہے' سب مجھے کادا کہتے ہیں"۔

"اچھا اچھا.... بات کیا ہے؟"

"یار پھڈا ہو گیا تھا میرا کل' سالا پیچھے پڑ گیا"۔

"ابے کون..... مجھے بتا.......... سالے کے جبڑے توڑ کر حلق میں دانت گرا دوں گا۔ یاروں کا یار ہوں اور سچی بات تو یہ ہے کادے کہ تیرے پہ اپنا دل آ گیا ہے۔ اچھے لوگوں کی بڑی کمی ہے دنیا میں اسی لیے اُن کی قدر کرتا ہوں۔ تُو مجھے سامنا کرا دے اس کا بس پھر تیرا کام ختم....." وہ ایک دم جوش میں آ گیا۔

یہ بہترین موقع تھا میرے لیے اس کے بعد تو جانے کیا ہوتا اس لیے میں نے فوراً اشارہ کر کے اسے دکھا دیا کہ وہ بیٹھا ہے میرا دشمن۔

"ابے.......... تُو نے پہلے کیوں نہیں بتایا' تُو چائے پی میں ابھی کام دکھا کر واپس آتا ہوں۔" وہ فوراً بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے موقع غنیمت جانا اور چائے کے پیسے دے کر خود بھی اس طرف بڑھ گیا۔

میں اس کے پیچھے پیچھے ہی گیٹ سے باہر آ گیا۔ اس وقت گیٹ کیپر نہیں تھا اور مسٹر زید کے آدمی کی میری جانب پشت تھی۔

میں باہر آتے ہی منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ اب مجھے اس آدمی کے علاوہ جنگل سے بھی

بچنا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد مجھے پتا چل گیا کہ ہنگامہ شروع ہو گیا ہے۔ اِدھر اُدھر کھڑے لوگ بھی شور سن کر ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ جنگل نے جاتے ہی اسے گھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ میں جو دم دبا کر وہاں سے بھاگا تو میں نے سڑک پر آ کے ہی دم لیا۔ میں سیدھا ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

دوسرے ہی لمحے میں ٹیکسی میں بیٹھا فاریہ کی کوٹھی کی طرف جا رہا تھا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور میں یہ سوچ کر محظوظ ہو رہا تھا کہ جب جنگل کو پتا چلے گا کہ میں وہاں سے غائب ہوں تو اپنے بال ہی نوچ ڈالے گا اور مسٹر زید کے آدمی کو بھی پٹوا کر میں بے حد خوش تھا بلکہ مجھے تو افسوس یہ ہو رہا تھا کہ وہاں قریب کوئی سپاہی نظر نہیں آیا تھا ورنہ میں تو اسے ان دونوں کی طرف بھیج دیتا اور یوں وہ دونوں ہی پکڑے جاتے۔

بہر حال اب میں ایک بڑے عذاب سے نکل آیا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ میں وہاں پہنچ کر کسی نئے عذاب میں مبتلا ہو جاؤں۔ اسی خیال کے تحت میں نے ایک میڈیکل اسٹور کے قریب ٹیکسی رکوالی۔

"بھیا کچھ دیر ٹھہرو گے؟" میں نے ٹیکسی والے سے پوچھا۔

"زیادہ دیر تو نہیں لگے گی؟" اس نے الٹا سوال کر لیا۔

"نہیں بس ایک ٹیلی فون کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے جی! دیر نہ کرنا بس!" اس نے جواب دیا۔

میں اتر کر میڈیکل اسٹور پر آ گیا۔ میں نے فاریہ کی کوٹھی کا نمبر ڈائل کیا۔ نمبر ڈائل کرتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ کچھ دیر تک دوسری طرف بیل بجتی رہی۔ میری گھبراہٹ میں بھی تیزی سے اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے بیل کو گننا شروع کر دیا۔ ایک.......... دو.......... تین.......... چار.......... اور عین اسی لمحے کسی نے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہلو جی!" یہ آواز یقیناً ماسی میراں کی تھی۔

"ہیلو ماسی میراں؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"ہاں جی! میراں بول رہی ہوں۔ تم کون ہو؟"

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"فاریہ کہاں ہے؟" میں نے اس کی بات کا جواب دیئے بغیر پوچھا۔

"جی وہ تو نہیں ہیں"۔

"کہاں گئی ہیں اور کس کے ساتھ گئی ہیں؟"

"وہ جی معلوم نہیں کہاں گئی ہیں پر بالے کے ساتھ گئی ہیں"۔

"بالے کے ساتھ....؟" میں اچھل پڑا۔ میری کنپٹیوں سے پسینا بہنے لگا۔ اس کا مطلب تھا کہ نہ صرف جمال یہاں پہنچ گیا ہے بلکہ اپنے پلان میں کامیاب ہو گیا ہے۔

"بالا کب آیا تھا ماسی؟"

"کل سویرے آ گیا تھا.......... پر تُو کون ہے رے.......... اور کیوں پوچھتا ہے اسے؟"

"سنو ماسی فون بند نہیں کرنا.........." میں نے جلدی سے کہا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ فون بند نہ کر دے۔ "سلطان ہے گھر پہ؟"

"نہ جی وہ بھی نہیں ہے.......... کوئی نہیں ہے گھر پہ.........."

"اور.......... اور سوہنی..........؟" میں بے اختیار پوچھ بیٹھا مگر شاید نے ماسی نے سنا نہیں۔ وہ اس سے پہلے ہی فون بند کر چکی تھی۔ اس کے لہجے کی بیزاری بتا رہی تھی کہ وہ زیادہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ میں نے گہرا سانس لے کر فون بند کر دیا اور واپس ٹیکسی میں آ بیٹھا۔

مجھے توقع نہیں تھی کہ مسٹر زید اور جمال اس قدر جرأت مندی کا مظاہر بھی کر سکتے ہیں۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ میں پہنچ چکا ہوتا اور ان کے ہر حربے کو ناکام بنا دیتا۔ یہ تو محض اتفاق تھا کہ ٹرین سے کودنے کی وجہ سے میں اور نور زخمی ہو گئے تھے جس کی وجہ سے ہم مسلسل سفر نہیں کر سکے اور ہمیں مجبوراً اس گاؤں میں رکنا پڑا ورنہ اگر ہم زخمی نہ ہوتے تو دوسرے روز ہی لاہور پہنچ چکے ہوتے۔ مجھے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ جب میں فاریہ کو بتا چکا تھا کہ نور میرے ساتھ ہو گی اور میں اپنے بال براؤن کر چکا ہوں، جمال پہنچا تو میرے گیٹ اَپ میں پہنچے گا پھر آخر فاریہ نے بحیثیت اقبال اسے کس طرح قبول کر لیا۔

بہرحال جو کچھ ہونا تھا وہ تو اب ہو چکا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ میں اب کہاں جاؤں۔ ایک ٹھکانہ اس کوٹھی کے سوا جو تھا وہ تو میں خود ہی ختم کر چکا تھا۔ سلطان کا گھر، سلطان وغیرہ کو

بھی میں وہاں سے کوٹھی بھیج چکا تھا۔

"صاحب جی کہاں جانا ہے.......... گلبرگ تو آ گیا۔" ٹیکسی والے نے مجھے چونکا دیا۔

"اوہ.......... سوری.......... بس یہاں سائیڈ پر روک دو"۔ میں نے جواب دیا اور جیب سے پیسے نکال کر اسے کرایہ ادا کیا، پھر دروازہ کھول کر نیچے آ گیا۔

ٹیکسی آگے بڑھ گئی اور میں سنسان سڑک پر کھڑا رہ گیا۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی پونے تین بجے تھے۔ میں بغیر سوچے سمجھے ایک طرف چل پڑا۔ میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مجھے کسی نہ کسی طرح کوٹھی میں داخل ہونا تھا یا فاریہ سے کسی بھی طرح بات کرنا تھی۔ میں ایک بات جانتا تھا کہ جمال فاریہ کو تنہا نہیں چھوڑے گا۔ وہ بھی یہ بات سمجھ رہا ہو گا کہ میں لاہور پہنچتے ہی اس سے رابطے کی کوشش کروں گا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ کوٹھی کے علاوہ باہر یا فیکٹری میں بھی اسے تنہا رہنے دیتا ہو ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں فیکٹری چلا جاتا۔ اب مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ میں نے انسپکٹر تنویر کا نمبر یاد کیوں نہیں رکھا یا اس کا گھر کیوں نہیں دیکھا۔ اگر مجھے نمبر یا گھر یاد ہوتا تو اس سے بہتر کوئی ذریعہ ہی نہ تھا۔

عین اسی لمحے میرے ذہن میں روشنی سی کوند گئی۔ امید کی ایک کرن تھی جو اچانک واضح ہوتی چلی گئی۔ مجھے اچانک وہ شخص یاد آ گیا جو فاریہ کی فیکٹری میں کام کرتا تھا اور جس نے بیگ صاحب کے کالے دھندے کے سلسلے میں فاریہ کی مدد کی تھی اور وصی صاحب کی تمام فائلیں رکھ لی تھیں۔

نہ معلوم کیا نام تھا اس کا؟ میں بہت دیر یاد کرتا رہا مگر مجھے اس کا نام یاد نہیں آیا۔ گویا امید کی یہ کرن بھی ٹمٹما کر بجھ گئی اس لیے کہ میں اس سے صرف فون پر ہی بات کر سکتا تھا اور فون پر نام معلوم ہوئے بغیر بات کرنا ممکن نہ تھا۔ فیکٹری جا کر ملاقات کرنے میں یہ قباحت تھی کہ ممکن ہے وہاں فاریہ کے ساتھ جمال بھی ہو اور وہ مجھے پہچان لے۔

میں یہ سب سوچتے سوچتے کافی دور نکل آیا تھا۔ یوں ہی بے مقصد سڑک پر میں آخر کب تک پھرتا رہتا؟ اب تو مجھے بھوک بھی لگنے لگی تھی۔ اسٹیشن پر کھائے ہوئے مرغ چھولے ہضم ہو چکے تھے۔ ٹینشن کی وجہ سے سر بھی بھاری ہو رہا تھا اور تھکن نے تقریباً نڈھال کر دیا تھا۔ میں چلتے چلتے اس راؤنڈ اباؤٹ پر آ گیا تھا جہاں چاروں طرف کافی رونق

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

تھی ایک طرف مارکیٹ تھی دوسری طرف ہوٹل اور چھوٹے چھوٹے اسنیک بار بنے ہوئے تھے۔ جس کے سامنے سڑک کے کنارے ٹیکسی والے قطار میں کھڑے تھے۔

میں ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا۔ وہاں میں نے ڈٹ کر کھانا کھایا' گرم گرم کافی پی۔ ریسٹورنٹ میں داخل ہونے سے پہلے ہی میں سگریٹ خرید چکا تھا۔ لہٰذا فارغ ہو کر میں نے ایک سگریٹ سلگا لیا۔ لمبے لمبے کش لینے لگا اور مسٹر زید کو ہزاروں دعائیں دیتا رہا۔ یہ انہی کی مہربانی تھی کہ میں یہاں بیٹھا تھا ورنہ اگر انہوں نے وہ رقم مجھے نہ دی ہوتی تو شاید میرے پاس چھولے کھانے کے بھی پیسے نہ ہوتے۔

اب شام ہو چکی تھی۔ بازار کی رونق بڑھتی جا رہی تھی۔ میں کافی دیر بعد بل ادا کر کے باہر آ گیا اور مارکیٹ میں گھومنے لگا۔ مجھے کسی نہ کسی طرح وقت گزارنا تھا۔ میں رات ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ رات ہونے کے بعد میرا ارادہ کوٹھی کی طرف جانے کا تھا۔ اندھیرے میں تو یہ ممکن تھا کہ میں وہاں چھپ کر آنے جانے والے پر نگاہ رکھتا اور سلطان یا فاریہ کو تنہا پا کر ساری صورتِ حال سے آگاہ کرتا مگر دن کے اجالے میں یہ سب ممکن ہی نہ تھا۔ میں چاہتا تو چوکیدار کو بھی اصل بات بتا سکتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ میرا حلیہ اس قدر خراب ہو چکا تھا کہ وہ تو شاید قسمیں کھانے پر بھی یقین نہ کرتا اور خاص طور پر اس وقت جبکہ جمال میرے روپ میں کوٹھی میں موجود تھا۔

میں تقریباً دو گھنٹے تک مٹر گشت کرتا رہا پھر مغرب کے وقت میں نے ٹیکسی لی اور کوٹھی کی طرف بڑھا۔ سردیوں کا موسم تھا اس لیے چھ بجے ہی سے اندھیرا پھیلنے لگتا تھا۔ احتیاطاً میں نے ٹیکسی کرشن نگر کی طرف مڑوا دی۔ شاید قسمت یاوری کرے اور سلطان اسی طرف گیا ہوا کچھ بھی تھا اس کے یار دوست اور محلے دار تو موجود تھے۔ ممکن ہے وہ وہاں آیا ہوا ہو یا آتا ہو۔

ایک آس تھی جو مجھے کشاں کشاں اس طرف لے جا رہی تھی۔ میں سلطان کے گھر کے پاس اتر گیا۔ ٹیکسی میں نے چھوڑ دی اور جھومتا ہوا ان اندھیری اور تنگ سیڑھیوں پر چڑھتا چلا گیا۔

سلطان کے گھر کے دروازے پر نگاہ پڑتے ہی میں خوش ہو گیا۔ کنڈی نیچے جھول رہی تھی یعنی تالا نہیں تھا۔ میں نے کنڈی پکڑ کر ہلائی مگر کوئی نہ آیا۔ پھر میں نے زور سے

دستک دی۔ چند لمحوں بعد آہٹ ہوئی اور دروازہ کھل گیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو ہمیں پہلے بھی ملی تھی۔ یہ شاید پڑوس میں رہتی تھی۔ جس وقت دروازہ کھولا تھا اس وقت اس کے چہرے پر عجیب سی روشنی تھی جو مجھے دیکھتے ہی بجھ گئی۔

"کیا بات ہے' کون ہو تم؟"

"سلطان ہے؟"

اس نے بڑی افسردگی سے سر نفی میں ہلایا۔ "نئیں جی! وہ تو نہیں ہے۔"

"کہاں گیا ہے؟"

"معلوم نہیں جی! اس کا ایک دوست آیا تھا جانے اسے کہاں لے گیا.......... اس کے ساتھ جا کر تو وہ بالکل ہی بدل گیا۔ سب کو بھول گیا"۔

وہ خواب کے سے عالم میں بولتی چلی گئی۔ اس کے اندر کے سارے جذبے الفاظ میں سے جھانکنے لگے۔ وہ شاید سلطان سے پیار کرتی تھی جبھی تو اس کے چلے جانے پر اس قدر افسردہ تھی۔

"جب سے گیا ہے واپس ہی نہیں آیا کیا؟"

"نہ جی.........." اس نے جواب دیا پھر اچانک جھجک کے پیچھے ہٹ گئی۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ ایک اجنبی کے سامنے پتا نہیں کیا کیا کہہ گئی ہے۔ "پر آپ کون ہیں جی!"

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

"یار ہوں اس کا.......... ملنے آیا تھا۔ اچھا میں چلتا ہوں"۔

"سنو..........!" وہ بے اختیار ہو کر بولی۔

"جی!"

"تم اسے ڈھونڈو گے کیا؟"

"ہاں کوشش تو کروں گا.......... کیا کوئی کام ہے؟"

"ہاں جی..........!" اس نے سر جھکا کر کہا پھر لمحے بھر کو چپ ہو گئی۔ "وہ ملے تو کہنا.......... میں یاد کرتی ہوں۔" اتنا کہہ کر اس نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔

میں اس کی معصومیت پر مسکرا دیا اور سیڑھیاں اتر کر گلی میں نکل آیا۔ گلی سے مین روڈ تک میں پیدل آیا۔ اب اندھیرے پھیل چکا تھا۔ میں نے پھر ٹیکسی لی اور اسے کوٹھی کا

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

ایڈریس بتا کر اس میں بیٹھ گیا۔ فی الحال میرے ذہن میں کوئی پلان نہیں تھا۔ میں بالکل خالی الذہن تھا یوں لگتا تھا جیسے میرے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں مفلوج ہو چکی ہیں۔ میں سیدھا سادا آدمی جسے سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔ ایک لگا بندھا دائرہ تھا جس میں گھومنے ہی کو زندگی سمجھتا تھا۔ آج سوچوں کی ایک ایسی بھٹی میں سلگ رہا تھا جہاں سے بچ نکلنے کی آس ہی ختم ہو چکی تھی۔ آج نہ معلوم کتنے عرصے بعد میرے دل میں اس خواہش نے جنم لیا کہ کاش میں واپس اپنے گاؤں چلا جاؤں' اس پہلے والی معصوم اور سادہ سی زندگی میں مگر سوچ لینا کتنا آسان ہے! کاش میں عملی طور پر بھی وہی کچھ کر سکتا جو میں سوچ رہا تھا۔

"باؤ جی!" ٹیکسی والے نے چونکا دیا۔ "ہن کتھے جانا اے؟"

"ہاں.......... بس بس یہاں روک دو" میں نے جلدی سے کہا۔

اس نے ٹیکسی کنارے پر روک دی۔ میں نے اسے کرایہ ادا کیا اور ٹیکسی سے اتر گیا۔ ٹیکسی کے جانے کے بعد میں نے چاروں طرف دیکھا۔ میں فاریہ کی کوٹھی سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہی جانے پہچانے رستے' وہی رات کی رانی کی مہکتی خوشبو اور وہی گلی کے کونے پر لگی ہلکے نارنجی رنگ کی روشنی جو مجھے بے حد پسند تھی۔

میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ میں نے موٹی چادر کو اچھی طرح لپیٹا ہوا تھا۔ سر پر بندھی پگڑی کی وجہ سے میرا سر اور کان سرد ہوا سے محفوظ تھے۔ میں کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اگر میں چوروں کی طرح گھر میں داخل ہونے کی کوشش کرتا تو یہ میرے لیے خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ پھر میں بے اختیار آگے بڑھ گیا۔ میں نے سوچا کہ ممکن ہے گیٹ پر مجھے سلطان ہی مل جائے۔ ویسے یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں چوکیدار سے سلطان کے بارے میں پوچھتا اور خود کو اس کا دوست ظاہر کرتا۔ یہ طریقہ مجھے زیادہ بہتر لگا اور میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

چند ہی لمحوں بعد میں کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ گیٹ بند تھا اور سردی کی وجہ سے چوکیدار نے اپنے کمرے کی وہ کھڑکی بند کی ہوئی تھی جو باہر کی جانب کھلتی تھی۔ میں نے اس کھڑکی کے پٹ پر ہلکی سی دستک دی۔ دوسرے لمحے ہی کھڑکی کھل گئی اور چوکیدار کا

چہرہ نظر آیا۔ وہ بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"ہاں بولو..........؟" اس نے غرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"لالہ.......... سلطان ہے؟"

"تم کون ہے؟" اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں سلطان کا دوست ہوں۔ اس کے گاؤں سے آیا ہوں"۔ میں نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ "اسے بلا دو"۔

اس نے ایک مرتبہ پھر گھور کر دیکھا اور بولا۔ "ذرا ٹھہرو.......... ہم اس کے لیے بولتا ہے۔ نام کیا بولا تم نے؟"

"نام!.......... خان.......... بولو خان آیا ہے"۔ فی الفور میرے ذہن میں یہی نام آیا اور میرے خیال میں یہ نام ایسا تھا کہ سلطان سنتا تھا تو دوڑا چلا آتا۔

"ہم بلاتا ہے تم ٹھہرو....." چوکیدار نے یہ کہہ کر کھڑکی بند کر دی۔

میں منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ سلطان میرا حلیہ دیکھ کر بھک جائے گا۔ ظاہر ہے مجھ میں اور خان میں زمین آسمان کا فرق تھا اور اس وقت میں جس حلیے میں تھا اس میں تو وہ مجھے بہ حیثیت بالا بھی نہیں پہچان پائے گا۔ بہرحال اس طرح کم از کم میں سلطان سے بات تو کر سکتا تھا ورنہ تو باہر کھڑا رہنا یا محض سوچتے رہنا بیکار ہی تھا۔

چوکیدار کو گئے تقریباً تین چار منٹ گزر چکے تھے۔ میں نے واسکٹ کی جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا اور اس کے لمبے لمبے کش لینے لگا۔ مزید چند منٹ گزرنے کے بعد ہی چوکیدار کے کمرے کی کھڑکی کھل گئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا وہاں سلطان موجود تھا۔ وہ روشنی میں تھا اور میں چند قدم پیچھے ہو کر کھڑا تھا تاکہ روشنی میرے چہرے پر نہ پڑے اور وہ فوری طور پر مجھے دیکھ کر شک نہ کرے۔ مجھے یہ خدشہ بھی تھا کہ اگر وہ مجھے نہ پہچان پایا تو کوئی خطرناک قدم بھی اٹھا سکتا ہے۔

"خان..........؟" سلطان کی سرسراتی ہوئی آواز آئی۔

"سلطان.......... باہر آ.........." میں نے فوراً کہا۔

"کک.......... کون ہے تُو..........؟" وہ چونک گیا۔ شاید وہ میری آواز سن کر چونک گیا تھا۔ "تُو خان نہیں ہے.........." اس نے تیز سرگوشی میں کہا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"سلطان.......... میری بات سن.........." میں جلدی سے روشنی میں آ گیا۔ میں نے اپنا چہرہ کھڑکی سے قریب کر لیا۔ "میں بالا ہوں.......... وہ جو آیا ہے وہ بالا نہیں ہے' بلکہ جمال ہے.......... وہ میرے روپ میں یہاں آیا ہے۔ تُو باہر آ سلطان میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔"

"بات سن بے.......... اگر تُو مجھے بے وقوف سمجھ رہا ہے تو.......... تُو دنیا کا بے وقوف ترین آدمی ہے"۔ اتنا کہہ کر سلطان نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"سن سلطان.......... اگر تجھے یقین نہیں آتا تو.......... تو سن.......... میں نے جمال وغیرہ کو یہ بتایا تھا کہ تُو فاریہ کا پرانا ملازم ہے۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ تُو میرا یار ہے۔ تُو اس سے بات کر کے دیکھ لے۔ تجھے مجھ پر یقین آ جائے گا۔ میں ان کی قید میں تھا۔ سلطان' میں خود نہیں گیا تھا۔ مجھے اغوا کیا گیا تھا۔ اب بھی اگر تجھے یقین نہیں آتا تو.......... سارے نقصان کا ذمے دار تُو ہو گا۔ میں.......... میں جا رہا ہوں۔ وہاں مین روڈ پر کھڑا رہوں گا۔ جب تجھے یقین آ جائے تو تُو میرے پاس آ جانا اور سن یہ بات فاریہ کو ضرور بتا دے کہ وہ میں نہیں جمال ہے۔ شاید وہ جانتی ہو۔ اسے کہنا کہ بالا باہر کھڑا ہے۔" میں اتنا کہہ کر پلٹ گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ سلطان کا ہاتھ جیب میں کیوں گیا ہے۔ شاید اس کی جیب میں پستول تھا۔

"سن..........!" وہ ایک دم پکار اٹھا۔

میں رک گیا مگر میں نے پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔

"ٹھہر جا.......... میں ابھی آتا ہوں۔" وہ بولا۔

میں نے گہرا سانس لے کر آنکھیں موند لیں۔ شاید اسے میری باتوں پر یقین آ گیا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ باہر آ گیا۔ اس نے چوکیدار سے گیٹ بند کرنے کو کہا اور میرے قریب آ گیا۔

"یہاں سے کہیں اور چل پھر بات کریں گے۔" اس نے اجنبی لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔ میں جو چند لمحوں پہلے خوش ہو گیا تھا وہ شاید مجھے پہچان گیا ہے پھر بجھ گیا۔ بہرحال یہ کیا کم تھا کہ وہ مجھ سے بات کرنے پر تیار ہو گیا تھا۔

میں اس کے ساتھ چلتا رہا۔ اس نے تمام راستے کوئی بات نہ کی اور اس کا ہاتھ اب

بھی کوٹ کی جیب میں تھا۔ یہ کوٹ اس نے شلوار قمیض کے اوپر پہن رکھا تھا۔

میں نے بھی راستے میں کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی کے ساتھ چلتا رہا۔ ہم مین روڈ پر پہنچ گئے۔ وہاں سے کچھ دور ایک ہوٹل تھا۔ ہم اس ہوٹل کی طرف بڑھ گئے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ کہیں سکون سے بیٹھ کر میں اسے تمام کہانی سناؤں۔ ہوٹل پہنچ کر اس نے ایک ٹیبل کی طرف اشارہ کیا جو بیرونی دروازے سے کافی فاصلے پر تھی اور جس کے قریب کی میزیں خالی پڑی تھیں۔

میں اسی طرف بڑھ گیا۔ سلطان نے ایک کرسی کھینچی اور اس پر بیٹھ گیا۔

"ہوں.......... اب بول تیرا کیا مقصد ہے؟"

تب میں نے شروع سے آخر تک ساری کہانی سنا دی۔ سلطان بڑی بے تعلقی سے کہانی سنتا رہا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا جسے دیکھ کر مجھے خوف آ رہا تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اسے میری باتوں پر یقین نہیں آیا ہے۔ مجھے اس کے اس رویے پر حیرت بھی ہو رہی تھی۔ کیوں کہ میں نے اسے وہ تمام باتیں بھی بتا دیں تھیں جو میں نے جمال کو مِس گائیڈ کرنے کے لیے بتائی تھیں۔

"سلطان کیا تُو نے اس میں ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی جو تجھے چونکا دیتی۔ میں نے تو اسے اپنے بارے میں بہت سی غلط باتیں بتائی تھیں۔ تاکہ تجھے اور فاریہ کو اس پر شک ہو جائے۔ تُو تو میرا پرانا یار ہے سلطان تُو کیسے دھوکا کھا گیا اور کیا سوہنی بھی.........."

"بات یہ ہے بھیا کہ.........."

"بالا کہہ سلطان بالا.......... خدا کی قسم میں بالا ہوں۔" میں تڑپ اٹھا۔

"تُو بالا ہی سہی مگر میں اس طرح یقین نہیں کر سکتا۔ جب تک میں فاریہ کو سب کچھ نہ بتا دوں۔ جب سے بالا آیا ہے مجھے تو اس سے بات کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ میں تو بیگ صاحب کی تیمارداری میں لگا ہوا تھا۔ رہی سوہنی تو.......... ظاہر ہے وہ دھوکا نہیں کھا سکتی اور اس نے ابھی تک مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے مجھے یہ اندازہ ہوتا کہ وہ شخص بالا نہیں کوئی اور ہے۔ مِس فاریہ بھی اس کے آنے کے بعد سے بہت خوش ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں تمہارے سلسلے میں کچھ نہیں کر سکوں گا"۔ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"سلطان.......... پلیز.......... خدا کے واسطے مجھے پہچان سلطان۔ داڑھی بڑھ جانے سے میں اتنا تو نہیں بدلا کہ پہچانا نہ جاؤں۔ اچھا تُو ایسا کر کہ مجھ سے کچھ پوچھ.......... کوئی ایسی بات جس سے تیری تسلی ہو سکے"۔

"دیکھو باؤ.......... بالا میرا یار تھا اور وہ مجھے بتا کر گیا تھا کہ یہاں طلسمی جال پھیلا ہوا ہے اس نے مجھے کوٹھی اور کوٹھی والوں کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔ میں اس سے وعدہ کر چکا ہوں اور کسی کے چکر میں نہیں آؤں گا سمجھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اس سے ابھی تک بات نہیں کر سکا ہوں مگر وہ گھر آ چکا ہے۔ تم جو بھی ہو اور جو بھی چکر چلانے والے ہو یہ سوچ کر کوئی قدم اٹھانا کہ میری اور بالے کی موجودگی میں تم موت کا مزہ چکھ سکتے ہو مگر اس کوٹھی میں قدم نہیں رکھ سکتے۔"

اتنا کہہ کر وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ "اچھا سلطان تُو ایسا کر میں بیٹھا ہوں تُو اس ملاقات کے بارے میں فاریہ کو بتا دے۔ اس سے کہہ کہ وہ مجھ سے مل لے۔ بس اتنی مہربانی کرنا کہ جمال کو.......... میرا مطلب ہے اس شخص کو جو میرے روپ میں وہاں موجود ہے۔ کچھ نہ بتانا مجھے یقین ہے کہ فاریہ ذہین ہے۔ وہ اب تک بہت سی باتیں نوٹ کر چکی ہو گی اور اسے یہ یقین ہو چکا ہو گا کہ وہ بالا نہیں ہے"۔

"ٹھیک ہے جی! میں انہیں بتا دیتا ہوں۔ تم چاہو تو یہاں انتظار کر سکتے ہو"۔ یہ کہہ کر سلطان آگے بڑھ گیا۔ میں وہیں کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا۔ وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو میں پھر ہوٹل میں چلا آیا اور شیشے کے بیرونی گیٹ کے قریب ہی ایک میز پر بیٹھ گیا۔ میں نے اشارے سے ویٹر کو بلایا اور اسے چائے کا کہہ کر شیشے سے باہر اس سڑک پر دیکھنے لگا جہاں سے سلطان گیا۔

مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ سلطان کافی ٹرینڈ ہو گیا تھا اور مجھ سے کیا ہوا وعدہ نبھا رہا تھا۔ میں نے سلطان کو کوٹھی میں چھوڑ کر کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ وہ بہادر اور ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ وفادار بھی تھا۔ گو اس نے مجھ سے بات کرتے ہوئے پوری احتیاط سے کام لیا تھا مگر پھر بھی نہ معلوم کیا بات تھی کہ سگریٹ جلاتے وقت اس کے ہاتھ کانپ گئے تھے۔ شاید وہ مجھے پہچان گیا تھا مگر فاریہ سے پوچھے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ یہ

اچھا ہی تھا۔ اس واقعے سے سلطان کا امتحان بھی ہو گیا تھا۔ وہ اس امتحان میں پورا اترا تھا اور مجھے اس کی خوشی تھی۔

اسی وقت ویٹر گرم گرم چائے لے آیا۔ میں نے کپ میں چائے بنائی اور سگریٹ سلگا کر اس کے لمبے لمبے کش لینے لگا۔ مجھے اس لمبے ڈرامے میں ایک نقصان یہ پہنچا تھا کہ میں اب باقاعدہ سگریٹ پینے لگا تھا۔ صبح سے یہ میرا دوسرا پیکٹ تھا۔ میں اس نشے کا عادی تو نہیں ہونا چاہتا تھا مگر حالات نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ میں نے ایک لمبا کش لے کر چائے کا کپ اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ اسی وقت فاریہ کی گلی سے ایک کار مین روڈ پر نکلی اور اسی ہوٹل کی طرف بڑھنے لگی۔ کار کی رفتار کم تھی۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ وہ کار سڑک پر لگے پول کے نیچے سے گزری تو میں نے پہچان لیا کہ یہ وہی کار ہے جسے کافی عرصہ میں بھی ڈرائیو کرتا رہا ہوں۔ جس وقت مجھے اغوا کیا گیا تھا اس وقت بھی میں اسی کار پر تھا کہ سڑک پر پڑی عورت کو دیکھ کر رک گیا تھا۔

میں نے جلدی سے چائے کے لمبے لمبے گھونٹ بھر کر کپ خالی کر دیا اور سگریٹ کا آخری کش لے کر سگریٹ کو جوتے سے مسل کر کاؤنٹر کے قریب آ گیا۔

میں نے کاؤنٹر پر پیسے ادا کیے اور شیشے کا دروازہ کھول کر باہر چلا آیا۔ کار اب قریب آ چکی تھی۔ میں ہوٹل کی دیوار سے لگ کر اس طرح کھڑا ہو گیا کہ مجھ پر روشنی نہ پڑ سکے۔ میں ان حالات میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ جمال نے سلطان اور فاریہ کی گفتگو سن لی ہو اور مجھے دیکھنے یہاں تک چلا آیا ہو۔ اسی خطرے کے پیشِ نظر میں خود کو چھپا رہا تھا تاکہ اگر ایسا ہو تو میں یہاں سے فرار ہو سکوں۔

کار اس قدر دھیمی آواز میں آگے بڑھ رہی تھی کہ میرا اضطراب بڑھنے لگا۔ مجھے نہ معلوم کیوں ایسا لگنے لگا جیسے کار میں واقعی جمال ہو۔ اگر فاریہ ہوتی تو شاید اتنی کم رفتار میں یہاں تک نہ آتی بلکہ اسے تو اُڑ کر یہاں پہنچنا چاہیے تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اسے ضرور پہچان گئی ہو گی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے دیوار سے لگے لگے مخالف سمت بڑھنا شروع کر دیا۔ میں مکمل طور پر اندھیرے میں تھا اور یہ میرے حق میں بہتر تھا۔ میں نے اپنی رفتار ذرا تیز کر دی۔ کار اب ہوٹل کے قریب پہنچ چکی تھی مگر کار ہوٹل کے دروازے کے قریب رکنے کی بجائے اس سے کچھ فاصلے پر رک گئی۔ عین اسی وقت میں دیوار کے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

کنارے پر پہنچ گیا اور میں نے فوراً پیچھے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ اب میں قطعی محفوظ تھا۔ میں نے ذرا سا سر نکال کر کار کی سمت دیکھا۔ میرا خدشہ بالکل ٹھیک تھا۔ وہ جمال تھا اور تنہا تھا۔ وہ کار سے نکل کر ٹہلتا ہوا ہوٹل کی سمت بڑھ رہا تھا۔ میرا دل حلق میں دھڑکنے لگا اور میں تیزی سے پلٹ کر ہوٹل کی پچھلی سمت بھاگا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں یہاں سے بھاگ کر اپنی جان بچاؤں مگر یہ احساس بھی شدت سے ہونے لگا کہ میری آمد کا سن کر جمال کچھ بھی کر سکتا ہے۔ گویا اب فاریہ وغیرہ کی طرف سے خطرہ بڑھ گیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اپنی رفتار کم کر لی اور ہوٹل کی پچھلی سڑک سے ہوتا ہوا پھر اسی مین روڈ پر نکل آیا مگر اب میرے اور ہوٹل کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ میں نے دیکھا کار اب بھی وہیں کھڑی تھی۔

اس وقت ایک خیال میرے ذہن میں بجلی کی طرح کوندا اور اس خیال کے آتے ہی فاریہ کی کوٹھی کی طرف بھاگ پڑا مگر اس مرتبہ میں نے کوٹھی کی پچھلی سمت جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں کچھ ہی دیر میں کوٹھی کے پچھواڑے پہنچ گیا۔ میں جانتا تھا کہ یعقوب کا کمرا کہاں ہے اور یعقوب کے کمرے سے کچھ فاصلے پر دیوار کے ساتھ ہی بجری کا ڈھیر بھی تھا۔ میں نے اندھیرے میں ہی اندازہ لگایا اور گندے پانی کے پائپ کے ذریعے دیوار پر چڑھتا چلا گیا۔ تھوڑی سی محنت کے بعد ہی میں دیوار کے اس پار تھا۔ میرے چھلانگ لگانے سے کافی آواز ہوئی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ یعقوب اگر اپنے کمرے میں ہوا تو یہ آواز ضرور سن چکا ہو گا اسی لیے میں فوراً ہی اس کے کمرے کی دیوار کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ کافی دیر گزر جانے کے باوجود اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تو میں سمجھ گیا کہ یا تو وہ کچن میں ہے اور یا پھر وہ اس کوٹھی میں آیا ہی نہیں مگر مجھے یاد تھا کہ سلطان نے مجھے فون پر بتایا تھا کہ فاریہ یعقوب کو واپس لے آئی ہے۔

دور برآمدے میں روشن بلب کی روشنی راہداری میں اجالا کیے ہوئے تھی۔ چند قدم دور وہ کمرے تھے جن میں ہم یعنی میں، خان اور ہمارے دوسرے ساتھی پہلی بار آ کر ٹھہرے تھے اور جن میں سے ایک کمرا میرا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا کمرا لاک ہو گا کیوں کہ میرے کمرے میں اندھیرا تھا۔ البتہ میرے کمرے کے برابر والا کمرا روشن تھا۔ یہ غالباً سلطان کا کمرا تھا۔ میں نے اس کمرے میں جانے کی کوشش نہیں کی البتہ یعقوب کے

کمرے میں جانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ زیادہ محفوظ جگہ تھی۔ ویسے بھی یعقوب کو سب کچھ بتا کر میں اسے اپنے اعتماد میں لے سکتا تھا۔

یہ سوچ کر میں آگے بڑھا۔ میں نے یعقوب کے کمرے کے دروازہ پر دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا گو کمرے میں اندھیرا تھا مگر کھڑکیوں سے باہر کی روشنی چھن کر اندر آ رہی تھی اور یہ روشنی میرے لیے کافی تھی۔ میں الماری کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ اب مجھے یعقوب کا انتظار تھا۔ کمرے کی حالت سے پتا چلتا تھا کہ یعقوب یہیں ہے۔ ورنہ یہ کمرا بھی بند ہوتا' میں دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ یعقوب جلدی سے آ جائے۔

دعا مانگتے ہی میری دعا قبول ہو گئی تھی کیوں کہ عین اسی لمحے مجھے باہر آہٹ محسوس ہوئی میں سمٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ذرا دیر بعد کسی نے دروازہ کھولا اور ایک دم کمرے میں روشنی ہو گئی۔ میں الماری کی اڑ میں تھا اس لیے اس کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ اسے تو گمان بھی نہ ہو گا کہ میں یہاں ہو سکتا ہوں۔ وہ شاید تھکا ہوا تھا۔ آتے ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اب اس کی پشت میری جانب تھی۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر لپک کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تاکہ مجھے اچانک اپنے سامنے پا کر وہ چیخ نہ پڑے۔ ظاہر ہے کہ وہ مجھے اس حلئے میں تو پہچان ہی نہیں سکتا تھا۔

ایک دم منہ بند کرنے کی وجہ سے وہ تڑپ اٹھا۔ اس سے پہلے کہ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرتا میں نے اس کے کان کے پاس سرگوشی کی۔ ''یعقوب' میں بالا ہوں۔ بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچا ہوں۔ تم اگر کچھ دیر میری بات سن لو تو تم مجھے پہچان لو گے۔ وہ شخص جو میرے روپ میں آیا ہے وہ بالا نہیں بلکہ جمال ہے.......... بہادر کی بہن کا سسرالی رشتے دار۔ وہی جس نے سیماں کی ماں کو قتل کیا تھا۔ اس نے مجھ سے مشابہت کی وجہ سے یہ قدم اٹھایا ہے۔ پلیز یعقوب میری پوری کہانی سن لینا پھر کوئی قدم اٹھانا''۔

میری بات سن لینے کے بعد اس نے سر ہلایا تو میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا اور جلدی سے آگے بڑھ کر دروازے میں کنڈی لگا دی۔ یعقوب حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں اسٹول گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور پھر اسے شروع سے لے کر آخر تک ساری کہانی سنانا پڑی۔

میں نے اسے بتایا کہ میں نے جمال کو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا مگر جب

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

جمال وغیرہ نے میرا فون سنا اور سلطان کی زبانی پتہ چلا کہ فاریہ یعقوب کو لے آئی ہے تو انہوں نے پوچھا کہ یعقوب کون ہے اور کہاں گیا ہوا تھا۔ تب میں نے ان سے کہا کہ وہ بیگ صاحب سے ناراض ہو کر اپنی بیٹی کے گھر چلا گیا تھا اور فاریہ اسے منا کر لے آئی ہے۔ میری یہ بات سن کر یعقوب کی آنکھوں میں روشنی پھیل گئی۔

"اوہ........... بالے........... اب مجھے یقین آ گیا کہ تم ہی بالے ہو۔ جب مجھ سے اس شخص نے پوچھا تھا کہ تمہاری بیٹی کیسی ہے تو میں حیران ہو گیا تھا مگر اس سے پہلے کہ میں اسے جواباً کچھ کہتا' فاریہ بی بی نے مجھے آواز دے لی تھی۔ اس کے بعد مجھے اس سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا"۔

یہ دیکھ کر کہ یعقوب مجھے پہچان گیا ہے میری جان میں جان آ گئی۔ "یعقوب! یہ شخص جان گیا ہے کہ میں یہاں پہنچ گیا ہوں۔ مجھے سلطان سے اس بے وقوفی کی امید نہیں تھی کہ وہ میرے منع کرنے کے باوجود اسے میرے بارے میں بتائے گا۔"

"نہیں بالے........... سلطان نے اس سے تو کوئی بات نہیں کی تھی البتہ میں نے سلطان کو فاریہ بی بی سے چپکے چپکے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ ممکن ہے جمال نے اس کی بات سن لی ہو"۔

"ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے تم جا کر دیکھو کہ وہ واپس آ گیا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں آیا تو........... تو فاریہ کو میرے بارے میں بتا دو ورنہ وہ مزید پریشان ہو جائے گی اور سنو........... کیا وہ میرے ہی کمرے میں ٹھہرا ہے؟"

"ہاں........... وہ بالکل تمہاری ہی طرح رہ رہا ہے۔ تمہارے کمرے میں' ویسے وہ کل ہی تو آیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا ہو گا"۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔ تم جاؤ یعقوب اور واپسی پر کھانے کے لیے کچھ لے آنا' بہت بھوک لگی ہوئی ہے۔ نہ معلوم پریشانی میں میری بھوک کیوں بڑھ جاتی ہے"۔

وہ مسکرایا۔ "ہاں تم موٹے ہو گئے ہو' اور تمہارا حلیہ دیکھ کر تو کوئی تمہیں پہچان بھی نہیں سکتا۔ میں جاتا ہوں تم اتنی دیر میں نہا کر شیو بنا لو ورنہ واقعی فاریہ بی بی بھی تمہیں نہیں پہچانیں گی"۔

"تمہاری غیر موجودگی میں نہانا ٹھیک نہیں ہے۔ پانی گرنے کی آواز خطرناک ہو سکتی

ہے۔ البتہ شیو کر لیتا ہوں"۔

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ بہرحال میں جاتا ہوں اگر دیر ہو جائے تو پریشان نہ ہونا' میں سب کام نمٹا کر ہی آؤں گا۔ ویسے کھانا تو میں پکا چکا ہوں۔ حمیدہ بی بی سے کہہ دوں گا باقی کام سنبھال لیں گی"۔

"ارے ہاں........... وہ رحمتے نام کا آدمی آیا ہے یہاں"۔

"ہاں........... تم کیسے جانتے ہو؟"

تب میں نے اسے بتایا کہ اس سے میری ملاقات کیسے ہوئی تھی اور یہ بھی بتایا کہ میں نے اس کے ہاتھ فاریہ کو میسج بھی بھیجا تھا۔

"پتا نہیں اس نے میسج پہنچایا یا نہیں۔ میں نے تو ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی جس سے اندازہ ہوتا کہ فاریہ کو اس نے کچھ بتایا ہے۔ ویسے کافی بے وقوف آدمی لگتا ہے"۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ اور سنو اگر جمال موجود ہو تو احتیاط کرنا"۔

اس نے سر ہلایا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اندر سے کنڈی لگا دی۔ میرے اعصاب کا تناؤ ایک دم ختم ہو گیا تھا اور یکایک میرے بدن کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا تھا۔ میں بے سدھ ہو کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ میں نے کمرے کی لائٹ بھی یعقوب کے جاتے ہی بند کر دی تھی البتہ باتھ روم کی لائٹ جلا کر دروازے کو کچھ کھلا چھوڑ دیا تھا تاکہ اس کی روشنی اندر آتی رہے۔

میں کچھ دیر تک یونہی لیٹا رہا۔ پھر میں نے اٹھ کر شیو بنایا' شیو بنا کر میں پھر لیٹ گیا۔ یعقوب کو گئے تقریباً آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا۔ میرا دل گھبرانے لگا۔ اسے اتنی دیر کیوں ہو گئی۔ یہی خیال مجھے پریشان کر رہا تھا۔ ذہن میں برے برے خیالات آ رہے تھے' میرا دل چاہا کہ خود باہر نکل کر دیکھوں مگر یہ بھی خطرناک تھا۔ میں بے چین ہو کر اٹھ بیٹھا۔

اسی وقت قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں لپک کر دروازے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے دھیرے سے کنڈی کھول دی اور دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں بعد آہستگی سے دروازہ کھل گیا۔ وہ یعقوب تھا۔ اس نے سرگوشی میں میرا نام لیا۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔ میں نے جلدی سے کنڈی لگا کر لائٹ آن کر دی۔

"اتنی دیر کیوں کر دی تم نے؟"

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

”وہ جمال واپس آگیا ہے۔ وہ فاریہ بی بی کے ساتھ بیٹھا تھا بالے.......... فاریہ بی بی بہت پریشان لگ رہی تھیں اور.......... اور بالے میں نے اس کی آنکھوں میں بڑی وحشیانہ چمک دیکھی ہے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے بالے.......... کوئی گڑ بڑ نہ ہو جائے“۔ یعقوب کافی گھبرایا ہوا تھا۔

”نہیں یعقوب.......... اب میں آگیا ہوں۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے گا“۔ میں نے پُرعزم لہجے میں جواب دیا۔

”اچھا تم کھانا تو کھالو“۔ اس نے ٹرے میرے سامنے رکھ دی۔

میں اور یعقوب کھانا کھانے لگے۔ اس دوران میں میرا ذہن مسلسل تیزی سے سوچ رہا تھا۔ یہ بڑی گڑ بڑ ہو گئی تھی کہ اسے میری آمد کا علم ہو گیا تھا۔ یعقوب کی گھبراہٹ ٹھیک ہی تھی۔ ایسے حالات میں وہ کوئی بھی قدم اٹھا سکتا تھا۔

”سنو.......... تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟“ میں نے اچانک پوچھا۔

”نہیں۔ پہلے میرے پاس پستول تھی مگر فاریہ بی بی کے آدمیوں نے وہ پستول لے لی تھی“۔

”ٹھیک ہے تم ایسا کرو کہ کسی نہ کسی طرح سلطان سے بات کرو۔ اسے یقین دلاؤ کہ میں ہی بالا ہوں“۔

”میرا خیال ہے کہ اب اسے یقین آگیا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ جب اس نے فاریہ بی بی سے بات کی ہو گی تو فاریہ بی بی نے اسے بتایا ہو گا کہ..........“

”خدا کرے ایسا ہی ہوا ہو‘ تم اسے یہاں تک لے آؤ“۔

”میں کوشش کرتا ہوں۔ اس وقت تو وہ لوگ کھانا کھا رہے ہیں۔ سلطان‘ بیگ صاحب کے ساتھ ہے“۔

”کیا بیگ صاحب ان لوگوں کے ساتھ کھانا نہیں کھا رہے؟“

”نہیں وہ اپنے کمرے میں ہیں۔ وہ کافی بیمار ہیں بالے“۔

”تو پھر تو آسان ہے.......... تم بیگ صاحب کے کمرے میں جا کر انہیں بھی بتا دو کہ..........“ میں ایک دم چپ ہو گیا۔ ”نہیں انہیں ابھی کچھ نہ بتاؤ۔ وہ پریشان ہو جائیں گے۔ تم سلطان کو وہاں سے بلا کر بتا دو۔ ایسا کرنا بہت ضروری ہے یعقوب‘ ورنہ آج کچھ

بھی ہو سکتا ہے“۔

”ٹھیک ہے بالے‘ تم کھانا کھا لو پھر میں برتن لے کر جاتا ہوں“۔ اس نے جواب دیا۔

”بس لے جاؤ“۔ میں نے فوراً ہی ہاتھ کھینچ لیا۔

یعقوب نے ٹرے اٹھائی اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے پھر لائٹ آف کر کے دروازہ بند کر لیا۔ میں بالکل چوکنا تھا اور دروازے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا تھا کہ مبادا جمال کو کسی قسم کا شک ہو جائے اور وہ یہاں تک پہنچ جائے۔

تقریباً بیس منٹ کے بعد ہی یعقوب واپس آگیا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی میں نے پھر لائٹ جلا دی۔ اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔

”کیا ہوا؟“

”سلطان کو بتا دیا۔ اسے یقین ہے کہ تم ہی بالے ہو اور فاریہ کو بھی معلوم ہے مگر جمال ان دونوں کی باتیں سن چکا ہے اور اسے شک ہو گیا ہے کہ وہ باتیں تمہارے ہی بارے میں تھیں لیکن شاید اسے یقین نہیں ہے‘ کیوں کہ سلطان کہتا ہے کہ اس نے بہت احتیاط کی تھی“۔

”اب.......... جمال کہاں ہے اور سلطان؟“

”جمال اب بھی ڈائننگ روم میں ہے۔ وہ لوگ چائے پی رہے ہیں۔ فاریہ اور زاریہ اس کے ساتھ ہیں۔ سلطان آدھے ایک گھنٹے بعد یہاں آئے گا“۔

یہ سن کر مجھے اطمینان ہو گیا۔ اب سلطان بھی چوکنا ہو گیا ہو گا اور فاریہ بھی۔ ممکن ہے فاریہ اپنے طور پر کوئی قدم اٹھائے۔ بہرحال اب حالات میرے قابو میں تھے اور میں کافی مطمئن تھا۔

یعقوب بھی اب اتنا نہیں گھبرا رہا تھا جتنا کہ پہلے گھبرایا ہوا تھا۔ یعقوب اپنے ساتھ چائے کا تھرمس بھی لایا تھا۔ وہ کیوں کہ چائے کا بہت عادی تھا اس لیے رات کو تھرمس میں چائے رکھا کرتا تھا۔ مجھے بھی چائے کی طلب محسوس ہو رہی۔ یعقوب نے مجھے چائے دی۔ میں چائے پیتا رہا اور آئندہ کے بارے میں لائحہ عمل طے کرتا رہا۔ یعقوب بھی کچھ سوچ رہا تھا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

میں نہیں جانتا تھا کہ اب فاریہ کیا قدم اٹھائے مگر میری خواہش تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح انسپکٹر قدیر کو اطلاع کر دے۔ وہ پھر بھی حالات کو سنبھال سکتا تھا۔

آدھا گھنٹا معلوم نہیں کس طرح گزرا۔ آدھے گھنٹے بعد باہر قدموں کی آہٹ سن کر میں باتھ روم میں گھس گیا۔ یہ میں نے احتیاطاً کیا تھا ورنہ مجھے یقین تھا کہ وہ سلطان ہی ہو گا۔

یعقوب پلنگ پر لیٹ گیا۔ چند لمحوں بعد دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ یعقوب نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہ سلطان ہی تھا۔ یعقوب کے دروازہ کھولتے ہی وہ جلدی سے اندر آ گیا۔ یعقوب نے فوراً کنڈی لگا دی۔ میں باتھ روم سے باہر نکل آیا۔ مجھے دیکھتے ہی سلطان مجھ سے لپٹ گیا۔

"بالے......... میرے یار......... کہاں چلا گیا تھا تو.........؟"

"ساری کہانی تو میں تجھے سنا چکا ہوں۔ تو نے اس وقت میرا یقین کیوں نہ کیا سلطان؟"

"بس یار' میں چاہتا تھا یقین کر لوں مگر......... پتا نہیں دل ڈرتا تھا۔ سوچا میں تو ان پڑھ ہوں' جاہل ہوں' اتنی عقل نہیں میرے اندر' کوئی غلطی نہ کر بیٹھوں اس لیے فاریہ بی بی سے پوچھ لوں اور پھر بالے......... وہ شخص تو کوئی جادوگر لگتا ہے۔ اس میں اور تجھ میں ذرا بھی فرق نہیں' بالکل تیرے جیسا ہے وہ۔ یہ تو مجھے کس جادو کی حویلی میں لے آیا ہے بالے!"

"شش......... آہستہ بول!" میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر آہستہ سے کہا۔

پھر ہم تینوں کافی دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ سلطان نے مجھے بتایا کہ فاریہ کو بھی اس پر شک تھا اور جب سلطان نے میرے بارے میں بتایا تو اس نے کہا تھا۔ "سلطان وہ سچ کہتا ہے"۔ مگر اس سے پہلے کہ سلطان اور فاریہ مجھے دیکھنے نکلتے۔ جمال گاڑی اسٹارٹ کر کے گیٹ کی طرف بڑھ چکا تھا۔ بعد میں حمیدہ نے بتایا کہ وہ دونوں کو چپکے چپکے باتیں کرتے دیکھ چکا ہے۔ حمیدہ بھی اپنے داماد سے میرے بارے میں سن کر فاریہ کو بتا چکی تھی۔ سلطان نے بتایا کہ فاریہ اسی وقت سے پریشان تھی مگر غالباً وہ جلد بازی میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتی تھی جو پریشانی کا باعث بنتا۔

"سلطان......... فاریہ سے کہو کہ وہ انسپکٹر قدیر کو بتا دے"۔ میں نے کہا۔

"مگر وہ ایک لمحہ بھی اسے تنہا نہیں چھوڑ رہا ہے۔ کل ہی تو وہ آیا ہے۔ کل تو فاریہ کو گمان بھی نہ تھا کہ وہ تم نہیں ہو۔ نہ معلوم اس نے کیا کہانی اسے سنائی تھی کہ وہ بہت خوش تھی مگر رحمتے کے آنے کے بعد سے میں اسے پریشان سا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے فیکٹری جانا چاہا تو جمال بھی کھڑا ہو گیا تھا کہ وہ بھی چلے گا۔ فاریہ چاہتی تو اسے روک سکتی تھی مگر شاید خوف کی وجہ سے وہ خاموش ہو گئی۔ پھر وہ فیکٹری چلی گئی۔ جمال اس کے ساتھ ہی تھا مگر ایک گھنٹے کے بعد وہ واپس آ گئی۔ جبھی سے جمال اسے جونک کی مانند چمٹا ہوا ہے"۔

"ہاں......... وہ بہت چالاک ہے سلطان' میرے فرار کے بعد بھی اس کا یہاں پہنچ جانا اس کی جرأت مندی اور خطرناک ارادوں کا مظہر ہے۔ وہ تو پہلے روز ہی سے چوکنا ہو گا"۔

"بالے......... سن اگر کسی طرح اسے بے ہوش کر دیا جائے تو.........!" سلطان اچانک بول اٹھا۔

"میرا خیال ہے کہ ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ تمہارے پاس پستول ہے؟"

"ہاں......... اور وہ اس وقت ڈرائنگ روم میں ہے۔ سن بالے......... میں کسی بہانے اندر جاتا ہوں اور اسے پستول کی زد پر لے لیتا ہوں۔ تم دونوں بھی وہیں قریب رہنا اور پستول کی زد پر آتے ہی تم دونوں بھی اندر آ جانا"۔

میں نے یعقوب کی طرف دیکھا۔ وہ میری ہی سمت دیکھ رہا تھا۔ "جیسا کہو' میں تو فاریہ بی بی پر اپنی جان قربان کر کے اس شک کو ختم کرنا چاہتا ہوں جو انہیں مجھ پر ہو گیا تھا اور بہ قول تمہارے وہ سب کچھ انہی حرامزادوں کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ عورت انہی کی بھیجی ہوئی تھی"۔ یعقوب نے پُرجوش انداز میں کہا۔

میں اس سسپنس سے تنگ آ چکا تھا اس لیے ہمت کر کے کھڑا ہو گیا۔ ہم تینوں باری باری کمرے سے باہر آ گئے۔ سب سے آگے سلطان تھا اس کے پیچھے یعقوب اور آخر میں' میں۔ برآمدے میں پہنچتے ہی سلطان ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ میں اور یعقوب وہیں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

دیکھے رہے۔ پھر یعقوب آگے بڑھا اور کچن میں چلا گیا۔ وہاں سے اس نے دودھ کا گلاس لیا اور تیزی سے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی مجھے فاریہ کی چیخ سنائی دی اور میں چھلانگ لگا کر ڈرائنگ روم کی طرف بھاگا۔

اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ یعقوب اور سلطان اسے جکڑے کھڑے ہیں۔ فاریہ مجھے دیکھتے ہی میری طرف لپکی۔ ”اقبال.......... پکڑ لو اسے“۔ وہ چیخی۔ اسی وقت نہ معلوم کیسے جمال نے یعقوب کے پیٹ میں لات مار دی اور یعقوب جھٹکے سے پیچھے کی طرف گرا۔

”خبردار اگر کوئی حرکت کی تو گولی چلا دوں گا۔“ سلطان نے گرج کر کہا۔ اس نے پستول اس کی گردن پر رکھ دیا تھا اور یہی اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ اسے چند قدم دور ہٹ جانا چاہیے تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے اس کی غلطی کا احساس دلاتا۔ جمال نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گھوم کر اپنا دایاں بازو چلایا اور پستول سلطان کے ہاتھ سے دور جا گرا۔ میں نے اس کے اوپر چھلانگ لگائی مگر وہ مچھلی کی طرح پھسل کر میری دسترس سے دور ہو گیا۔

مگر یعقوب نے اس سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا‘ پشت کی طرف جا کر اسے بری طرح جکڑ لیا۔ فاریہ اس سچویشن سے بری طرح گھبرا گئی تھی۔ وہ چیختی ہوئی باہر بھاگی۔ اس کی چیخ سن کر چوکیدار اپنی رائفل سیدھی کر کے ڈرائنگ روم میں گھستا چلا آیا۔ اس نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی مجھے نشانے پر لے لیا۔ اس کے نزدیک تو میں ہی اجنبی تھا۔

”خان.......... یہ اقبال ہے“۔ سلطان اس کا مقصد سمجھتے ہی چیخا اور اسے پکڑ لیا۔

”مگر.......... یہ تو..........“

”سنو خان یہ اقبال صاحب ہے اور یہ بہروپیا ہے جو اقبال کے روپ میں ہے اقبال نہیں ہے“۔ فاریہ نے کہا تو وہ حیرانگی سے پلکیں جھپکانے لگا۔ شاید بات اس کی سمجھ میں ابھی تک نہیں آئی تھی مگر اس نے اپنی مالکن کے کہنے پر مجھے ضرور بخش دیا تھا۔

اتنی دیر میں سلطان اور یعقوب جمال کو پوری طرح گرفت میں لے چکے تھے۔ میں نے چوکیدار سے رسی لانے کو کہا تو وہ فاریہ کی طرف دیکھنے لگا یوں جیسے اس سے اجازت

طلب کر رہا ہو۔

فاریہ نے سر ہلایا تو وہ تیزی سے باہر کی طرف چلا گیا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ رسی لیے اندر داخل ہوا۔ اس دوران میں میں بھی جمال کو جکڑ چکا تھا۔ رسی کے آتے ہی میں نے اس کے ہاتھ اور پاؤں کس کے باندھ دیے۔ فاریہ کو جیسے ہی اس کی طرف سے اطمینان ہوا وہ فون کی طرف لپکی اور میرے اندازے کے مطابق ہی وہ چند لمحوں بعد انسپکٹر قدیر سے بات کر رہی تھی۔

”مس فاریہ‘ تم لوگ بہت پچھتاؤ گے۔ اب بھی وقت ہے مجھے آزاد کر دو ورنہ انجام کی تمام تر ذمے داری تم لوگوں پر ہو گی“۔ فاریہ کے ریسیور رکھتے ہی جمال بول اٹھا۔

”اگر مجھے کبھی بھی انجام سے خوف محسوس ہوتا مسٹر جمال تو میں تم جیسے کتوں سے ٹکر لینے کی ہمت نہ کرتی۔“ فاریہ نے نفرت سے جواب دیا۔

”ایک بار پھر سوچ لو مس فاریہ..........“ اس نے مسکرا کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں عیاری اور چہرے پر بڑی خبیث مسکراہٹ تھی۔ ان دونوں چیزوں کے علاوہ اس کے لہجے کے اعتماد نے مجھے چونکا دیا تھا۔ وہ پوری طرح پھنس جانے کی باوجود جس قدر پُراعتماد لگ رہا تھا وہ بہت عجیب سی بات تھی۔ کم از کم میرے لیے اس کا یہ انداز خطرے کی گھنٹی کی حیثیت رکھتا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے یقین ہو کہ عین وقت پر فرشتے آ کر اسے غائب کر دیں گے یا یوں جیسے وہ اپنی مرضی سے صوفے پر بیٹھا ہو اور جب چاہے گا اٹھ کر چلا جائے گا۔ میں اس کی تمام حرکات و سکنات کا بہ غور جائزہ لے رہا تھا۔

”مسٹر جمال‘ تم ہمیشہ تو نہیں بچ سکتے.......... ایک نہ ایک دن تو تم جیسے لوگوں کو پکڑا ہی جانا ہوتا ہے“۔

”سنیں مس فاریہ.......... ہم جیسے لوگ کبھی بھی پکڑے نہیں جاتے۔ اس لیے کہ ہم سوچے سمجھے اور پلان کیے بغیر کبھی کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔ ہاں البتہ آپ جیسے لوگ ہمیشہ اس خوش فہمی کا شکار رہتے ہیں کہ..........“

”اے مسٹر“۔ میں نے گرج کر کہا۔ ”خاموش ہو جاؤ ورنہ ساری چرب زبانی نکال دوں گا ایک منٹ میں“۔

اس نے بڑے انداز سے میری طرف دیکھا۔ ”مسٹر اقبال.......... بڑے افسوس کی

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

بات ہے کہ ہم نے جس میزبانی کا مظاہرہ کیا تھا آپ کے ساتھ' آپ دو ہی دن میں سب بھول گئے"۔

"اوئے شودے.......... چپ کر جا ورنہ جبڑا توڑ دوں گا تیرا"۔ سلطان ایک دم طیش میں آ گیا۔

"سلطان.......... اقبال پلیز.......... یہ اس کی چال ہے۔ یہ تم لوگوں کو طیش دلا رہا ہے تاکہ تم لوگ.........." فاریہ اچانک چپ ہو کر کچھ سننے لگی۔ "شاید انسپکٹر قدیر آ گئے"۔ یہ کہہ کر وہ ڈرائنگ روم سے باہر جانے لگی۔ میں نے بھی اس کے ساتھ جانے کے لیے قدم اٹھایا مگر دوسرے ہی لمحے گولی چلنے کی آواز کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم میں اندھیرا چھا گیا۔

ہم سب بیک وقت چیخ پڑے۔ میں نے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی۔ میں فاریہ کو آنے والی افتاد سے بچانا چاہتا تھا۔ میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ میں سیدھا فاریہ سے ٹکرایا اور اسے لیتا ہوا فرش پر گر گیا۔ وہ بری طرح چیخ رہی تھی۔

"چپ..........!" میں نے سرگوشی کی اور وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ "صوفے کے پیچھے"۔ میں نے پھر سرگوشی کی اور وہ گھٹنوں کے بل صوفے کے پیچھے چلی گئی۔ یہ احساس ہوتے ہی کہ وہ محفوظ ہو گئی ہے میں پلٹ پڑا۔ اندھیرے میں اٹھا پٹخ کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ شاید سلطان اور یعقوب جمال کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ دبی دبی کراہیں اور غرانے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں مگر میں نے اس طرف دھیان نہ دیا بلکہ بے آواز ڈرائنگ روم کے دروازے سے باہر آ گیا۔ ڈرائنگ روم کے بلب پر گولی باہر سے چلائی گئی تھی اور میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کوٹھی میں وہ غدار کون ہے جو جمال کی مدد کے لیے یہاں موجود ہے۔ چوکیدار پر شک کرنا بیکار تھا کیوں کہ گولی چلائے جانے کے وقت وہ ہونقوں کی طرح کھڑا ہم سب کو دیکھ رہا تھا اور اس کی رائفل کا رخ زمین کی طرف تھا۔ یعقوب اور سلطان میری مدد کر رہے تھے۔ وہ دونوں بھی میرے ساتھ تھے جبکہ گولی باہر سے چلائی گئی تھی۔ میں رینگتا ہوا باہر آیا تب مجھے احساس ہوا کہ پوری کوٹھی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی ہے۔ شاید کسی نے مین سوئچ آف کر دیا تھا۔ ذرا ہی دیر بعد سوہنی' ماسی میراں اور زاریہ کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ تینوں شاید اسی طرف آ رہی

تھیں۔

"واپس جاؤ.......... اپنے کمرے میں واپس جاؤ۔ اندر سے کمرا لاک کر لو۔ جاؤ.......... جلدی کرو"۔ میں ایک دم چیخ پڑا۔

میری آواز سنتے ہی وہ تینوں چیختی ہوئی واپس بھاگیں۔ میں جو اب دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ دھیرے دھیرے مین گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ اسی لمحے گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور میں ساری احتیاط بالائے طاق رکھ کر پورچ کی طرف بھاگ پڑا۔

فاریہ کی کار گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی اور گیٹ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ اسی وقت چوکیدار' سلطان اور یعقوب کے ساتھ ہی فاریہ بھی بدکتی ہوئی میرے قریب پہنچ گئی۔

"اقبال.......... وہ بھاگ رہا ہے.......... پکڑو.........."

سلطان اور یعقوب بھی کار کے پیچھے بھاگے۔ اسی لمحے کار کی کھڑکی کے قریب ایک شعلہ سا لپکا اور ساتھ ہی گولی چلنے کی آواز آئی۔

"بچو.........." میں چیخا۔

مگر یعقوب کو ہم سب ہی گرتے دیکھ چکے تھے۔ آسمان پر گو چاند نہیں تھا مگر پھر بھی یہاں کچھ روشنی تھی اور اسی روشنی میں ہم سب اس کی طرف لپکے۔ کار تیر کی طرح گیٹ سے نکل کر ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں اور فاریہ یعقوب کے پاس رک گئے مگر سلطان اور چوکیدار کار کے پیچھے بھاگتے چلے گئے۔ میں جانتا تھا کہ اب یہ سب کوششیں بیکار ہیں۔

"سلطان.......... مین سوئچ آن کرو"۔ میں چیخا۔

سلطان کے واپس آنے سے پہلے ہی فاریہ بھاگ کر سیڑھیوں کے پاس چلی گئی جہاں سوئچ بورڈ تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے کوٹھی جگمگا اٹھی۔ گولی یعقوب کے دائیں کندھے میں لگی تھی اور خون بری طرح بہہ رہا تھا۔

"ارے کیا ہوا.......... کیا ہو رہا ہے یہ سب.......... فاریہ.......... سلطان.......... کیا ہو گیا؟" اسی وقت بیگ صاحب کی بھرائی ہوئی آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دیوار کا سہارا لیے آنکھیں پھاڑے کھڑے تھے۔ پھر اچانک ان کی نگاہ یعقوب پر پڑی۔ "اسے کیا ہو گیا.......... گولی کس نے چلائی تھی..........؟"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتے۔ اچانک پولیس جیپ گیٹ کے پاس آ کر رکی اور انسپکٹر

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

قدیر اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ بھاگتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

"ہینڈز اپ!" اس نے میرے قریب آتے ہی اپنے ریوالور کا رخ میری طرف کر دیا اور میں نے لمبا سانس لے کر اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔

"یہ بالا ہے قدیر"۔ فاریہ نے کہا۔

"ہیں............؟" اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "پھر وہ کون تھا جو............!"

"کون............؟" اس بار میں نے پوچھا۔

"وہ ابھی مجھے گلی کے کونے پر ملا تھا۔ میری جیپ دیکھ کر اس نے گاڑی روک لی تھی اور مجھے بتایا تھا کہ یہاں............"

"اوہ............ کمال کا جرأت مند آدمی ہے"۔ فاریہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

اتنی دیر میں سلطان وغیرہ یعقوب کو اٹھا کر ڈرائنگ روم میں لے گئے تھے ہم لوگ بھی وہیں چلے گئے۔ ہم نے سب سے پہلے یعقوب کا زخم دیکھا۔ گولی اس کے کاندھے پر لگی تھی۔ سلطان نے اپنی چادر کو پھاڑ کر اس کے زخم کو باندھ دیا تھا تاکہ خون رک سکے۔ فاریہ نے ڈاکٹر طارق کو فون کر دیا تھا۔ بیگ صاحب اب بھی ہونقوں کی طرح آنکھیں پھاڑے بیٹھے تھے۔ حمیدہ بی بی نے انہیں سہارا دے کر صوفے پر بٹھا دیا تھا اور اب فق چہرہ لیے سب کو دیکھ رہی تھی۔

"قصہ کیا ہے فاریہ؟" انسپکٹر قدیر نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ وہ اس سے پہلے اپنے آدمیوں کو جمال کے پیچھے روانہ کر چکا تھا۔

"تم بیٹھو میں سب کچھ بتاتی ہوں"۔

پھر فاریہ انسپکٹر قدیر کو جمال وغیرہ کے بارے میں بتانے لگی۔ میں اٹھ کر اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں سوہنی' ماسی میراں اور زاریہ تھے۔ میری آواز سن کر زاریہ نے دروازہ کھول دیا اور مجھ پر نگاہ پڑتے ہی بوکھلا گئی شاید اس لیے کہ میرے بال بھورے تھے۔

"زاریہ کیسی ہو تم؟"

"تت............ تم کون ہو؟"

"میں اقبال ہوں زاریہ............" میں نے نرمی سے جواب دیا۔

"اقبال........................؟"

"بالے............ تُو............ تُو کہاں چلا گیا تھا؟" اچانک سوہنی کی سرسراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

ماسی میراں اور زاریہ نے چونک کر سوہنی کو دیکھا۔ شاید انہیں یقین نہیں آیا تھا کہ میں ہی اقبال ہوں مگر سوہنی مجھے پہچان گئی تھی۔

"یہ لمبی داستان ہے سوہنی........................ پھر سناؤں گا۔" پھر میں زاریہ سے مخاطب ہوا۔ "زاریہ میں ہی اقبال ہوں اور وہ جو میرے روپ میں یہاں آیا تھا وہ............ وہ جمال تھا جو فرار ہو چکا ہے"۔

"یہ گولی کس نے چلائی تھی۔ باہر خیریت ہے نا؟"

"ہاں سب خیریت ہے۔ بس یعقوب زخمی ہو گیا ہے............ گولی جمال نے ہی چلائی تھی"۔

اتنا سنتے ہی زاریہ ڈرائنگ روم کی طرف دوڑ گئی۔ ہم سب بھی اس کے پیچھے چل پڑے۔ میں سوہنی کو دیکھ کر فکر مند ہو گیا تھا۔ وہ بہت زیادہ کمزور ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کی ویرانی بہت بڑھ گئی تھی شاید علاج اسے موافق نہیں آیا تھا یا پھر اس کا مناسب علاج ہوا ہی نہیں تھا۔ اس سلسلے میں مجھے فاریہ سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ ظاہر ہے وہ بے حد پریشان رہی ہو گی۔ ایسی صورت میں وہ کسی بھی جانب پوری توجہ نہیں دے سکتی تھی۔

ہم ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو وہاں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ڈاکٹر طارق آ چکے تھے اور بڑے انہماک سے یعقوب کے زخم کو صاف کر رہے تھے۔ زاریہ' فاریہ کے کندھے سے ٹکی کھڑی تھی۔ سلطان' بیگ صاحب کو سہارا دے کر ان کے کمرے میں لے جا رہا تھا۔ یعقوب پوری طرح ہوش میں تھا اور زخمی ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر گہرا اطمینان تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ زخمی ہو کر فاریہ اور بیگ صاحب کے شکوک و شبہات دور کر چکا تھا۔

کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر طارق اور انسپکٹر قدیر چلے گئے۔ ہم سب وہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ سلطان بھی بیگ صاحب کو ان کے کمرے میں چھوڑ کر واپس آ چکا تھا۔ فاریہ نے حمیدہ کو چائے لانے کے لیے کہا اور اس کے جاتے ہی مجھ سے پوچھا۔

اقبال............ یہ سب کیا ہے؟"

تب میں نے اغوا ہونے سے لے کر یہاں پہنچنے تک کی ساری داستان اسے سنا دی۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

میرے گرد بیٹھے ہوئے باقی سب لوگ بھی حیرت سے میری کہانی سن رہے تھے۔ میں نے کوٹھی کے تہہ خانے والی بات کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ یہ ذکر میں سب کے سامنے کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں اس معاملے کو پہلے اپنے طور پر دیکھنا چاہتا تھا اسی لیے میں نے انسپکٹر قدیر کو بھی یہ بات نہیں بتائی تھی۔ میں تو ابھی یہ بھی طے نہیں کر پایا تھا کہ یہاں کسی تہ خانے کی موجودگی سے فاریہ یا بیگ صاحب واقف ہیں یا نہیں بلکہ یہ بھی ممکن تھا کہ مسٹر زید اور مسٹر جمال نے یہ ساری داستان خود ہی گھڑی ہو۔ ان کا مقصد کیا تھا یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ بہرحال میری داستان ختم ہوتے ہوتے رات بھیگ گئی مگر نیند ہم میں سے کسی کو بھی نہیں آ رہی تھی۔ میری باتیں ختم ہونے کے بعد فاریہ نے مجھے بتایا کہ زاریہ اب بالکل صحت مند ہے البتہ سوہنی کی صحت گرتی جا رہی ہے حالانکہ وہ اس کے علاج پر کافی توجہ دے رہی ہے۔

"میں ٹھیک ہونے والی نہیں.......... میرے اوپر پیسا اور وقت برباد نہ کرو"۔ سوہنی نے بھیگے لہجے میں جواب دیا۔

"مگر کیوں.......... سوہنی کیا زاریہ کی مثال تیرے سامنے نہیں.......... وہ بھی تو ٹھیک ہو گئی ہے"۔

"زاریہ کو ایسے گھاؤ کہاں لگے تھے بالے، جو میرے من میں لگے ہیں"۔

"سوہنی سارے گھاؤ بھر جاتے ہیں اور اب تو میں آ گیا ہوں۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا"۔

"ماسی.......... سوہنی کو کمرے میں لے جاؤ۔ اسے دوا دے دینا، اسے آرام کی ضرورت ہے"۔ فاریہ نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔

میں اس کی بات سن کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ فاریہ اس لہجے میں بات کرے گی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سوہنی کی موجودگی کو پسند ہی نہیں کر رہی۔

"چلو سوہنی.......... رات بہت ہو گئی ہے، صبح باتیں کریں گے"۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"بیٹھ پتر.......... میں لے جاتی ہوں"۔ ماسی نے دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا۔ فضا میں عجیب سا تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر سب کو دیکھا۔ سلطان نے فوراً نگاہیں چرا لیں اور یعقوب کو سہارا دے کر کھڑا کر دیا۔

کچھ دیر بعد ہی کمرے میں صرف فاریہ اور میں رہ گئے ہم دونوں کے علاوہ گمبھیر خاموشی تھی جو جاتے ہوئے قدموں کی آواز کے ساتھ ہی گہری ہوتی جا رہی تھی نہ معلوم کیوں میرا دل گھبرا گیا۔ میرا جی چاہا کہ اٹھ کر کہیں بھاگ جاؤں۔ قیامت کا حبس محسوس ہوا، یوں جیسے کوئی بڑا طوفان آنے والا ہو۔

"اقبال..........!"

اچانک گہری خاموشی میں فاریہ کی آواز کسی دھماکے سے کم نہ محسوس ہوئی۔

"یس میڈم!"

"اقبال.......... تم زندگی کا ہر رخ دیکھ چکے ہو، تم جانتے ہو کہ یہاں کسی شے کو ثبات نہیں، یہ بھی جانتے ہو کہ یہاں وہ کچھ نہیں ہوتا جس کی خواہش ہو۔ یہاں پستیوں سے بلندیوں اور بلندیوں سے پستی کی طرف زندگی اور موت دونوں ہی رواں رہتی ہیں"۔

"میڈم.......... یہ.......... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں.......... ایسی باتوں سے آپ کا مقصد کیا ہے؟"

"اقبال..........!" اس نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میڈم.......... کیا ماں کے بارے میں کوئی اطلاع..........؟"

"نہیں.......... اقبال.......... میں تمہیں دکھ دینا نہیں چاہتی.......... مگر خدا بعض ایسے کام سونپ دیتا ہے جو ناپسندیدہ ہوتے ہیں"۔

"میڈم.......... آپ کو جو کچھ کہنا ہے ایک دم کہہ دیں.......... میں.......... میں سب کچھ برداشت کر لوں گا.......... پلیز.......... یہ کیفیت میرے لیے بڑی اذیت ناک ہے"۔

"سوہنی چند روز کی مہمان ہے اقبال"۔ اتنا کہہ کر اس نے سر جھکا لیا اور میں سُن بیٹھا رہ گیا۔ مجھے ایسی کسی خبر کی توقع بھی نہ تھی۔

"مجھے افسوس ہے اقبال.......... کاش میں اس کے لیے کچھ کر سکتی"۔

"مگر.......... وہ تو ٹھیک ہے.......... اسے کچھ نہیں ہو سکتا، بس کمزوری ہی تو ہے.........."

"اس کے پھیپھڑے ختم ہو چکے ہیں اور.......... سرطان اندر ہی اندر پھیلتا جا رہا

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

ہے"۔

"سرطان..........؟"

"ہاں اقبال' میں نے جب اس کا مکمل چیک اپ کروایا تو پتا چلا کہ وہ کینسر کی مریضہ ہے اور یہ مرض اپنے آخری اسٹیج پر ہے۔ تب میں نے اسے اسپتال میں رکھنا مناسب نہیں سمجھا' ڈاکٹر طارق بھی اس سے متفق تھے اس لیے میں اسے گھر لے آئی۔ اقبال' میں چاہتی ہوں کہ اب تم ہم سب کو بھول کر اپنا ہر لمحہ اسے دے دو"۔

فاریہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"کیا وہ جانتی ہے؟"

"نہیں' ماسی میراں جانتی ہیں۔ انہیں بتانا ناگزیر ہو گیا تھا۔ تم نہیں جانتے اقبال' سوہنی کے بارے میں علم ہو جانے کے بعد میں نے یہ لمحات کس اذیت میں گزارے ہیں۔ جمال جب تمہارے روپ میں یہاں پہنچا تو میں جان گئی تھی کہ تم نہیں ہو مگر میں نے یہ بات کسی پر ظاہر نہ ہونے دی صرف یہ سوچ کے کہ اس طرح سوہنی کچھ تو خوش ہو جائے گی۔ اس کے آخری لمحات تمہاری جدائی کے اذیت ناک احساس سے تو ختم ہو جائیں گے مگر.......... وہ واقعی تم سے بے پناہ پیار کرتی ہے۔ جمال سے ملنے کے باوجود وہ خوش نہیں تھی بلکہ اس نے تو اسی رات مجھے کہا تھا کہ آپی.......... یہ بالا کتنا بدل گیا ہے۔ یہ سن کر مجھے اس کی محبت کا اندازہ ہو گیا تھا اقبال کہ وہ اپنے اور جمال کے درمیان اجنبیت کو کتنی جلدی محسوس کر گئی تھی"۔

وہ خاموش ہوئی تو مجھے احساس ہوا کہ میری خشک آنکھیں بھیگ چکی ہیں۔

"نہیں اقبال.......... پلیز' تم تو بہت دلیر ہو۔" وہ مجھے روتا دیکھ کر ایک دم رو پڑی

"اگر تم ایسا کرو گے تو اسے پتا چل جائے گا اقبال' اور یہ جان لینا کہ موت قریب آ رہی ہے بے حد کرب ناک ہوتا ہے"۔

وہ سچ کہتی تھی۔ میرا حوصلہ ختم ہو گیا تو وہ کیا کرے گی۔ یہ سوچ کر میں نے اپنی ہتھیلیوں سے آنکھیں خشک کر لیں۔ میں اسے بچا تو نہیں سکتا تھا مگر اس کی خالی جھولی میں چند لمحوں کی خوشیاں تو ڈال سکتا تھا۔ اس کے یہاں آنے کے بعد تو میں نے سوچا تھا کہ خوب گھماؤں گا۔ راوی کا وہ کنارہ دکھاؤں گا جہاں زندگی لہروں پر رقص کرتی محسوس ہوتی ہے۔ آسمانوں کی وہ انتہا دکھاؤں گا جہاں سورج انسانوں کی ساری خباثت اور ان کے تمام گناہوں کو

اپنی جھولی میں چھپائے چپکے سے سمندروں میں اتر جاتا ہے۔ میں نے تو سوچا تھا کہ میں اس کی تمام محرومیوں کو دور کر دوں گا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ میرے قریب آ جانے کے باوجود مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہے۔

میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

"اقبال.......... اسے زندگی کا احساس دلانے کی کوشش کرنا"۔

"جی!"

"ہاں! اقبال زندگی کا بھرپور احساس شاید اس کی عمر بڑھا دے"۔

اور میں سر ہلا کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل آیا۔ میں بے اختیار اس طرف بڑھ گیا جہاں ماسی میراں اور سوہنی موجود تھی۔ میرے دستک دینے پر ماسی میراں نے دروازہ کھولا۔ لمحہ بھر کو میری نگاہیں ماسی میراں کی نگاہوں سے ٹکرائیں اور میرے اندر درد کی لہریں اترتی چلی گئیں۔ ماسی میراں کی بھیگی پلکوں کے بیچ خاموش التجا لرز رہی تھی۔ مجھے اس کے حوصلے پر حیرت بھی ہوئی کہ وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی اکلوتی بیٹی کا ہر سانس موت کی طرف بڑھتا ہوا ایک قدم ہے' اس قدر خاموش تھی۔ میں زیادہ دیر اس کے سامنے کھڑا نہ رہ سکا اور اس بستر کی طرف بڑھ گیا جہاں لیٹی ہوئی سوہنی کی آنکھیں مجھے دیکھ کر چمک اٹھیں تھیں۔ "خدا کرے یہ چمک ہمیشہ قائم رہے"۔ میں نے بے اختیار دل میں دعا مانگی۔

"سوہنی.......... کیسی ہے تو؟" میں نے اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کے ریشمی بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں بالے' میں تو اسے دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ تو نہیں ہے۔ اس کی آنکھوں میں تیری آنکھوں والی بات ہی نہیں تھی بالے.......... خدا کا شکر ہے کہ تو واپس آ گیا۔ اگر تجھے کچھ ہو جاتا تو پھر ہم سب کیا کرتے؟"

"مجھے کچھ بھی نہیں ہوتا سوہنی' تو میرے لیے دعا جو کرتی ہے.......... کرتی ہے نا؟"

"ہاں بالے.......... سن.......... اب تو ماں کو لے کر آنا.......... وہ تیرا انتظار کرتی تھی۔ وہ یہاں آ جائے گی تو تیرے سارے دکھ ختم ہو جائیں گے"۔ اس نے معصومیت سے کہا اور میرا جی چاہا کہ چیخ کر روؤں.......... اور اسے بتا دوں کہ سوہنی میرے دکھ کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ ماں آ جائے تو بھی ختم نہیں ہوں گے اس لیے کہ پھر تو مجھ سے بچھڑ جائے گی تب

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

میں تجھے کہاں سے لاؤں گا کہاں تلاش کروں گا تجھے............ میں یہ سب سوچتا رہا مگر کچھ بھی نہ کر سکا۔ میرے لیے وہاں بیٹھنا دوبھر ہو رہا تھا اور وہ یوں باتیں کیے جا رہی تھی جیسے ساری باتیں آج ہی کر لینا چاہتی ہو، جیسے صبح کبھی نہیں ہوگی، اگلا دن کبھی نہیں آئے گا۔ میں نے چاہا کہ اسے روک دوں، اسے کہوں کہ اب وہ سو جائے، کچھ دیر آرام کر لے مگر عین اسی لمحے مجھے صغرا یاد آ گئی اور میں لرز اٹھا۔ اسے بھی تو میں نے زبردستی چپ کرا دیا تھا کہ وہ آرام کر لے اور پھر وہ ایسی خاموش ہوئی کہ میرے تڑپ تڑپ کر چیخنے پر بھی آرام سے سوتی رہی۔

یہ خیال آتے ہی میرا دل لرزنے لگا۔ میں باوجود چاہنے کے وہاں سے اٹھ نہ سکا۔ وہ بولتی رہی اور میں سنتا رہا۔ جانے کتنی رات گزر گئی۔ ماسی میراں بھی اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اچانک دروازے پر دستک کی ہلکی آواز ہوئی۔ میں نے فوراً دروازہ کھولا۔ مجھے یقین تھا کہ آنے والی فاریہ ہوگی، میرا خیال درست ثابت ہوا۔ فاریہ چائے کی ٹرالی لیے دروازے پر کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں گہری سرخی تیر رہی تھی اور ہونٹوں پر غمگین مسکراہٹ تھی۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ اس کی آنکھوں میں سرخی نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے ہے یا رونے کی وجہ سے۔

"ارے آپی، آپ جاگ رہی ہیں، بالے! یہ سب بھی میری وجہ سے پریشان ہو گئے ہیں"۔

"ارے نہیں سوہنی............ ہم پریشان کیوں ہوتے............ تم لوگوں کی وجہ سے تو کوٹھی میں رونق ہے۔ میں خود کو اکیلا محسوس نہیں کرتی۔ دراصل نیند مجھے بھی نہیں آ رہی تھی اور ذہن میں چند باتیں گردش کر رہی تھیں۔ میں نے سوچا اقبال کو یہاں بلانے کی بجائے خود یہیں آ کر پوچھ لوں"۔ اس نے چائے کی ٹرے سنٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"زاریہ سو گئی میڈم!"

"ہاں اقبال، ڈاکٹر نے اسے مکمل آرام کے لیے کہا ہے مگر وہ دن بھر آرام نہیں کرتی۔ میں نے ڈانٹ کر لٹایا ہے۔ اقبال، میں چند باتوں کی وجہ سے پریشان ہوں۔" اس نے چائے پیالیوں میں نکالتے ہوئے جواب دیا۔

"کون سی باتیں؟"

"ایک تو یہ جمال کا یہاں آنے کا اصل مقصد کیا تھا اور کیا وہ یوں پکڑ لیے جانے اور راز

کھل جانے کے بعد چین سے بیٹھ جائے گا۔ دوسری بات یہ کہ ہمیں اب کیا کرنا چاہیے۔ ابھی تک نارکوٹکس کے ڈائریکٹرز نے وصی صاحب پر ہاتھ کیوں نہیں ڈالا۔ دوسری طرف بہادر کی سازشیں جاری ہیں اور اب یہ مسٹر زید اور جمال............ بات یہ ہے اقبال کہ ابھی تک میری سمجھ میں یہ آخری ڈراما نہیں آیا۔ بہادر کی اتنی جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ جمال کو یہاں بھیجتا بلکہ میرے خیال میں تو وہ جمال اور زید کے خلاف ہے پھر............؟"

"میں جانتا ہوں میڈم کہ وہ کیوں آیا تھا۔" میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ فاریہ ذہین تھی یہ بات میں جانتا تھا کہ وہ اس بارے میں ضرور سوچے گی۔ مجھے تو اب تک اتنا وقت ہی نہیں ملا تھا کہ اسے پوری تفصیل سے بتاتا ویسے بھی میں یہ بات سب کے سامنے کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

"تم جانتے ہو............؟" اس نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ میں نے اب تک اسے کیوں نہیں بتایا۔ "کیوں آیا تھا وہ؟" اس نے سوال کیا۔

"سوہنی اب تم سو جاؤ"۔ میں نے اس کا جواب دینے کی بجائے سوہنی سے کہا۔ "کل میں تمہیں اور ماسی کو راوی کے کنارے لے جاؤں گا اور سارا لاہور گھماؤں گا۔"

"ٹھیک ہے بالے تو جا............ میں سو جاؤں گی، اب تو مجھے چین کی نیند آئے گی۔ جا تو جا............" وہ فوراً مان گئی۔

میں فاریہ کے ساتھ باہر آ گیا۔ میرے اور فاریہ کے ہاتھوں میں چائے کے کپ تھے۔ ہم برآمدے میں سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ تب میں نے اسے بتایا کہ جمال یہاں کیوں آیا تھا۔ وہ تمام باتیں سن کر حیرت زدہ ہو گئی۔

"یہاں کوئی تہہ خانہ بھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں اقبال، اگر ہے تو میں اس سے ناواقف ہوں۔ یہ تو سچ ہے کہ انکل نے یہ کوٹھی سیماں کے نانا سے خریدی تھی بلکہ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے زبردستی کوٹھی کو انکل کے ہاتھوں فروخت کیا تھا۔ وہ یہاں رہنے پر تیار نہ تھے بلکہ وہ کراچی شفٹ ہونا چاہتے تھے۔ ان دنوں یہ فیکٹری بھی نہیں تھی، انکل کا ایکسپورٹ امپورٹ کا کام تھا مگر یہ کوٹھی خرید لینے کے بعد ہمیں یہاں رک جانا پڑا اور پھر انکل نے یہ فیکٹری بنالی"۔

"معاف کیجیے گا میڈم ایک ذاتی سا سوال کروں؟"

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"ہاں ہاں............ کیا بات ہے؟"

"بیگ صاحب کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی؟"

اس نے میرا سوال سن کر گہرا سانس لیا۔ "یہ تمام دولت میرے ابو کی تھی اقبال' میرے ابو کی زمینیں تھیں' وہ سندھ کے ایک بڑے زمیندار تھے۔ اس کے علاوہ وہ فروٹ اور سبزی ایکسپورٹ بھی کرتے تھے پھر انہوں نے شوگر بنانے کا کارخانہ بھی لگا لیا تھا۔ بیگ صاحب اور میرے ابو دو ہی بھائی تھے۔ انکل نے شادی نہیں کی تھی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد وہ ابو کے پاس ہی چلے آئے تھے۔ بہرحال یہ باتیں پھر کبھی ہو سکتی ہیں فی الحال تو ہمیں اس تہ خانے کا کھوج لگانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے اس صندوق میں واقعی بہادر کے خلاف ثبوت ہوں' اگر ایسا ہوا تو یہ ہمارے کام بھی آ سکتے ہیں"۔

"جی میڈم' میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ سب سے پہلے تہ خانے کا پتا چلے' ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جمال اور زید دوبارہ یہاں آ سکتے ہیں"۔

"میں چاہتی ہوں کہ سلطان اور یعقوب دونوں کو اسی کام پر لگا دوں"۔

"یعقوب زخمی ہے میڈم!"

"ہاں مگر زخم اتنا گہرا نہیں کہ وہ سلطان کی مدد نہ کر سکے"۔

"ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟"

"زخم دو چار دن میں بھر جائے گا۔ گولی اس کے کاندھے کو چھیلتی ہوئی نکل گئی ہے' اگر آر پار ہو جاتی تو مسئلہ تھا"۔

"میڈم! میرے خیال میں یہ کام ان دونوں پر چھوڑنے والا نہیں۔ مجھے خود یہ کام کرنا ہو گا"۔

"اقبال............ میں سمجھتی ہوں مگر سوہنی کی حالت ایسی نہیں کہ اسے نظرانداز کیا جائے"۔

"میں دن کا ہر لمحہ اسے دوں گا میڈم............ مگر یہ کام رات میں کرنے کا ہے جسے میں باآسانی کر سکتا ہوں"۔

وہ میری طرف دیکھ کر رہ گئی' وہ خود بھی جانتی تھی کہ تہ خانہ تلاش کر کے اس صندوق کو فوری طور پر حاصل کرنا بے حد ضروری ہے۔

"میڈم............ کیا بیگ صاحب اس تہ خانے کے بارے میں جانتے ہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ بھی نہیں جانتے ہوں گے' اگر جانتے تو ضرور بتا دیتے!" اس نے پُرسوچ انداز میں جواب دیا۔

"پھر بھی ان سے ذکر کر کے دیکھیں' ممکن ہے انہیں اندازہ ہو کہ یہاں تہ خانہ کس جگہ ہو سکا ہے"۔

"ہاں............ میرا خیال ہے کہ یہ بات ابھی کر لی جائے' گزرنے والا ہر لمحہ قیمتی ہے اقبال' ایک لمحے کی قیمت کسی کی جان بھی لے سکتی ہے"۔

"وہ سو رہے ہوں گے"۔

"نہیں جاگ رہے ہیں۔ میں کچھ دیر پہلے انہی کے پاس تھی۔ انہیں چائے دینے کے بعد ہی تم لوگوں کے لیے چائے لائی تھی۔ دن بھر آرام کرنے کی وجہ سے انہیں نیند نہیں آ رہی"۔

"پھر ٹھیک ہے!" میں کھڑا ہو گیا۔

میں اور فاریہ کچھ ہی دیر بعد بیگ صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں مسٹر زید اور مسٹر جمال کے مقاصد کے بارے میں بتایا اور بتایا کہ وہ یہاں کسی تہ خانے کی تلاش میں آئے تھے۔ یہ بات سن کر مجھے لگا جیسے بیگ صاحب کا چہرہ ایک دم سفید ہو گیا ہو۔ معلوم نہیں فاریہ نے بھی ایسا ہی محسوس کیا تھا یا نہیں' یا ممکن ہے یہ محض میرا وہم ہو۔ بہرحال تہ خانے کے بارے میں سن لینے کے بعد بیگ صاحب کچھ دیر سر جھکائے خاموش بیٹھے رہے۔

"انکل! اگر ایسا کوئی صندوق یہاں موجود ہے تو وہ ہمارے لیے بہت اہم ہے' اس سے پہلے کہ وہ جمال یا زید کے ہاتھ لگے ہمیں اسے حاصل کر لینا چاہیے۔ انکل' آپ کے خیال میں اگر یہاں کوئی تہ خانہ ہے تو وہ کس جگہ ہو سکتا ہے"۔ فاریہ نے انہیں خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں نہیں فاریہ............ یہاں ایسا کوئی تہ خانہ نہیں ہو سکتا۔ جمال اور زید کا خیال غلط ہو سکتا ہے۔ وہ لوگ محض ہمیں پریشان کرنے کے لیے ایسا کہہ رہے ہیں۔ یہاں آنے سے ان کا مقصد کچھ اور ہو گا"۔

ان کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جو تیر کی طرح میرے دل و دماغ میں گھستی چلی گئی۔ مجھے بڑی شدت سے اس غلطی کا احساس ہوا کہ تہ خانے کا ذکر بیگ صاحب کے سامنے کیا گیا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

بیگ صاحب تو خود مشکوک ہو چکے تھے۔ ہیروئن کے مذموم کاروبار میں ان کی شرکت بہرحال ان کی مرضی اور پلاننگ سے ہوئی ہو گی۔ میرا جی چاہا کہ میں اٹھ کر باہر چلا جاؤں مگر میں ایسا نہ کر سکا۔

"ایسا ہو بھی تو سکتا ہے انکل............ آپ ذہن پر زور دیں' کوٹھی خریدتے وقت کوئی ایسی بات جو آپ نے محسوس کی ہو۔ ممکن ہے سیماں کے نانا نے اس بارے میں کوئی اشارہ کیا ہو"۔

"اوہ فاریہ! تم بھی ان لوگوں کی طرح پاگل ہو گئی ہو۔ ایسی کوئی بات نہیں' پھر تمہارے ہاتھ صاف ہیں تم اتنا کیوں گھبراتی ہو"۔ بیگ صاحب نے چڑچڑے انداز میں جواب دیا پھر فوراً ہی خود کو سنبھال کر نارمل انداز میں بولے۔ "فاریہ' بیٹا تم ان چکروں میں نہ پڑو۔ ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے' یہ ایک عام سی کوٹھی ہے اور اس میں کوئی تہہ خانہ نہیں ہے' اگر ہوتا تو مجھے اس کا علم ضرور ہوتا"۔

"مگر انکل............!"

"بیگ صاحب ٹھیک کہتے ہیں میڈم"۔ میں نے جلدی سے فاریہ کی بات کاٹ کر کہا۔

وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔ "اگر یہاں کوئی تہہ خانہ ہوتا تو وہ بیگ صاحب سے چھپا ہوا نہ ہوتا"۔

"ہاں............ ہاں' اور کیا' تم ہی اس کو سمجھاؤ اقبال یہ جو کچھ سن لیتی ہے اس کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔"

"مگر............" فاریہ نے مجھ سے کچھ کہنا چاہا۔

"میڈم وہ بہت چالباز لوگ ہیں' ہمیں الجھائے رکھنے کے لیے یہ نئی کہانی ڈال دی۔ آپ فکر نہ کریں میں انشاء اللہ ان کی ہر چال کو ناکام بنا دوں گا۔"

"اور کیا............ تمہیں اقبال پر بھروسا رکھنا چاہیے بیٹا۔" بیگ صاحب میری باتوں سے بہت خوش ہو گئے تھے۔ ان کے چہرے پر اچانک بشاشت آ گئی تھی اور یہیں سے میرا شک پختہ ہو گیا۔ وہ بیگ صاحب جو تہہ خانے کا سن کر سفید ہو گئے تھے' یہ دیکھ کر مطمئن ہو گئے کہ میں ان کی باتوں میں آ گیا ہوں۔ اب یہی بہتر تھا کہ میں ان پر یہی ثابت بھی کرتا سو میں نے فاریہ کو سمجھا بجھا کر وہاں سے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ ہم دونوں بیگ صاحب کو خدا حافظ کہہ کر

باہر نکل آئے۔

کمرے سے باہر آتے ہی فاریہ پھٹ پڑی۔ "اقبال یہ کیا طریقہ ہے............ تم خود ہی تو اس سلسلے میں اتنے سنجیدہ تھے' کیا میں یہ سمجھوں کہ تم نے جو کہانی جمال اور زید کے بارے میں مجھے سنائی تھی وہ سراسر جھوٹ پر مبنی تھی؟"

"نہیں میڈم............ وہ کہانی سراسر سچ پر مبنی ہے"۔

"پھر............ پھر انکل کے سامنے تمہیں کیا ہو گیا تھا؟"۔

"آیئے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں"۔ میں نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر کہا اور آگے بڑھ گیا۔

ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ "ہاں اب بولو............ کبھی کبھی تمہارا رویہ میرے لیے ناقابل فہم ہو جاتا ہے"۔ اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"سوری میڈم' مگر کبھی کبھی ایسا رویہ اختیار کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ میڈم آپ کافی مضبوط اعصاب کی مالک ہیں مجھے امید ہے کہ اب کوئی بھی حادثہ آپ کے اعصاب کو شل کرنے میں ناکام رہے گا اور آپ نارملی ہر معاملے کو سوچ سکیں گی"۔

"میں............ میں سمجھی نہیں اقبال............ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میڈم میرے خیال میں' بلکہ مجھے یقین ہے کہ یہاں نہ صرف تہہ خانہ موجود ہے بلکہ اس تہہ خانے میں صندوق کی موجودگی سے بیگ صاحب واقف ہیں"۔

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" وہ تقریباً اچھل پڑی۔

تب اس بات کا یقین دلانے کے لیے مجھے کافی محنت کرنا پڑی مگر میں ناکام نہیں رہا۔ وہ اس بات پر تیار ہو گئی کہ وہ بھی میری طرح بیگ صاحب پر یہی ظاہر کرے گی کہ تہہ خانے والی بات کو زید اور جمال کی چال سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہی ہے۔ دوسری طرف ہم رات کے اندھیرے میں اس تہہ خانے کی تلاش کریں گے۔ فاریہ کے راضی ہوتے ہی میں سلطان کی طرف چلا گیا۔ رات کیوں کہ کافی گزر چکی تھی اس لیے وہ سو چکا تھا۔ یہ اندازہ میں نے کمرے میں اندھیرا دیکھ کر لگایا تھا مگر اسے جگانا بہت ضروری تھا' یہ کام ایسا نہیں تھا کہ اسے ٹالا جاتا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ پہلی ہی دستک پر اس نے دروازہ کھول دیا۔ مجھے اس وقت دروازے پر دیکھ کر وہ کچھ حیران ہوا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"بالے............ کیا کوئی اور مصیبت آ گئی"۔ اس کے لہجے میں ناراضگی تھی۔ وہ ناراض ہونے میں حق بہ جانب بھی تھا۔ بے چارہ اچھا خاصا سکون سے زندگی گزار رہا تھا کہ میں اس طلسمی حویلی میں لے آیا جہاں قدم قدم پر پُراسراریت اور سسپنس کے سوا کچھ نہ تھا۔

"ہاں سلطان............ بیٹھ میں تجھے بتاتا ہوں"۔

یار بالے' میں کہتا ہوں سوہنی اور ماسی میراں کو لے کر میرے ساتھ میرے گاؤں چل' اس عذاب زندگی سے جان چھوٹ جائے گی۔ تُو نے خواہ مخواہ دوسروں کی بلا اپنے گلے میں ڈال رکھی ہے۔ نہ خود سکون سے رہتا ہے اور نہ کسی اور کو رہنے دیتا ہے"۔

"سلطان............ میں نے تجھے یہاں لانے سے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہاں کیا چکر چل رہے ہیں اور میں............ میں تو ظالموں کے خلاف جہاد کر رہا ہوں تو نے اپنی مرضی سے اس جہاد میں شرکت کی ہے اب اگر تُو یہاں نہیں رہنا چاہتا تو............ تیری مرضی ہے' میں تجھے نہیں روکوں گا"۔

"اچھا کس کام سے آیا تھا؟" سلطان نے میری بات کا جواب دیے بغیر کہا۔ میں جانتا تھا کہ وہ پل میں بدل جاتا ہے جو کچھ دل میں آتا ہے کہہ ڈالتا ہے اور پھر پہلے جیسا ہو جاتا ہے۔

تب میں نے اسے اپنے مقصد کے بارے میں بتایا جسے سن کر وہ بھی پریشان ہو گیا۔

"ہاں یار اس طرح تو وہ لوگ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ تو ایسا کر صندوق ہاتھ میں آتے ہی اسے پولیس کے حوالے کر دے اور اپنا بوریا بستر سمیٹ کر گاؤں چل"۔

"صندوق تو اس وقت ہاتھ آئے گا جب تہہ خانے کا رستہ پتا چلے گا"۔

"تو تہہ خانے کا پتا کرنا کیا مشکل ہے۔ اب یہ حویلی اتنی بڑی تو نہیں کہ دو ہٹے کٹے آدمی اس کی تلاشی نہ لے سکیں"۔

"میں اس تلاش کی ابتدا ابھی سے کرنا چاہتا ہوں سلطان' مگر ایک بات کا خیال رکھنا اس تلاش کے بارے میں صرف فاریہ یا میں اور تُو ہی جانتے ہیں اور کسی کو پتا بھی نہیں چلنا چاہیے کہ ہم راتوں کو کیا کر رہے ہیں' سمجھ گیا نا؟"

"ایک تو میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ بڑے گھروں میں رہنے والے لوگ ایک دوسرے سے جھوٹ کیوں بولتے ہیں' ایک دوسرے سے اتنی باتیں چھپاتے کیوں ہیں؟"

"اب تُو فلسفے میں نہ پڑ' یہ باتیں تیری سمجھ میں نہیں آنے والی' تو ایسا کر کہ............

یہیں سے ابتدا کر دے"۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ پہلے اپنے کمرے کے فرش کو ٹھونک بجا کر دیکھ' ممکن ہے رستہ یہیں سے ہو!"

"خدا تیری زبان مبارک کرے' لمبے دھندے سے بچ جائیں گے"۔ اس نے آستین کو اوپر کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد میں اور سلطان دونوں گھٹنوں کے بل زمین پر رینگ رہے تھے' ہم نے فرش کو بجا بجا کر دیکھا' الماری کے نیچے' باتھ روم میں مگر ہمیں تہہ خانے کے آثار نظر نہیں آئے بالآخر ہم تھک کر بیٹھ گئے۔

"یار بالے............ یہ کام تو آسان نہیں لگتا"۔

اور میں بے اختیار ہنس پڑا۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے وہ کہہ رہا تھا کہ حویلی اتنی بڑی تو نہیں کہ ہم دونوں تہہ خانہ تلاش نہ کر سکیں اور اب صرف اپنے ہی کمرے کا فرش ٹٹولنے کے بعد اسے یہ کام مشکل لگنے لگا تھا۔

"اچھا چل میرے ساتھ فاریہ کے پاس!" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا تو وہ بھی اٹھ گیا۔

"وہ جاگ رہی ہیں؟"

"ہاں!" میں نے مختصر جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ ہمارے دائیں جانب یعقوب کا کمرا تھا۔ اس کے کمرے میں اندھیرا تھا' غالباً وہ سو چکا تھا۔ ہم اس کے کمرے کے سامنے سے گزر کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئے۔

"بالے! یہ فاریہ عجیب قسم کی عورت ہے۔ رات دن محنت کرتی ہے' جاگتی ہے' سب کا خیال رکھتی ہے پھر بھی تھکتی نہیں............"

"اس کی اسی اچھائی نے تو مجھے اتنا متاثر کیا ہے۔ اتنی پریشانیوں میں رہنے کے باوجود اسے یہ خبر ہوتی ہے کہ کون بیمار ہے' کس نے کھانا نہیں کھایا اور کون رات بھر نہیں سویا"۔ میں نے جواب دیا۔ ہم ڈرائنگ روم کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اس لیے سلطان خاموش رہا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر ہلکی دستک دی۔ جواب میں فاریہ نے اندر آ جانے کو کہا۔ ہم

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

دونوں اندر داخل ہو گئے۔

وہ میرے ہی انتظار میں تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس نے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"میڈم' مجھے کچھ دیر پہلے ایک خیال آیا ہے"۔ میں نے کہا۔

"کیا؟"

"اس معاملے میں ہمیں کسی پر بھی اعتماد نہیں کرنا چاہیے' محض اس لیے کہ معاملہ نازک ہے' ذرا سی بے پروائی بھی خطرناک ہو سکتی ہے' میرا مطلب یہ تھا کہ تہ خانے کی تلاشی میں یعقوب کو شامل کرنا ضروری نہیں' میں اور سلطان کافی ہیں"۔

"جیسا تم مناسب سمجھو اقبال' میرا ذہن تو مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔ بہرحال میرے خیال میں اس کی ابتدا میرے کمرے سے ہونا چاہیے تمام کمرے دیکھ لینے کے بعد کوٹھی کے احاطے کو دیکھا جائے۔ ویسے اگر یہاں کوئی تہ خانے ہے تو اس کا راستہ عمارت کے اندرونی حصے ہی میں ہونا چاہیے' تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ٹھیک کہتی ہیں آپ' ویسے ابتدا تو ہم کر چکے ہیں"۔

"کیا مطلب؟" وہ چونک گئی۔

میڈم میں نے اور سلطان نے آپ کے پاس آنے سے پہلے ہی سلطان کے کمرے کے فرش کو خوب ٹھونک بجا کر دیکھ لیا تھا۔ ویسے میں سب سے پہلے بیگ صاحب کے کمرے کو چیک کرنا چاہتا ہوں"۔

میری بات پر وہ ایک بار پھر چونک اٹھی۔ شاید وہ میرا مطلب سمجھ چکی تھی۔ میں کیوں کہ بیگ صاحب پر پہلے ہی اپنا شک ظاہر کر چکا تھا اس لیے یہ اصولی سی بات تھی کہ اگر وہ جانتے ہیں کہ تہ خانہ کہاں ہے اور یہ کہ اس میں ایسی دستاویزات بھی ہیں جن کا تعلق کسی بھی طرح بہادر اور بیگ صاحب سے ہے تو یہ یقینی بات تھی کہ وہ اس جگہ کی حفاظت خود کرتے رہے ہوں' ایسی صورت میں اس بات کا امکان زیادہ تھا کہ اس تہ خانے کا راستہ ان کے کمرے سے ہو کر گزرتا ہو۔

"انکل کا کمرا............" وہ یوں بڑبڑائی جیسے خواب کی حالت میں ہو۔ اس کی نگاہیں خلا میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ "اوہ............ اقبال' ہمیں............ ہمیں زاریہ کے کمرے کو چیک کرنا ہو گا"۔

"زاریہ کے کمرے کو............ مگر کیوں؟"

"وہی کمرا پہلے انکل کے تصرف میں تھا۔ زاریہ نے بڑی ضد کر کے اس کمرے کو حاصل کیا تھا۔ میرے خیال میں اس کوٹھی میں آنے کے بعد سے زاریہ کو کمرا دینے تک یعنی اب سے صرف سال بھر پہلے تک وہی کمرا انکل کا تھا۔" وہ انتہائی اضطراب میں بول رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے بھی یقین ہو کہ تہ خانہ اسی کمرے میں ہو گا۔

"مگر زاریہ نے وہ کمرا کیوں لیا تھا؟"

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ زاریہ پڑھائی کی وجہ سے ہوسٹل میں رہتی تھی۔ پچھلے برس جب اس کی نشے کی عادت کا پتا چلا تو میں اسے یہاں لے آئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ پابندی اور علاج کے بعد اپنی یہ عادت چھوڑ دے گی۔ یہاں آنے کے بعد جب اس نے دیکھا کہ انکل کے کمرے کی ایک کھڑکی اور ایک دروازہ باہر کی جانب بھی کھلتا ہے یعنی اس حصے کی جانب جہاں کوٹھی سے باہر جانے کا پچھلا دروازہ بھی ہے تو اس نے ضد شروع کر دی کہ اسے انکل والا کمرا دیا جائے۔ اس وقت میں بھی نہیں سمجھی تھی کہ وہ ایسا کیوں چاہتی ہے مگر ایک روز جب میں نے اس کی ایک دوست کو سب سے چھپ کر اندر آتے دیکھا تو میں سمجھ گئی کہ زاریہ نے ایسا کیوں کیا ہے۔ اسی روز میں نے کوٹھی کے پچھلے گیٹ کے علاوہ زاریہ کے کمرے کا وہ دروازہ بھی لاک کر دیا تھا۔ مجھے یاد ہے اقبال! کہ انکل نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ زاریہ اپنی ضد سے باز آ جائے مگر وہ تو نشے کے لیے پاگل ہو رہی تھی مجبوراً انکل کو اس کی ضد کے آگے جھکنا پڑا تھا۔ مجھے سو فی صد یقین ہے اقبال کہ............"

"اگر ایسا ہے میڈم تو آپ کا یہ یقین درست ہے' ہم سب سے پہلے اسی کمرے کو چیک کریں گے"۔

"ٹھیک ہے چلو............ زاریہ تو بے خبر سو چکی ہو گی"۔ فاریہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"اور بیگ صاحب کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟"

وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ "آں............ تمہارا خیال ہے کہ............"

"جی............ مجھے یقین ہے میڈم"۔

"تم ٹھیک کہتے ہو............" اس نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "میں انہیں چیک کروں!"

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

اس نے پوچھا۔

"آپ ٹھہریں میں دیکھتا ہوں"۔ میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ سلطان نے بھی قدم بڑھایا تھا مگر میں نے اسے وہیں رکنے کو کہا اور خود تیزی سے باہر آ گیا۔

بیگ صاحب کے کمرے کی طرف جانے کے لیے مجھے پہلے اس راہداری سے گزرنا تھا جس میں یعقوب اور ماسی میراں کے کمرے تھے' پہلے وہ کمرا آتا تھا جس میں ماسی اور سوہنی تھیں پھر ایک کمرا اور تھا جو غالباً خالی تھا۔ پھر فاریہ کا کمرا تھا اور انتہائی کونے میں زاریہ کا کمرا تھا۔ زاریہ کے کمرے کے بالکل سامنے والا کمرا بیگ صاحب کا تھا۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا کہ بیگ صاحب کے کمرے میں اندھیرا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ سو چکے ہوں گے۔ ہم سے غلطی ہو چکی تھی کہ ہم تہہ خانے کا ذکر ان سے کر چکے تھے۔

میں بڑی احتیاط سے چل رہا تھا تاکہ میرے قدموں کی آہٹ نہ ہو۔ میں دبے پاؤں ان کے کمرے کی کھڑکی کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ کھڑکی میں باریک جالی کے پردے پڑے تھے اس لیے مجھے اندر کا منظر دیکھنے میں دشواری نہ ہوئی۔ وہ نہ صرف یہ کہ جاگ رہے تھے بلکہ حیرت انگیز طور پر چاق وچوبند تھے اور کسی مضطرب شیر کی طرح ٹہل رہے تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر میرا یہ شک یقین میں بدل گیا کہ بیگ صاحب اس تہہ خانے سے واقف بھی ہیں بلکہ عین ممکن تھا کہ اس تہہ خانے میں محفوظ دستاویزات میں ان کے خلاف بھی کچھ ہو۔

ان حالات میں ہمارا کام پہلے سے دشوار ہو گیا تھا کیوں کہ اب ہمیں صرف جمال اور زید کا خطرہ ہی نہیں تھا بلکہ بیگ صاحب ہمارے لیے زیادہ بڑا خطرہ ثابت ہو سکتے تھے۔ زید اور جمال کو تو شاید دستاویزات کی تلاش میں دشواری ہوتی مگر بیگ صاحب کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ میں پریشان صرف اس بات سے تھا کہ فاریہ کو یہ یقین ہو جانے کے بعد کس قدر پریشانی ہو گی کہ بیگ صاحب کی حیثیت اب جمال' زید اور بہادر سے مختلف نہیں رہی۔

میں وہیں دبکا کھڑا رہا۔ میری نگاہیں اب بھی کھڑکی پر جمی ہوئی تھیں جہاں سے بیگ صاحب صاف نظر آ رہے تھے۔ اچانک وہ ٹہلتے ٹہلتے رک گئے۔ انہوں نے ایک نظر بیرونی دروازے پر ڈالی پھر آگے بڑھے۔ میں چوکنا ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ باہر آ جائیں گے مگر یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ انہوں نے دروازے کو لاک کیا اور پھر پلٹ کر اپنے بیڈ کے قریب آ گئے۔ ان کے چہرے پر عجیب وحشت کے سے آثار تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ شدید

اضطراب میں ہوں اور فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے۔

میں چند لمحے وہیں کھڑا رہا۔ پھر میں نے واپس جانے کا فیصلہ کیا اور پلٹنے ہی والا تھا کہ انہیں بیڈ کے نیچے جھانکتے دیکھ کر وہیں تھم گیا۔ اب وہ بیڈ کے قریب کارپٹ پر بیٹھ گئے تھے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ تہہ خانے کا راستہ یہیں موجود ہے اور شاید وہ تہہ خانے میں ہی جانا چاہتے ہیں۔ میں اب بالکل الرٹ تھا اور ان کے تہہ خانے میں چلے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ مگر کافی دیر انتظار کے بعد بھی وہ وہیں بیٹھے بیڈ کے نیچے کچھ ٹٹولتے رہے' وہ کیا چیز دیکھ رہے تھے' میری نگاہوں سے اوجھل تھا کیوں کہ ان کی پشت میری طرف تھی۔ میں حیران تھا کہ وہ آخر وہاں کیا کر رہے ہیں؟ تقریباً پانچ چھ منٹ گزر جانے کے بعد وہ اٹھے تو ان کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک تھیلا سا تھا۔ غالباً اس تھیلے کو انہوں نے کارپٹ کے نیچے چھپایا ہوا تھا۔

وہ کچھ دیر اسے لیے کھڑے رہے پھر انہوں نے وہ تھیلا اپنے بیڈ کے گدے کے نیچے رکھ لیا۔

عین اسی لمحے میں اچھل پڑا۔ کسی نے میری پشت پر ہاتھ رکھ دیا تھا' پلٹ کر دیکھا تو فاریہ تھی۔ وہ شاید اتنی دیر گزر جانے پر پریشان ہو کر مجھے دیکھنے آئی تھی۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس نے سر ہلایا اور کچھ آگے بڑھ کر کھڑکی سے اندر جھانکنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ بیگ صاحب بستر پر لیٹ چکے تھے' ہلکے نیلے رنگ کے بلب کی روشنی میں ان کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔

"کیا بات ہے.............؟" فاریہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سرگوشی میں پوچھا۔ ظاہر ہے اس نے کچھ دیکھا ہی کب تھا۔

میں نے اسے واپس چلنے کا اشارہ کیا اور اسی طرح دبے پاؤں ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ فاریہ میرے پیچھے تھی۔ ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔ میں نے دروازے کو اندر سے لاک کر دیا۔ میری اس حرکت کو فاریہ نے بڑے غور سے دیکھا' اس کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے جبکہ سلطان کسی مورتی کی طرح بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے اقبال' تمہیں وہاں اتنی دیر کیوں ہوئی؟"

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

فاریہ کے پوچھنے پر میں نے اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو میں نے کچھ دیر پہلے دیکھا تھا۔

”تمہارے خیال میں وہ کیا ہو سکتا ہے؟“

”ممکن ہے یہ وہی دستاویزات ہوں جن کی تلاش میں جمال یہاں تک پہنچا تھا“۔

”اگر یہ وہی دستاویزات ہیں تو پھر تہہ خانے میں رکھے اس صندوق میں کیا ہے؟ جب دستاویزات ایک چھوٹے سے تھیلے میں آسکتی ہیں اس کے لیے صندوق کی کیا ضرورت ہے اقبال............ یہ تہہ خانے اور صندوق والی بات میری سمجھ میں نہیں آتی“۔

”میڈم جو کچھ بھی ہے بہت جلد سامنے آجائے گا۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں سو جانا چاہیے۔“

”نہیں میرے خیال میں تو اب ناشتا کر لینا چاہیے“۔ سلطان نے بھونڈے انداز میں طنز کیا۔

میں نے وال کلاک پر نظر ڈالی' وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا' صبح کے چار بج کر بائیس منٹ ہو رہے تھے۔

”ٹھیک ہے اقبال' تم بھی تو بہت تھکے ہوئے ہو گے۔ جاؤ سو جاؤ' صبح دیکھا جائے گا“۔ فاریہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور میں اور سلطان اسے خدا حافظ کہہ کر اپنے کمروں کی طرف چل پڑے۔

اگلی صبح میری آنکھ بہت دیر بعد کھلی' کسی نے مجھے اٹھایا نہیں تھا' شاید اسی لیے کہ فاریہ نے منع کر دیا ہو گا' وہ جانتی تھی کہ میں نے کراچی سے لاہور تک کا سفر کن اذیتوں اور عذابوں سے طے کیا ہے۔ مجھے تو یہاں پہنچ کر بھی چین نہیں ملا تھا اور پھر ساری رات ہی آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔ بہرحال میں نے اٹھتے ہی باتھ روم کا رخ کیا اور جی بھر کر نہایا۔ داڑھی تو رات ہی صاف کر چکا تھا۔ نہا دھو کر میں آدھے گھنٹے میں تیار ہو گیا۔ دن کے سوا گیارہ بج چکے تھے۔ مجھے بھوک تو بالکل نہیں تھی البتہ چائے کی شدید طلب تھی۔ میں سیدھا کچن کی طرف بڑھ گیا۔ حمیدہ بی بی وہاں موجود تھی۔

”حمیدہ بی بی تمہارا داماد کہاں ہے؟“ اسے دیکھ کر مجھے رحمتے یاد آگیا۔

”جی وہ اپنے چاچا کے گھر چلا گیا تھا“۔

”اس کا چاچا بھی یہاں رہتا ہے؟“

”جی ہاں پر وہ اس کا پتا نہیں جانتا تھا۔ اس کا چاچا یہاں پوسٹ آفس میں کام کرتا ہے۔ میں نے اسے یہاں نہیں روکا بلکہ اس کے چاچا کو فون کر کے بلا لیا تھا۔ وہ اسی کے ساتھ چلا گیا“۔

”اچھا ایک کپ چائے تو دو“۔

”جی چائے تو میں ڈائننگ روم میں رکھ آئی ہوں۔ فاریہ بی بی بھی ابھی اٹھی ہیں۔ آپ وہیں ناشتا کر لیں۔“

”ٹھیک ہے............“ میں ڈائننگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں فاریہ کے علاوہ بیگ صاحب بھی موجود تھے۔ وہ مجھ دیکھ کر کِھل اٹھے۔

”آؤ بیٹا کیا حال ہے؟“

”ٹھیک ہوں بیگ صاحب' آپ سنایئے“۔ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”بیٹا تم ہماری وجہ سے بڑی پریشانیوں میں گھر گئے ہو۔ پتا نہیں تمہاری ماں کا کیا حال ہے کچھ اس کی خیر خبر لی ہے یا نہیں؟“

ان کے جملے کے آخری حصے نے مجھے ہی نہیں فاریہ کو بھی چونکا دیا تھا صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مجھے ماں کی یاد دلا کر یہ احساس دلانا چاہ رہے ہیں کہ اب مجھے اسی کی فکر کرنا چاہیے' دوسرے معنوں میں مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔

”وہ............ خیریت سے ہیں بیگ صاحب............ مجھے اطلاع مل چکی ہے۔ ممکن ہے وہ بھی جلد یہاں پہنچ جائیں۔“ میں نے جھوٹ بولا۔ اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

”ہوں............ گویا فاریہ کو ایک کمرا اور تیار کرنا چاہیے“۔

ان کا یہ طنز زہر میں بجھے تیر کی طرح میرے سینے میں پیوست ہو گیا مگر اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا فاریہ بول اٹھی۔

”نہیں انکل' اقبال کا فلیٹ موجود ہے' اسے تو میں نے ہم سب کی حفاظت کے خیال سے روک رکھا تھا۔ ویسے آج آپ کچھ عجیب سی باتیں نہیں کر رہے ہیں“۔

”نہیں میرا مطلب یہ تھا بیٹا کہ اقبال کی اپنی زندگی بھی تو ہے' یہ بے چارا ہم لوگوں کی خاطر کہاں تک خود کو خطرے میں ڈالے رہے گا' میں تو چاہتا تھا کہ یہ کہیں معقول کام وغیرہ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

کرکے اپنا گھر بسائے ماں کو لے کر آئے' زندگی کی رنگینیوں کو محسوس کرے بالکل اسی طرح جس طرح اس کی عمر کے دوسرے لوگ محسوس کرتے ہیں۔ یہ زیادتی ہے بیٹا کہ ہم نے اسے یہاں محصور کر رکھا ہے' محض اس لیے کہ یہ ہماری بدقسمتی سے لڑتا رہے۔"

"انکل معاف کیجئے گا' شاید آپ بھول گئے کہ یہ معقول جاب پر ہی ہے اور اسے ملازم رکھنے والے آپ ہی ہیں' ہاں یہ الگ بات ہے کہ میں نے اس عارضی جاب کو مستقل کر دیا ہے اور کچھ مزید ذمے داریاں بھی اس پر ڈال دی ہیں لیکن ان ذمے داریوں کا معقول معاوضہ بھی دوں گی۔ بہرحال اقبال اب میری ذمے داری ہے آپ اس معاملے میں خود کو پریشان نہ کریں۔ آپ کی صحت پہلے ہی ٹھیک نہیں ہے"۔ فاریہ کے لہجے میں ناگواری کا تاثر واضح تھا۔

میں اس وقت خود کو عجیب احمق تصور کر رہا تھا۔ بیگ صاحب کے رویے نے میرے احساسات کو زبردست ٹھیس پہنچائی تھی۔ جی تو چاہا تھا ابھی' اسی وقت سوہنی اور ماسی میراں اور سلطان کو لے کر اس کوٹھی سے نکل جاؤں' مگر فاریہ کی آنکھوں میں تیرتی التجا نے میرے قدم تھام لیے تھے۔ میں نے بہت جلد خود کو اس جذباتی کیفیت سے نجات دلا دی اور اپنی اس غیرت کو تھپک کر سلا دیا جس نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا لیکن ایک بات میرے دل و دماغ میں بیٹھ گئی کہ اب مجھے جلد از جلد اس چکر کو ختم کرکے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ بیگ صاحب سے میری تمام ہمدردیاں تو اسی وقت ختم ہو گئی تھیں جب میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ تہہ خانے کے راز سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ وہ فاریہ کے چچا ہونے کے باوجود اسے نقصان پہنچا رہے ہیں۔ مجھے یہ یقین ہو چکا تھا کہ بہادر کے ساتھ ہی بیگ صاحب بھی فاریہ اور زاریہ سے کسی ایسی بات کا انتقام لے رہے ہیں جس سے فاریہ اور زاریہ دونوں ناواقف ہیں۔

ہم نے بوجھل فضا میں ناشتا کیا اور وہاں سے اٹھ گئے۔ بیگ صاحب غالباً اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ میں فاریہ سے اجازت لے کر سوہنی کے کمرے کی طرف چلا گیا اور فاریہ وہیں بیٹھی کچھ سوچتی رہ گئی۔ سوہنی کی آنکھیں چمک رہی تھیں' اس کے چہرے پر صحت مندی کے آثار تھے جسے دیکھ کر مجھے بے حد اطمینان ہوا تھا۔ ماسی بھی آج کچھ خوش نظر آ رہی تھی۔ شاید سوہنی کی سنبھلی ہوئی حالت دیکھ کر خوش تھی۔

"بالے.............. آج مجھے گھمانے لے چلے گا نا؟" سوہنی نے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں.............. تم ٹھیک تو ہو نا؟" میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بالے' اب میں اچھی ہو گئی ہوں۔ تو بتا.............. کب لے کے چلے گا؟"

"بس تیار ہو جاؤ' چلتے ہیں"۔

میری بات سن کر وہ یوں بستر سے اچھل کر کھڑی ہوئی کہ میں اور ماسی میراں دھک سے رہ گئے۔ اس کے اچھلنے سے اس کے گورے پیروں میں پڑی پائل کی چھنکار پورے کمرے میں پھیل گئی۔ پائل کی اس چھنکار نے گویا مجھے کسی اور ہی دنیا میں پہنچا دیا۔ کچھ دیر پہلے کی کیفیت اور طبیعت کا بوجھل پن بھاپ بن کر غائب ہو گیا اور میں نے خود کو زندگی سے بہت قریب محسوس کیا۔

"بالے.............. زاریہ کو بھی لے لیں اور آپی کو بھی"۔

"ٹھیک ہے اگر تم چاہتی ہو تو ان سے پوچھ لو"۔ میں نے اسے اجازت دے دی تو وہ فوراً ہی کمرے سے باہر چلی گئی۔

میں قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری نگاہیں ماسی میراں کی خاموش نگاہوں سے ٹکرائیں تو میرے بدن میں سنسنی سی پھیل گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے ماسی کی آنکھوں سے سرد سی لہریں اٹھ کر میرے وجود میں داخل ہو رہی ہوں۔

"ماسی.............." میں نے دھیرے سے اسے پکارا۔

"ہوں.............." وہ چونک اٹھی۔ "ہاں پتر.............. تجھے تو پتا چل گیا ہو گا نا کہ.............. کہ میری سوہنی.............."

"بس ماسی.............." میں تڑپ کر آگے بڑھا اور اس کے لرزتے ہوئے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ماسی آگے کچھ نہ کہنا.............. کچھ بھی نہیں ماسی.............. اگر اس نے سن لیا تو وہ پہلے ہی.............."

"میں جانتی ہوں پتر' اسی لیے تو سینے پر سل رکھ لی ہے' تو آیا ہے تو اس کے چہرے پر رونق لگتی ہے پتر.............. رب کرے یہ رونق یونہی رہے.............. رب کرے پتر.............."

"ماسی.............. شاید وہ آ رہی ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ماسی' تو صبر کر.............." میں نے جلدی سے کہا کیوں کہ میں آتے ہوئے قدموں کی آہٹ سن رہا تھا۔

"میرا خیال صحیح تھا وہ سوہنی اور زاریہ تھیں۔ میں نے زاریہ کو غور سے دیکھا۔ وہ تو

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

ماشاء اللہ کافی صحت مند ہو گئی تھی۔ بالکل نہیں لگتا تھا کہ یہ وہی زاریہ ہے جسے میں نے پہلے دیکھا تھا۔

"میں نے سنا ہے کہ آج آپ ہم سب کو گھمانے پھرانے' تفریح کرانے لے جا رہے ہیں!" وہ چہکی۔

"غلط سنا آپ نے' میں صرف گھمانے لے جا رہا ہوں' باقی سارے کام آپ خود ہی کر لیجئے گا"۔

میری بات پر سوہنی اور زاریہ دونوں ہنس پڑیں۔ اسی وقت فاریہ کمرے میں داخل ہوئی' اس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ میں اسے دیکھتے ہی مؤدب ہو گیا۔ اس وقت اس کی شخصیت میں وہی رعب اور دبدبہ تھا جسے میں نے شروع میں محسوس کیا تھا۔

"اقبال' تم بڑی وین لے جانا۔ میں نے فیکٹری سے منگوائی ہے"۔

"میڈم آپ نہیں چلیں گی؟"

"کیا انکل کو یہاں تنہا چھوڑنا عقل مندی ہے؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر لیا۔

"اوہ............ آئی سی............ آئی ایم سوری میڈم میں بھول گیا تھا۔"

"کوئی بات نہیں............ تم فکر نہ کرو میں اور سلطان یہاں رہیں گے"۔ اس نے فوراً ہی جواب دیا۔

"نہ پُتر تُو بھی چلی جا............ سلطان تو ہے ان کے پاس"۔ ماسی نے کہا۔

"نہیں ماسی............ میں تھکی ہوئی بھی بہت ہوں۔ اس طرح کچھ دیر آرام بھی کر لوں گی"۔

"میڈم ٹھیک کہتی ہیں ماسی! چلیں"۔ میں نے جلدی سے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

سوہنی اور زاریہ پہلے ہی تیار تھیں۔ ہم چند منٹ بعد ہی کوٹھی سے نکل گئے۔ حمیدہ بی بی نے فاریہ کی ہدایت پر گاڑی میں ضرورت کی ہر چیز رکھ دی تھی' کھانا' پانی کا کولر' برتن' فروٹ ہر چیز تھی۔ میں ان لوگوں کو لے کر نکل تو گیا تھا مگر ذہن الجھا ہوا تھا میں خود محسوس کر رہا تھا کہ میں کسی کے ساتھ انصاف نہیں کر رہا ہوں' نہ سوہنی کے ساتھ نہ فاریہ کے ساتھ۔ سوہنی کے ساتھ تھا تو مجھے فاریہ اور اس کی پریشانیاں ستا رہی تھیں اور فاریہ کے ساتھ ہوتا تھا تو سوہنی کی یاد تڑپاتی تھی۔

اس روز میں سوہنی کو گھمانے اور اسے دنیا دکھلانے لگا تھا۔ وہ بے حد خوش تھی اور اسے دیکھ کر میں بھی خوش تھا مگر ذہنی الجھنیں پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ ہم سارا دن گھومتے رہے۔ راوی کے کنارے ایک گھنے پیڑ تلے ہم نے کھانا کھایا۔ میں سوہنی سے بہت سی حسین اور پیار بھری باتیں کرنا چاہتا تھا مگر ماسی میراں اور زاریہ کی موجودگی میں یہ ممکن نہ تھا۔ بس اسے خوش دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔ سورج نے مغرب کی طرف ڈوبنا چاہا تو میں نے گاڑی کا رخ گھر کی طرف موڑ لیا۔ اب میرے سر پر پھر تہہ خانہ سوار ہو گیا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ آج اس کام کو انجام تک پہنچا کر ہی دم لوں گا۔ ویسے آج مجھے جمال وغیرہ کی طرف سے بھی خطرہ تھا۔ اسے پورا ایک دن مل چکا تھا۔ اب تک اس نے کوئی نہ کوئی پلاننگ کر لی ہو گی۔ اسی خیال نے مجھے پریشان کیا ہوا تھا۔

میں گھر پہنچا تو فاریہ حسبِ توقع بیگ صاحب کے کمرے میں تھی۔ سلطان مجھے باہر ہی مل گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے آنکھ سے اشارہ کیا۔ میں نے سوہنی وغیرہ کو اندر جانے کو کہا۔ وہ لوگ اندر داخل ہو گئے تو میں سلطان کے پاس آ گیا۔

"ہوں............ خیریت؟"

"ہاں بالے' باقی سب تو خیر ہے پر دیکھ لے میں نے کہا تھا کہ تُو جادوگروں میں پھنس گیا ہے۔ مجھے پہلے روز ہی سے یہ سب کچھ ٹھیک نہیں لگا تھا مگر تُو نے میری بات نہیں مانی تھی الٹا ہم سب کو یہاں لا کر پھنسا دیا ہے"۔

"بات کیا ہے سلطان' مجھے صاف صاف معاملے کی بات بتا!" میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"معاملے کی بات یہ ہے بیٹا کہ تیرے بیگ صاحب ہم سب کے یہاں اکٹھا ہونے پر ناراض ہیں۔ فاریہ سے جھگڑا ہوا ہے ان کا"۔

"ٹھیک ہے تُو ایسا کر کہ............ اپنا سامان باندھ لے' میں سوہنی اور ماسی میراں کو تیار کرواتا ہوں۔ تُو ان دونوں کو لے کر اپنے گھر چلا جا"۔

"تُو بھی چل بالے............ تُو یہاں کب تک ذلیل ہوتا رہے گا' ان لوگوں کے لیے تُو نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال دی پر ان لوگوں نے تجھے کیا بدلہ دیا"۔

"ہاں............ میں بھی چلوں گا"۔ میں نے پُرعزم انداز میں جواب دیا۔ سلطان میرے

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

منہ سے یہ بات سن کر اتنا خوش ہوا جیسے اسے دنیا جہاں کی دولت مل گئی ہو۔ مجھے اس کے خلوص پر خوشی ہوئی۔

"جا تو تیاری کر............" میں نے اس کا شانہ تھپتھپا کر کہا۔

وہ سرہلا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میں سوہنی اور ماسی کے پاس چلا آیا۔ وہ دونوں کمرے میں تھیں اور یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ یہاں زاریہ نہیں تھی میں ان دونوں سے کھل کر بات کر سکتا تھا۔

"کیا بات ہے پتر' کوئی پریشانی ہے کیا؟" ماسی میراں نے میرے چہرے سے معاملہ بھانپ کر پوچھا۔

ماسی بات یہ ہے کہ یہاں میں کچھ خطرہ دیکھ رہا ہوں۔ وہ جو آدمی میرے روپ میں یہاں آیا تھا وہ ان لوگوں کا دشمن ہے' مجھے یقین ہے کہ وہ دوبارہ آئے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ تجھے یا سوہنی کو کوئی نقصان پہنچے۔ میں نے سلطان سے کہہ دیا ہے' وہ تم دونوں کو لے کر اپنے گھر جا رہا ہے۔ تم دونوں اپنا سامان سمیٹ کر تیار ہو جاؤ۔"

"ہائے بالے............ آپی اکیلی رہ جائے گی' اور زاریہ............ وہ تو کہتی ہے کہ اب ہمیں کبھی بھی کہیں نہیں جانے دے گی۔ وہ بہت اچھی ہے بالے۔" سوہنی ایک دم پریشان ہو گئی تھی۔ اسے بھی زاریہ اور فاریہ کے خلوص اور محبت نے اپنے حصار میں قید کر لیا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح مجھے۔

"ہاں بالے............ فاریہ اور زاریہ تو بہت محبت والی ہیں انہوں نے غیر ہو کر بھی ہمارا کتنا خیال رکھا............ اب تو مشکل وقت میں انہیں چھوڑ دینا چاہتا ہے؟" ماسی نے خفگی سے کہا۔

"نہیں ماسی............ ان دونوں بہنوں کا خلوص تو مجھ پر بڑا قرض ہے' یہ میں ضرور اتار دوں گا مگر تم لوگوں کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ تم سامان سمیٹو۔"

میں اتنا کہنے کے بعد وہاں رکا نہیں کہ وہ مزید کچھ کہتیں۔ وہاں سے نکل کر میں سیدھا سلطان کی طرف گیا۔ وہ سامان سمیٹ کر بالکل تیار تھا۔ میں نے اسے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ وہ اپنا ٹین کا بکس اٹھائے میرے پیچھے چل پڑا۔ ڈرائنگ روم کے سامنے والے برآمدے میں پہنچ کر میں نے اسے سامان رکھنے کو کہا۔ اس نے دیوار سے ٹکا کر اپنا بکسا اور دوسرے ہاتھ میں

پکڑا کمبل رکھ دیا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ ماسی اور سوہنی کا سامان بھی یہیں لا کر رکھ دے اور ان دونوں کو بھی ساتھ لیتا آئے۔ وہ سرہلا کر چلا گیا۔ میں وہیں ستون سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لی۔

میں اس وقت اس دوراہے پر کھڑا تھا جس کو میں نے اب سے پہلے کئی بار نظرانداز کیا تھا مگر میں یہ بات بھی خوب جانتا تھا کہ مجھے کبھی نہ کبھی اس دوراہے پر تھمنا ضرور پڑے گا اور آج وہی دن آ گیا تھا۔ بہرحال میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

تقریباً دس منٹ بعد سلطان ان دونوں کو لیے آ گیا۔ سوہنی اور ماسی میراں کے چہرے پر ملال تھا' میں ان کی کیفیت سے واقف تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ دونوں میرے اس اچانک فیصلے پر حیران اور پریشان ہیں مگر اب بیگ صاحب کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا۔ بات اب کسی حد تک میری سمجھ میں آ چکی تھی کہ بیگ صاحب نے بھائی کی محبت میں اس کی اولاد کو سہارا نہیں دیا تھا بلکہ وہ خود بھی بہادر کی طرح فاریہ اور زاریہ کی دولت کو ہڑپ کرنا چاہتے تھے' بالکل اسی طرح جس طرح بہادر نے دولت کی خاطر اپنی بہن کو موت کے گھاٹ اتارنے سے دریغ نہیں کیا تھا۔ انہوں نے فاریہ کو مکمل طور پر اپنے اعتماد میں لے لیا تھا اور اس کی دولت کو زہریلے کاروبار میں لگا کر اپنی تجوریاں بھر رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ فاریہ کے دل میں اب بھی ان کے لیے نرم گوشہ موجود ہے' وہ ابھی تک یہی سمجھتی تھی کہ بیگ صاحب' وصی صاحب کے بلیک میل کرنے کی وجہ سے مجبور تھے اور جو غلطی وہ شروع میں کر چکے تھے اس سے انہوں نے توبہ کر کے سلطانی گواہ بننا گوارا کر لیا تھا مگر مجھے تو اب بیگ صاحب کی اس کہانی پر بھی شبہ ہونے لگا تھا۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا وہ جلد سامنے آنے والا تھا۔ اس لیے میں نے ذہن سے ان خیالات کو جھٹک دیا اور سوہنی اور ماسی میراں کو وہیں کرسیوں پر بٹھا کر خود بھی وہاں بیٹھ گیا۔

"سلطان' بیگ صاحب' فاریہ اور زاریہ کو بلا لاؤ۔"

"تینوں کو؟"

"ہاں تینوں کو۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

سلطان چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ آیا تو اس کے ساتھ فاریہ' زاریہ اور بیگ صاحب بھی تھے۔ فاریہ اور زاریہ کی نگاہ جوں ہی ماسی' سوہنی اور ان کے سامان پر پڑی' ان کے منہ کھلے رہ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

گئے۔ فاریہ کا چہرہ تو بالکل ہی پیلا ہو گیا۔ "یہ............ یہ سب کیا ہے اقبال؟"

"کیا آپ لوگ جا رہے ہیں؟" میرے جواب دینے سے قبل ہی زاریہ بول اٹھی۔

"ہاں زاریہ' ہم لوگ جا رہے ہیں۔ کوئی غلطی ہو تو معاف کر دینا۔" میں نے جواب دیا۔

"اقبال............ یہ کیا بے وقوفی ہے؟" فاریہ نے ناراض لہجے میں پوچھا۔

"نہیں میڈم............ یہ بے وقوفی نہیں بلکہ عقل مندی ہے۔ اب سے پہلے میں جو کچھ کرتا رہا وہ یقیناً بے وقوفی تھی............ بیگ صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ میں بھلا چند روپوں کے لیے اپنی اور اپنے خاندان کی زندگیاں کیوں خطرے میں ڈالوں۔ جو احسانات آپ لوگوں نے مجھ پر کیئے ہیں میں نے حتی الامکان اتارنے کی کوشش بھی کی ہے' مگر میں یہاں تمام زندگی تو بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ نہ معلوم میری ماں کس حال میں ہو گی۔ میں اب اس کی جدائی برداشت کرنے کو تیار نہیں' میں............ میں گاؤں جا رہا ہوں' اسے وہاں سے لے کر آؤں گا پھر............ ایک نئی زندگی کا آغاز کروں گا میڈم............ اور مجھے امید ہے کہ آپ مجھے میری نئی زندگی گزارنے پر مبارک باد دیں گی۔"

"اقبال............!" فاریہ روہانسی ہو گئی۔ "اقبال' یہ بھی ٹھیک ہی ہے کہ تم بھلا ہم لوگوں کے لیے کیوں خطرات سے کھیلو گے' تمہاری اپنی زندگی ہے............ اپنی دنیا ہے' اس دنیا میں ابھی ایسے لوگ ہیں جو تمہیں چاہتے ہیں' تمہاری زندگی کے لیے دعا گو ہیں............ میں............ میں بھی دعا کروں گی۔ جاؤ............ اور ہم سب کو بھول جانا............ ہمارا تم سے کوئی بھی تو رشتہ نہیں............" یہ کہتے کہتے وہ رو پڑی مگر پھر فوراً ہی اس نے خود کو سنبھال لیا۔ "آخری بار ہمارے ساتھ چائے پیتے جاؤ"۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کی اس خواہش کا احترام کیا اور ہم ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ فاریہ نے حمیدہ کو بلا کر چائے کے لیے کہا۔

اس کی حالت دیکھ کر میرا دل خون ہو رہا تھا مگر میری تمام تر توجہ بیگ صاحب کے چہرے پر تھی جس پر اس وقت کافی اطمینان پھیلا ہوا تھا۔ ماسی میراں میرے رویے پر حیران بھی تھی اور دکھی بھی' سلطان کے بارے میں' میں کچھ اندازہ نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ خوش ہے یا غمگین' کچھ دیر بعد حمیدہ چائے لے آئی' اس کا چہرہ بھی سوالیہ بنا ہوا تھا مگر لب کھولنے کی ہمت نہیں

تھی کہ سب کی موجودگی میں کچھ پوچھتی۔ وہ چائے رکھ کر حیران حیران سی چلی گئی۔ ہم سب نے گہری خاموشی کے درمیان چائے پی۔ چائے ختم ہوتے ہی میں کھڑا ہو گیا۔

"چلو میں تم لوگوں کو چھوڑ آؤں"۔ فاریہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تھینک یو میڈم............ ہم چلے جائیں گے"۔ میں نے جواب دیا۔

"اقبال............ یہ میری خواہش ہے"۔

"سوری میڈم............!" میں نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا اور تیزی سے ڈرائنگ روم سے آ گیا۔

"اقبال............" بیگ صاحب مجھے پکارتے ہوئے باہر آ گئے۔ "فاریہ پہنچا دے گی بیٹا"۔

"نہیں بیگ صاحب' ہم چلے جائیں گے"۔

پھر میں رکا نہیں۔ سیدھا کوٹھی سے باہر آ گیا۔ میرے پیچھے سلطان' ماسی اور سوہنی تھے میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا کہ مجھ میں پلٹ کر دیکھنے کی تاب بھی نہ تھی۔ ہم کوٹھی سے باہر آنے کے بعد مین روڈ کی طرف چلے پڑے۔ مین روڈ پر ہمیں ٹیکسی مل گئی۔ میں نے ٹیکسی والے کو کرشن نگر کا پتا بتایا اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ محض آدھ گھنٹے کے بعد ہم سلطان کے گھر پہنچ گئے۔ اس وقت رات کے تقریباً آٹھ بجے تھے۔ سلطان نے کھانے کا بندوبست کیا' ماسی میراں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی سوہنی مجھ سے کچھ بولی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ دونوں مجھ سے ناراض ہیں۔ میں نے بھی صفائی پیش کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ ویسے میں بھی آئندہ کے بارے میں کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ اس لیے بستر پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔

مجھے جو کچھ کرنا تھا آج ہی رات کرنا تھا۔ آج کی رات بے حد اہم تھی۔ اب گھر میں بیگ صاحب کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا اس لیے وہ ان اہم دستاویزات کو وہاں سے ہٹا سکتے تھے کیوں کہ وہ بھی یہ بات خوب سمجھتے تھے کہ جمال اور زید ان دستاویزات کو حاصل کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ مجھ سے تو ان کی جان ان کے تئیں چھوٹ گئی تھی مگر جمال اور زید تو مجھ سے بھی بڑا خطرہ تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ فاریہ اب بھی ان کی نگرانی کر پائے گی یا نہیں۔ مجھے اس سے کسی بے وقوفی کی امید تو نہیں تھی مگر ممکن تھا میرے اس طرح چلے آنے پر وہ جذباتی ہو جائے اور بیگ صاحب کی مصروفیت پر نظر نہ رکھ سکے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

میں چلتے ہوئے یعقوب سے بھی نہیں مل سکا تھا۔ جس کا مجھے بعد میں احساس ہوا' بہرحال جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔

وقت گزر ہی نہیں رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے پوری کائنات تھم گئی ہو' کوئی آواز' کوئی آہٹ اور کوئی حرکت نہ تھی۔ سوہنی چپ چاپ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ ماسی میراں پلنگ پر آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی اور سلطان گھر سے باہر جا چکا تھا۔ میرا دل گھبرانے لگا۔ میں اٹھ کر باہر چلا آیا۔ سیڑھیاں اتر کر میں گلی میں نکل آیا تو مجھے کچھ زندگی کا احساس ہوا۔ بازار میں اچھی خاصی رونق تھی۔ ٹریفک چل رہا تھا اور گلی میں بچے بھاگ رہے تھے۔

میں ٹہلتا ہوا بازار میں آ گیا۔ میرے اندر اتنا سناٹا تھا کہ باہر کا شور بھی اسے ختم کرنے میں ناکام ہو گیا تھا۔ بالکل ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کوئی خاموش فلم دیکھ رہا ہوں یا میری سماعت ختم ہو چکی ہو کہ مجھے لوگوں کے ہلتے ہوئے ہونٹ دکھائی دے رہے تھے مگر آواز نہیں آ رہی تھی۔ میں خواب کی سی کیفیت میں چلتا چلا گیا۔

"جی سر"؟ اچانک ایک آواز گونجی اور مجھے ہوش آ گیا۔

"جی!" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"فون کرنا ہے آپ کو؟" سامنے کھڑے نوجوان نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ میں نے چونک کر اپنے گرد نگاہ ڈالی۔ میں پی سی او میں کھڑا تھا۔ سامنے کاؤنٹر پر تین فون رکھے تھے جن میں سے دو پر بات ہو رہی تھی۔

"جی.......... جی ہاں.......... تھینک یو"۔ میں نے بوکھلا کر جواب دیا اور فون اپنی جانب سرکا لیا۔ میں نے نمبر ڈائل کیا اور ریسیور کو کان سے لگا لیا۔

"ہیلو!" دوسری جانب سے فاریہ کی بھرائی ہوئی آواز سن کر میں سناٹے میں رہ گیا۔ میں نے لاشعوری طور پر فاریہ کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

"ہیلو.........." میرے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

وہ شاید مجھے پہچان نہیں پائی تھی۔ "ہیلو.......... کون؟" اس نے پوچھا۔

"نام نہیں لیجئے گا میڈم!" میں نے جلدی سے کہا۔ "میں اقبال ہوں' آپ کے قریب کوئی اور تو نہیں؟"

"نہیں.......... تم بولو۔" مجھے پہچانتے ہی اس کا لہجہ بدل گیا۔

"میڈم.......... یہ سب بہت ضروری تھا۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا؟ آپ نظر رکھئے گا' میں آپ سے دور نہیں ہوں میڈم.......... میں رات کو آؤں گا۔ بارہ بجے کے بعد' پچھلا دروازہ کھلا رکھئے گا"۔

"اوہ.......... تھینک یو.......... تھینک یو ویری مچ.........."

"او کے خدا حافظ"۔ میں نے فوراً ہی کہا اور ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

فاریہ کو فون کر کے میرا جی ہلکا ہو گیا اور وہ جو طبیعت پر ایک بوجھل پن تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ اب میں خود کو چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا۔ میں پھر بازار میں نکل آیا.......... اب وہ پہلے والی کیفیت ختم ہو چکی تھی' میرے چاروں طرف آوازیں تھیں' شور تھا اور میں خود کو کسی خاموش فلم میں نہیں بلکہ جاگتے انسانوں کے درمیان محسوس کر رہا تھا۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی پونے دس بجے تھے۔ میں نے بازار سے کچھ فروٹ خریدا اور گھر کی طرف چل پڑا۔

گھر میں وہی ویرانی اور خاموشی طاری تھی۔ میرے پہنچنے پر ماسی میراں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"روٹی کھا لے پتّر' سلطان کب سے انتظار کر رہا ہے"۔

"ہاں ماسی.......... اب تو بھوک بھی بہت لگی ہے"۔ میں نے کہا اور پھر دیوار سے ٹکی سوہنی کو مخاطب کیا۔ "سوہنی تجھے کینو پسند ہیں نا.......... دیکھ میں تیرے لیے کینو لایا ہوں اور پکوڑے بھی ہیں"۔ میرا خیال تھا کہ میرے لہجے کی تبدیلی گھر میں پھیلی ویرانی اور خاموشی کو توڑ دے گی مگر یہ محض خام خیالی تھی۔ ماسی چپ چاپ کچن میں چلی گئی اور سوہنی نے لمحہ بھر کو پلکیں اٹھا کر دیکھا تھا اور بس.......... اتنا ہوا کہ اس کی آنکھوں میں بھری تمام اداسی میرے وجود میں اتر گئی۔

میں جھلا اٹھا۔ "کیا مصیبت ہے؟ تم لوگوں کے چہروں پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟ مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہو تم لوگ؟" میرے ایک دم چیخ پڑنے پر سوہنی نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور ماسی میراں لپک کر کمرے میں چلی آئی اس کے پیچھے سلطان بھی تھا۔

"کیا ہو گیا بالے؟" سلطان نے پوچھا۔

"کچھ نہیں.......... یار' وہاں تھا تو مصیبت میں تھا یہاں آ گیا ہوں تو ان دونوں کی صورتیں یوں لٹکی ہوئی ہیں جیسے.......... جیسے میں مر گیا ہوں"۔

"رب نہ کرے بالے"۔ سوہنی اور ماسی بے اختیار بول اٹھیں۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"پھر............ پھر کیا ہو گیا' کیوں تم دونوں چپ ہو' کیا قیامت آ گئی؟" میں نے غصے سے پوچھا۔

"کچھ نہیں پُتر............ اب دیکھو نا............ پانی گزرتا ہے تو جگہ گیلی ہو جاتی ہے' کچھ دیر بعد ہی تو سوکھتی ہے نا"۔

"اچھا اب بس کر بالے............" سلطان نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ "تیرے اوپر تو آسیب کا سایہ ہو گیا"۔

میں خاموش ہو گیا اس وقت میرا دماغ گھوما ہوا تھا اس لیے میں نے زیادہ بات کرنا مناسب نہیں سمجھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ دونوں کیوں اداس ہیں مگر انہیں اپنے پروگرام کے بارے میں بتانے کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر ماسی دوبارہ کچن میں چلی گئی کچھ دیر بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں کھانے کے برتن تھے۔ سوہنی نے فرش پر دسترخوان بچھا دیا تھا۔ میں اور سلطان ہاتھ دھو کر وہاں بیٹھ گئے۔

کھانے کے دوران خاموشی رہی۔ میں مسلسل آئندہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اب مجھے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ فاریہ نہ صرف یہ کہ مطمئن ہو گئی ہو گی بلکہ وہ بیگ صاحب پر نگاہ بھی رکھے گی۔ مجھے یقین تھا کہ فاریہ میرا تمام پروگرام سمجھ گئی ہو گی۔ کھانے کے بعد ہم نے چائے پی' چائے پینے کے دوران سوہنی نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے اس طرح فاریہ وغیرہ کو کیوں چھوڑ دیا تب میں نے اسے بتایا کہ بیگ صاحب کو ہم سب کا وہاں رہنا پسند نہیں تھا اس لیے مجھے وہ جگہ چھوڑنا پڑی البتہ میں فاریہ سے ناراض نہیں ہوں اور یہ کہ وہ جب چاہیں اس سے ملنے جا سکتی ہیں۔

میری بات سن کر وہ خوش ہو گئی اور میں نے ان دونوں کے چہرے کے تاثرات کو واضح طور پر بدلتے محسوس کیا اب میں کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ میں نے سلطان کو اپنے رات کے پروگرام کے بارے میں بتایا تو وہ ہونقوں کی طرح مجھے دیکھتا رہ گیا۔

"یعنی تُو اس چکر سے نکلے گا نہیں؟"

"سلطان تُو سمجھتا کیوں نہیں' میں نمک حرام نہیں ہوں کہ اس تنہا عورت کو یوں چھوڑ دوں"۔

"نہ تو وہ تنہا کب ہے' اتنے تو گُرگے پالے ہوئے ہیں اس نے۔ وہ جو تُو بتا رہا تھا کہ شہر

سے باہر ایک قلعہ ہے اور وہاں اس کے وفادار رہتے ہیں۔"

"ہاں سلطان وہ اس کے وفادار ہیں مگر میں نہیں جانتا کہ وہ سب اب کہاں ہیں اور فاریہ ان کو درمیان میں کیوں نہیں لا رہی' یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے میں اس سلسلے میں اس سے کچھ نہیں کہہ سکتا اور دوسری بات یہ کہ مجھے تو خود کو دیکھنا ہے کہ میں اس کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ تُو صرف مجھے اتنا بتا کہ میرا ساتھ دے گا یا نہیں؟"

"اچھا یار تُو کہتا ہے تو ٹھیک ہے مگر کہے دیتا ہوں کہ یہ چکر تجھے برباد کر دے گا۔ تجھے تو اب صرف اور صرف سوہنی کا خیال کرنا چاہیے اقبال............ ڈاکٹر اس سے مایوس ہو چکے ہیں"۔

"مگر میں مایوس نہیں ہوں سلطان' مجھے خدا پر پورا بھروسا ہے' وہ مجھ سے میری آخری خوشی نہیں چھینے گا"۔

"رب تیری زبان مبارک کرے یار' چل اب کچھ دیر آرام کر لیں پھر تو رات کالی ہی کرنی ہے" اس نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

وہ سچ کہہ رہا تھا۔ نہ معلوم رات کو کیا سچویشن ہو۔ یہ سوچ کر میں کچھ دیر کے لیے لیٹ گیا۔ ماسی اور سوہنی سونے کے لیے لیٹ چکی تھیں۔ سلطان میرے پلنگ پر ترچھا ہو کر لیٹ گیا۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی رات کے پونے گیارہ بج چکے تھے ابھی ایک گھنٹا باقی تھا میں آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

وقت بہت دھیمی رفتار سے گزر رہا تھا لمحہ لمحہ میرے سینے کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک نامعلوم سا خوف مجھے مضطرب کر رہا تھا میں زیادہ دیر لیٹ نہ سکا تو گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ میرے اٹھنے کی وجہ سے سلطان بھی اٹھ بیٹھا۔

"ہاں............ کیا ٹائم ہوا ہے؟"

"ٹائم تو کافی ہے سلطان مگر یہ تو بتا ہم اتنی رات کو وہاں تک جائیں گے کیسے؟"

"ابے ہاں............ یہ تو خیال ہی نہیں رہا۔ اچھا ٹھیک ہے تُو انتظار کر میں منیر سے سوزوکی لے کر آتا ہوں۔" اس نے جوتے پہنتے ہوئے کہا۔

میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا کہ وہ کس منیر کے پاس جا رہا ہے اور کہاں سے سوزوکی لائے گا مجھے تو یہ سن کر کافی اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ گاڑی کا بندوبست کرنے جا رہا ہے۔ اس کے

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

جانے کے بعد میں بھی ماسی سے دروازہ بند کر لینے کو کہہ کر نیچے چلا آیا۔ میں نے ماسی سے کہہ دیا تھا کہ میری یا سلطان کی آواز سن کر ہی دروازہ کھولے ورنہ بند ہی رکھے۔

میں نیچے آکر سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ گلی سنسان تھی مگر گلی کے کونے پر پان کا کھوکھا کھلا ہوا تھا اور محلے کے کچھ نوجوان وہاں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ مجھے دور تک سلطان نظر نہ آیا۔ ہوا میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالی گیارہ بج کر پندرہ منٹ ہو رہے تھے۔ سلطان کو گئے تقریباً بیس منٹ ہو گئے تھے میں کھڑا ہو گیا۔ اب تک سلطان کو آ جانا چاہیے تھے۔ میں نے فاریہ کو پچھلا گیٹ کھلا رکھنے کے لیے کہا تھا۔ وہ بارہ بجے گیٹ کھول دے گی اور میرا انتظار کرے گی جبکہ ہمیں اس کوٹھی تک پہنچنے کے لیے بھی تقریباً آدھا گھنٹا چاہیے تھا۔

مجھے زیادہ پریشان نہیں ہونا پڑا اس لیے کہ عین اسی وقت دائیں جانب سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ وہ سلطان ہی تھا جو سوزوکی پک اپ لے کر آیا تھا۔ یہ بہت کھٹارا سی گاڑی تھی مگر اس وقت تو یہ بھی بڑی غنیمت تھی۔ اس نے میرے قریب گاڑی روکی اور دروازہ کھول دیا۔ میں فوراً بیٹھ گیا۔

"وقت کم ہے سلطان جلدی کرو"۔

"سڑکیں سنسان ہیں ہم بیس منٹ میں پہنچ جائیں گے۔" سلطان نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تیرے پاس پستول ہے؟" اس نے اچانک پوچھا۔

"ہاں.......... میں نے اسے بڑی احتیاط سے رکھا ہوا تھا۔ ساتھ لایا ہوں، حالات کوئی بھی رخ اختیار کر سکتے ہیں سلطان، ہمیں ہر قسم کے حالات کے لئے تیار رہنا ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے بالے، مگر میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں، میں گاڑی کا پانا پکڑ لوں گا، تو میری فکر نہ کرنا"۔

"ہوں.........." میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

سڑکیں واقعی سنسان تھیں، کبھی کبھی کوئی اِکا دُکا گاڑی ہمارے قریب سے گزر جاتی تھی۔ سلطان کافی تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہا تھا۔ ہم بائیس منٹ بعد ہی فاریہ کی کوٹھی کے قریب پہنچ گئے۔ میں نے گاڑی کافی فاصلے پر رکوالی تھی۔ میں کوٹھی تک پیدل ہی جانا چاہتا تھا۔ سلطان نے گاڑی اندھیرے میں روک دی۔ میں اور سلطان گاڑی سے اتر کر کوٹھی کی طرف

بڑھے۔ ہم دونوں دیوار کے سائے میں چل رہے تھے جہاں اندھیرا گہرا تھا۔ پانچ منٹ بعد ہی ہم کوٹھی کے پچھلے گیٹ کے قریب پہنچ گئے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ گیٹ اندر سے بند تھا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ یا تو فاریہ کو موقع ہی نہیں ملا تھا یا پھر اس کے گیٹ کھول دینے کے بعد کسی نے پھر اسے بند کر دیا تھا۔ اگر ایسا ہی تھا تو یہ بات ہمارے لیے کافی خطرناک تھی۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ خود فاریہ بھی کسی کی نگاہوں میں تھی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ہم اندر کیسے داخل ہوں۔ دیوار کودنا ہمارے لیے مشکل نہیں تھا مگر عین ممکن تھا کہ ہم اندر کودتے ہی دھر لیے جائیں۔ اس صورتِ حال نے مجھے پریشان کر دیا۔ میں سلطان کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی کی طرف آ گیا۔

"کیا ہو گیا؟" اس نے پوچھا۔

میں نے ساری بات بتا دی۔

"دیکھ بالے خطرہ مول لیا ہے تو وقت ضائع نہ کر، وقت ضائع کرنا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے فاریہ خطرے میں ہو"۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس کی بات سنتے ہی میں پھر کوٹھی کی طرف چل پڑا۔ سلطان میرے ساتھ تھا۔ ہم اس جانب آ گئے جہاں سے یعقوب کا کمرا قریب تھا اور یہاں سے میں ایک بار پہلے بھی دیوار کود کر اندر داخل ہو چکا تھا کیوں کہ کوٹھی کے اندر دیوار کے قریب بجری کا ڈھیر تھا اور وہاں سے کودنا آسان تھا۔ میں نے پہلے سلطان کو سہارا دے کر دیوار پر چڑھایا اور اس کے دوسری طرف کود جانے کے دو منٹ بعد میں بھی کسی نہ کسی طرح دیوار پر چڑھ گیا۔ اس کوشش میں میرے گھٹنے اور ہتھیلیاں زخمی ہو گئیں۔ دیوار سے میں نے بجری پر چھلانگ لگا دی۔ سلطان وہیں ایک کونے میں دبکا بیٹھا تھا اور اس کی نگاہیں اس راہداری پر تھیں جس کے آخر میں کچن تھا اور کچن کے سامنے جلنے والے بلب سے پھیلی ہوئی روشنی یہاں تک پہنچ رہی تھی۔

میں اور سلطان کچھ دیر وہیں دبکے رہے پھر میں دبے پاؤں یعقوب کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اس کے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا مگر باہر سے آنے والی روشنی میں یعقوب کا خالی پلنگ صاف نظر آ رہا تھا۔ مجھے اس وقت اسے بستر پر نہ دیکھ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

کر سخت حیرت ہوئی اور خاص طور پر اس لیے کہ وہ زخمی تھا۔ میں فوراً ہی پلٹ کر سلطان کے پاس آ گیا جو یعقوب کے کمرے کی دیوار سے لگا دور نظر آنے والے برآمدے کو دیکھ رہا تھا۔

یعقوب کے بارے میں سن کر وہ بھی حیران ہوا۔ میں نے اسے دوسری جانب سے جانے کا اشارہ کیا اور خود اس برآمدے کی طرف بڑھ گیا جہاں ڈرائنگ روم کا بیرونی دروازہ تھا۔

برآمدے کے کونے پر پہنچ کر میں دیوار کی آڑ میں چھپا رہا۔ میں نے جھانک کر پہلے چاروں طرف دیکھا۔ دور تک کوئی نہ تھا چوکیدار بھی شاید اپنی کوٹھری میں تھا کیوں کہ اس کی کوٹھری نما کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں بہت دیر تک لان کے اندھیرے کونوں کو گھورتا رہا مبادا وہاں کوئی چھپا ہوا ہو۔ جب مجھے کسی قسم کی کوئی آہٹ یا حرکت محسوس نہ ہوئی تب میں نے اللہ کا نام لے کر قدم آگے بڑھایا اور دیوار کے ساتھ دبے پاؤں چلتا ہوا ڈرائنگ روم کے دروازے کے قریب آ گیا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ لاک تھا۔ میں کھڑکی کی جانب بڑھا کھڑکی بھی بند تھی مگر ذرا سی زور آزمائی کے بعد میں کھڑکی کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ کھڑکی کے ساتھ ہی صوفہ تھا۔ میں کھڑکی سے اندر داخل ہوا۔ صوفے پاؤں رکھنے کے بعد جب میں نے دوسرا پاؤں زمین پر رکھنا چاہا تو میں کسی چیز سے ٹکرا کر منہ کے بل گر پڑا۔ گرتے ہی میں نے اپنے قریب عجیب سی آوازیں محسوس کیں۔ کمرے میں گہرا اندھیرا ہونے کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ میں ہاتھوں سے ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ میں کس چیز سے ٹکرایا تھا۔ جلد ہی میں نے اسے پا لیا۔ وہ کوئی انسانی جسم تھا جو رسیوں سے بری طرح جکڑا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ لگانے پر وہ کسمسایا۔ میں نے فوراً جیب سے ماچس نکال کر تیلی جلائی اور اس کی روشنی میں یعقوب اور فاریہ کو جکڑا دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ ان دونوں کے منہ پر ٹیپ لگے ہوئے تھے اور ہاتھ پاؤں رسّی سے جکڑے ہوئے تھے۔

وہ دونوں ہوش میں تھے۔ روشنی ہوتے ہی دونوں نے دیکھا۔ ان دونوں کے چہرے پر خوشی پھیل گئی۔ میں نے جلدی سے پہلے فاریہ اور یعقوب کے ہونٹوں پر لگے ٹیپ ہٹائے۔

"اقبال جلدی کرو............ ورنہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔" ٹیپ ہٹتے ہی فاریہ نے سرگوشی کی۔

"یہ کس نے کیا تھا؟" میں نے اس کے ہاتھ پیروں کی رسّیاں کھولتے ہوئے پوچھا۔

"میں نہیں جانتی' کھانا کھانے کے بعد میں کچھ دیر لان میں ٹہلنے لگی تھی۔ اس دوران

میں کسی نے پشت کی جانب سے مجھ پر حملہ کیا' کوئی وزنی چیز سر پر مار دی تھی۔ میں بے ہوش ہو گئی۔ اس کے بعد جب آنکھ کھلی تو یہاں' اس حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ کسی اور کی موجودگی کو میں نے محسوس تو کیا تھا مگر میں یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ یعقوب ہے۔" فاریہ نے اپنے پیروں میں الجھی ہوئی رسّی کو کھولتے ہوئے بتایا۔ اس دوران میں' میں یعقوب کو رسیوں سے آزاد کرا چکا تھا۔

"یہ کتنی دیر کی بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں............ کچھ اندازہ نہیں ہے کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہی۔"

"اچھا سنو یعقوب' تم چوکیدار کو الرٹ کر کے اپنے کمرے کی طرف سے کوٹھی کے پچھلے حصے کی جانب چلے جاؤ اور نظر رکھو اس طرف سے کوئی بھاگنے نہ پائے اور ہاں میں نے بیگ صاحب کے کمرے کی طرف سلطان کو بھیجا ہے۔" میری بات سنتے ہی یعقوب دبے پاؤں باہر نکل گیا۔

"آیئے میڈم............" میں نے آگے بڑھتے ہوئے سرگوشی کی۔

"سنو اقبال' میں قدیر کو فون کر دوں!"

"نہیں............ یہ وقت مناسب نہیں ہے اور نہ معلوم وہ کتنی دیر میں یہاں پہنچے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

پھر ہم دونوں دبے قدموں زاریہ کے کمرے کی طرف بڑھے۔ میں بیگ صاحب کو بھی چیک کرنا چاہتا تھا اس لیے دیوار کی اس جانب تھا جس طرف بیگ صاحب کا کمرا تھا۔ ہم چند ہی لمحوں بعد بیگ صاحب کے کمرے کی کھڑکی کے پاس پہنچ گئے میں نے اندر جھانکا اور اندر کا منظر دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ فرش پر سلطان بے حس و حرکت پڑا تھا اور بیگ صاحب اس کے ہاتھ باندھ رہے تھے۔ یہ منظر شاید فاریہ نے بھی دیکھ لیا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی حرکت کرتی میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"شش............" میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اسے لیے ہوئے دبے پاؤں زاریہ کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اندر نائٹ بلب جل رہا تھا۔ زاریہ بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے فاریہ کو باتھ روم میں جانے کا اشارہ کیا اور خود کمرے سے باہر چلا آیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ بیگ صاحب کیا کرنے والے ہیں۔ توقع تو یہی تھی کہ وہ زاریہ کے کمرے کی طرف

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

آئیں گے مگر یہ ضروری بھی نہیں تھا کہ فاریہ کا اندازہ درست ثابت ہو' اسی لیے میں انہیں اپنی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ سلطان سے وابستہ امیدیں تو اب ختم ہو چکی تھیں۔ لے دے کے اب یعقوب ہی رہ گیا تھا۔

میں نے جیسے ہی راہداری میں قدم رکھا بیگ صاحب کو کمرے سے نکلتا دیکھا' میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ستون کی آڑ میں ہو گیا ورنہ میرا دیکھ لیا جانا یقینی تھا۔ بیگ صاحب زاریہ کے کمرے کی طرف آنے کی بجائے اس کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے جسے میں نے ہمیشہ بند دیکھا تھا۔ یہ کمرا زاریہ کے کمرے کے برابر والا تھا اور بیگ صاحب کے کمرے کی کھڑکی اسی کمرے کے دروازے کے عین سامنے تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ کس کا کمرا ہے اور کیوں بند ہے' ایسے حالات پیدا ہی نہیں ہوئے تھے کہ فاریہ سے اس بند کمرے کے بارے میں پوچھتا۔

میں اسی ستون کی آڑ میں کھڑا بیگ صاحب کو دیکھ رہا تھا جو بڑے چوکنے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دبے پاؤں اس طرف بڑھ رہے تھے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر انھوں نے سلیپنگ گاؤن کی جیب سے غالباً چابی نکالی اور لاک کھول لیا۔ دوسرے لمحے ہی وہ دروازہ بند ہو گیا۔ میں تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ میں نے دروازے سے اپنا کان لگا دیا۔ اندر سے کچھ دیر آہٹ آتی رہی پھر سناٹا چھا گیا۔ میں کافی دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس کمرے کی ایک کھڑکی تھی تو' مگر اندر سے بند تھی ورنہ میں اندر دیکھنے کی کوشش ضرور کرتا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد میں نے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ فوراً ہی مجھے احساس ہو گیا کہ دروازہ لاک نہیں ہے۔ ظاہر ہے بیگ صاحب' یعقوب اور فاریہ کی طرف سے مطمئن تھے' میرے بارے میں انہیں گمان بھی نہ ہو گا۔ جمال اور زید کی طرف سے غالباً انہیں فکر تھی جس کی وجہ سے وہ اتنی احتیاط سے کام لے رہے تھے۔

میں نے دھیرے سے دروازہ کھولا اندر گہرا اندھیرا تھا۔ میں بغیر آہٹ پیدا کیے اندر داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے میں پستول نکال چکا تھا۔ دروازہ میں نے پھر بند کر دیا۔ چند لمحے میں آہٹ لینے کی کوشش کرتا رہا مگر یوں لگتا تھا جیسے کمرے میں کوئی موجود نہیں۔ اب میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی کچھ عادی ہو گئیں تو مجھے احساس ہوا کہ یہ کمرا اسٹور روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا کیونکہ جلد ہی مجھے تلے اوپر رکھی کچھ کرسیاں' اٹیچی

کیس' الماریاں اور بستر وغیرہ رکھے نظر آ گئے۔

یہ یقین ہونے کے بعد کہ کمرے میں کوئی موجود نہیں مجھے سخت حیرت ہوئی کیوں کہ چند لمحے پہلے میں اپنی آنکھوں سے بیگ صاحب کو اندر داخل ہوتے دیکھ چکا تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ تہہ خانے کا رستہ سوفی صد یہیں موجود ہے۔ میں نے ہمت کر کے ماچس کی تیلی جلائی۔ روشنی ہوتے ہی میرے اس خیال کی تصدیق ہو گئی کہ کمرا اسٹور روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ اسٹور کے طور پر استعمال ہونے والے اس کمرے میں کارپٹ بچھا ہوا تھا اور اس وقت ایک کونے سے کارپٹ اٹھا ہوا تھا جہاں سے لکڑی کا ایک تختہ اٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں تیزی سے اس تختے کی طرف بڑھا میرا خیال صحیح تھا۔ قریب جاتے ہی مجھے وہ خلا نظر آ گیا جہاں سے سیڑھیاں نیچے کی طرف جا رہی تھیں۔ اندر کہیں دور سے ہلکی روشنی آتی محسوس ہو رہی تھی۔ سیڑھیاں لکڑی کی تھیں۔ میں نے بڑی احتیاط سے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا۔ سیڑھیاں خاصی مضبوط تھیں اس لیے کسی قسم کی آواز پیدا نہ ہوئی جس سے میری کچھ ہمت بڑھی اور میں آہستہ آہستہ نیچے اترتا چلا گیا مگر آخری سیڑھی سے کچھ پہلے ہی رک گیا۔ اب مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ روشنی میرے دائیں جانب تھی۔ یہ سیڑھیاں کمرے کے بیچوں بیچ نہیں تھیں بلکہ درمیان میں سے بل کھا کر اس طرح اترتی تھیں جہاں دیوار میں نصب الماری تھی گویا جب میں کمرے میں اترتا تو میرا دیکھ لیا جانا ممکن نہ تھا کیونکہ میں اس دیوار کی آڑ میں ہوتا جہاں الماری بنی ہوئی تھی۔ یہ اطمینان ہو جانے کے بعد کہ میں کمرے مین اترنے کے بعد بھی بیگ صاحب کی نگاہوں سے اوجھل رہ سکتا ہوں' میں نیچے اتر گیا۔

اب پورا کمرا میرے سامنے تھا۔ سوائے اس حصے کے جہاں روشنی ہو رہی تھی اور جہاں بیگ صاحب (غالباً) موجود تھے۔ یہ کمرا بے حد خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میں کسی اعلیٰ عہدے دار کے آفس میں کھڑا ہوں۔ سامنے کی طرف بہترین صوفہ اور سینٹرل ٹیبل رکھی تھی۔ فرش پر گہرے سرخ رنگ کا دبیز قالین تھا۔ دیواروں پر ہلکا نیلا رنگ کیا گیا تھا۔ ڈیکوریشن کی جتنی بھی چیزیں تھیں یہ سب سرخ رنگ کی تھیں مثلاً گل دان' ٹیبل لیمپ کا شیڈ' دیوار پر لگی تصویروں میں بھی رنگوں کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ میں نے ایک طائرانہ نگاہ پورے کمرے میں ڈالی اور جھانک کر اس سمت دیکھا جہاں بیگ صاحب کی موجودگی متوقع

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

تھی۔ وہ ایک بڑی سی ٹیبل کے پیچھے رکھی موونگ چیئر پر بیٹھے ایک فائل دیکھ رہے تھے۔ وہ فائل انہوں نے کہاں سے نکالی تھی یہ میں نہ جان سکا۔ میرا خیال تھا کہ یہ فائل انہوں نے یقیناً اسی صندوق میں سے نکالی ہوگی جس کی تلاش جمال اور زید کو بھی تھی مگر مجھے پورے کمرے میں کہیں کوئی ایسا صندوق نظر نہ آیا۔

بیگ صاحب مجھ سے کافی فاصلے پر تھے اور ان کا چہرہ بالکل سامنے تھا یعنی اگر میں دیوار کی آڑ سے باہر آتا تو فوراً ان کی نگاہوں میں آ جاتا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں، میں ابھی کشمکش میں تھا کہ اچانک بیگ صاحب کھڑے ہو گئے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے انہیں اچانک کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ وہ سیدھے سیڑھیوں کی طرف آ رہے تھے۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹا اور اندھیرے میں دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے سانس تک روک لی۔ بیگ صاحب شاید بہت جلدی میں تھے۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر سیڑھیاں چڑھتے چلے گئے۔ میں بال بال بچ گیا ورنہ دیکھ لیا جانا یقینی تھا۔ ان کے تہہ خانے سے باہر جاتے ہی میں سیڑھیوں کی طرف لپکا اور اوپر چڑھتا چلا گیا مگر میں نے تہہ خانے سے باہر جانے کی کوشش نہیں کی بلکہ کچھ پہلے ہی ٹھہر گیا۔ اوپر سے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی پھر میں نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ گویا بیگ صاحب اوپر کے کمرے سے باہر جا چکے تھے۔ یہ جانتے ہی میں نے سیڑھیوں کے اختتام پر بنا ہوا لکڑی کا تختہ بند کر لیا۔ اب تہہ خانے کا راستہ بند ہو چکا تھا۔ میں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ وہ اندر سے بھی لاک ہو سکتا ہے۔

میں نے دروازے کو لاک کر دیا اور اطمینان سے واپس تہہ خانے میں اتر گیا بلکہ اسے تہہ خانہ کہنا زیادتی تھی۔ وہ ایک خوب صورت آفس تھا۔ اب میں نے اس کمرے کی ہر چیز کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ اس بڑی سی آفس ٹیبل کے دائیں اور بائیں جانب لوہے کی بڑی بڑی الماریاں تھیں۔ میں نے انہیں چیک کیا، وہ سب لاک تھیں۔ میں حیران تھا کہ آخر میں ان اہم دستاویزات کو کہاں تلاش کروں صندوق نام کی کوئی چیز یہاں نہیں تھی۔ دیوار میں نصب لکڑی کی الماری بھی لاک تھی، البتہ ٹیبل کی درازیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک ایک کر کے تمام درازیں کھول ڈالیں۔ آخری دراز کھلتے ہی میں چونک گیا۔ دراز میں بہت سی چابیاں رکھی تھیں۔ جو یقیناً الماریوں کی ہوں گی۔ میں نے تمام چابیاں اٹھا کر جیب میں ڈال لیں۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں ایک ایک الماری کھول کر چیک کرتا۔ میں چاہتا تھا کہ بیگ

صاحب کے آنے سے پہلے مطلوبہ صندوق تلاش کر لوں۔

بیگ صاحب کو گئے ہوئے تقریباً تین چار منٹ ہو چکے تھے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ فی الحال مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے اور میں بیگ صاحب کے چلے جانے کے بعد یہاں دوبارہ آ کر اطمینان سے ہر چیز چیک کروں گا مگر یہ بھی خطرہ تھا کہ بیگ صاحب وہ دستاویزات اپنے ساتھ نہ لے جائیں، میرا ذہن کام نہیں کر رہا تھا اگر میں یہیں چھپا رہتا تو بھی میرے لیے خطرہ تھا۔ میں یہاں قید بھی ہو سکتا تھا۔ اگر بیگ صاحب کو شبہ ہو جاتا کہ میں یہاں ہوں تو وہ مجھے یہیں قید کر کے جا سکتے تھے فاریہ کو پتا بھی نہ چلتا کہ میں کہاں گیا۔ اس خیال کے آتے ہی میں سیڑھیوں کی طرف لپکا مگر سیڑھیوں تک جانے سے پہلے میں نے وہ فائل اپنے کوٹ میں چھپا لی تھی جس کا بیگ صاحب کچھ دیر پہلے بڑے انہماک سے مطالعہ کر رہے تھے۔

میں بغیر کسی پریشانی کے تہہ خانے سے باہر آیا۔ بیگ صاحب ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ کمرے کا وہ دروازہ لاک تھا جو راہداری میں کھلتا تھا، گویا میں اس کمرے میں قید ہو گیا تھا۔ اب مجھے بیگ صاحب کا انتظار تھا۔ میں نے تہہ خانے کے اس تختے کو کھلا چھوڑ دیا تھا کیوں کہ بیگ صاحب اسے کھلا چھوڑ کر گئے تھے جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ واپس آئیں گے۔ اب انہیں گئے تقریباً سات منٹ ہو چکے تھے۔ میں ایک الماری کے پیچھے چھپا ان کے آنے کا انتظار کرتا رہا۔ دس منٹ بعد مجھے دروازے کے لاک میں چابی گھومنے کی آواز سنائی دی اور دُوسرے ہی لمحے بیگ صاحب اندر داخل ہوئے۔ ان کا چہرہ پیلا ہو رہا تھا۔ چہرے پر پھیلا خوف پہلی ہی نگاہ میں محسوس ہو رہا تھا اس سے پہلے کہ میں کچھ اور سوچتا بیگ صاحب کے پیچھے مجھے جمال کا چہرہ نظر آیا۔ اب وہ دونوں کمرے میں آ چکے تھے۔ جمال کے ہاتھ میں پستول تھا۔ جس کا رخ بیگ صاحب کی طرف تھا۔ اب صورتِ حال واضح ہو گئی تھی۔ جمال کو دیکھ کر مجھے اس بات کی خوشی ہوئی کہ میں نے چابیاں اور وہ فائل غائب کر دی تھی ورنہ اگر چابیاں اس کے ہاتھ لگ جاتیں تو گویا سب کچھ ختم ہو جاتا پھر بھی مجھے اس صندوق کی فکر تھی جس کی اسے تلاش ہوگی۔

”آگے بڑھو بڑے میاں؟“ کمرے میں جمال کی آواز گونج اٹھی۔ اس نے پیچھے سے بیگ صاحب کو دھکا دے کر کہا تھا۔

بیگ صاحب سہمے ہوئے آگے بڑھے۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے تہہ خانے کے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

کھلے ہوئے حصے کے قریب پہنچ گئے۔ جمال نے کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا تھا اور یہ میرے حق میں بہتر تھا اگر وہ دروازہ لاک کر دیتا تو میرا سامنے آنا ناگزیر ہو جاتا۔

ان دونوں کے تہ خانے میں اترتے ہی میں دبے پاؤں کمرے سے باہر آ گیا اور پھر میں نے زاریہ کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں چاہتا تھا کہ اس کمرے کو لاک کر دیا جائے تاکہ جمال اور بیگ صاحب وہاں سے نہ نکل سکیں اور چابی میرے پاس نہیں تھی بلکہ بیگ صاحب کے پاس تھی۔ ایکسٹرا چابی کے بارے میں فاریہ ہی جانتی ہوگی۔ میں ابھی زاریہ کے کمرے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ فاریہ کمرے سے نکلتی نظر آئی۔ میں نے لپک کر اس کا بازو پکڑا اور دوبارہ کمرے میں لے گیا۔

"کک......... کیا ہو گیا اتنی دیر کیوں ہوئی؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

تب میں نے اسے ساری بات بتائی اور اس سے پوچھا کہ اس کمرے کی ایکسٹرا چابی کہاں ہے؟ یہ سنتے ہی وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگی میں اس کمرے کے دروازے پر الرٹ کھڑا ہو گیا تاکہ اگر یہ لوگ باہر آئیں تو میں انہیں قابو کر سکوں چند لمحوں بعد ہی فاریہ چابی لے کر آ گئی۔ میں نے دروازہ لاک کر دیا اور فاریہ سے کہا کہ وہ انسپکٹر قدیر کو فون کر کے بلا لے۔ فاریہ نے انسپکٹر قدیر کو فون کر دیا۔ میں یعقوب کی طرف سے پریشان تھا مگر فاریہ نے بتایا کہ وہ سلطان کو لے کر اپنے کمرے میں گیا ہے۔ سلطان کے سر پر چوٹ آئی تھی یہ سن کر میں اور فاریہ یعقوب کی طرف چل پڑے۔

سلطان اور یعقوب دونوں ہی مل گئے۔ سلطان نے بتایا کہ وہ بیگ صاحب کے کمرے کی کھڑکی سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک کسی نے پشت پر سے اس پر حملہ کر دیا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ زخم اتنا گہرا نہیں تھا مگر میں نے اسے وہیں لیٹے رہنے کی ہدایت کی کچھ ہی دیر بعد چوکیدار نے آ کر بتایا کہ انسپکٹر قدیر آئے ہیں۔ میں اوز فاریہ دونوں گیٹ کی طرف دوڑے۔ انسپکٹر قدیر اپنے ساتھ کافی سپاہی لے کر آیا تھا۔ مجھ سے تفصیل سننے کے بعد وہ اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کے سپاہی بھی اس کے ساتھ تھے۔

چند لمحوں بعد وہ سب واپس آئے تو جمال کے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی اور بیگ صاحب کا سر جھکا ہوا تھا۔ انسپکٹر قدیر اپنی معمول کی کارروائی کرنے کے بعد جمال کو لے کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے یعقوب سے کہا وہ بیگ صاحب کو ان کے کمرے میں لے جائے۔

بیگ صاحب نے میری زبان سے یہ حکم سننے کے بعد ایک لفظ بھی نہ کہا اور اٹھ کھڑے ہو گئے۔

"ایک منٹ بیگ صاحب"۔ میں نے کہا اور اپنے کوٹ میں چھپائی ہوئی فائل نکال لی۔ فائل پر نگاہ پڑتے ہی بیگ صاحب کے چہرے پر دہشت پھیل گئی۔ مگران سے کچھ بولا نہیں گیا۔

"بیگ صاحب مجھے افسوس ہے کہ میں اس معاملے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔ خدا کی قسم، اگر میرا باپ بھی ہوتا تو میں اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیتا"۔ اتنا کہہ کر میں نے یعقوب کو اشارہ کیا اور وہ بیگ صاحب کو لے کر ڈرائنگ روم سے باہر چلا گیا۔ میں نے یعقوب سے کہہ دیا تھا کہ وہ بیگ صاحب کے کمرے کا دروازہ لاک کر کے آئے۔

ان کے جانے کے بعد میں اور فاریہ اس کمرے کی طرف بڑھ گئے جہاں سے تہہ خانے کا رستہ تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم اس تہہ خانے کی الماریوں کی تلاشی لے رہے تھے۔ میں نے اس فائل کا مطالعہ بھی کیا اور یہاں مجھے وہ صندوق بھی مل گیا جس کی مجھے تلاش تھی مگر یہ ویسا صندوق نہیں تھا جیسا میں سمجھ رہا تھا بلکہ یہ بریف کیس سے کچھ بڑا ایک منقش صندوقچہ تھا جس کا لاک عجیب و غریب قسم کا تھا مگر مجھے لاک کھولنے میں محنت نہیں کرنا پڑی کیوں کہ وہ پہلے سے کھلا ہوا تھا۔ غالباً بیگ صاحب اسے کھول چکے تھے اور جو فائل میں نے ٹیبل سے اٹھائی تھی وہ وہی فائل تھی جو یقیناً اس صندوق میں بند تھی۔

اس فائل میں بیگ صاحب کے علاوہ بہادر، جمال اور زید کے کالے کرتوتوں کے سارے ثبوت موجود تھے۔ یہ اتنا کچھ تھا کہ اس کے بعد کسی اور چیز کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی۔ الماری میں موجود کچھ فائلوں کے مطالعے سے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ بیگ صاحب نے فاریہ اور زاریہ کی تمام جائیداد اپنے نام کروالی ہے اور وہ جب چاہتے انہیں گھر سے نکال سکتے تھے۔ مگر شاید اپنے مذموم کاروبار کی وجہ سے انہوں نے ان دونوں کی آڑ لے رکھی تھی۔

ان دستاویزات کا سرسری مطالعہ کر کے خود انسپکٹر قدیر بھی حیران رہ گیا۔ اسے بھی یہ جان کر حیرت ہوئی تھی کہ بیگ صاحب نے کس قدر چالاکی سے خود کو سلطانی گواہ کی حیثیت دے لی تھی اور تمام تر الزامات وصی صاحب کے سر تھوپ دیے تھے۔ یہ بات تو ٹھیک تھی کہ وصی صاحب، بیگ صاحب کے ساتھ ملے ہوئے تھے مگر وہ صرف کام کی نگرانی کرتے تھے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

ورنہ کرتا دھرتا خود بیگ صاحب ہی تھے۔ اس فائل میں اور بہت سے نام تھے جن کا تعلق کسٹم اور پولیس سے تھا اور جو لوگ ہیروئن کی سپلائی میں ان اسمگلروں کی معاونت کرتے تھے۔

انسپکٹر قدیر اتنا بڑا کیس مل جانے پر بے حد مسرور بھی تھا مگر پرانی جان پہچان کی وجہ سے بیگ صاحب کی گرفتاری پر ملول بھی، مگر ظاہر ہے کہ یہ اس کی ڈیوٹی تھی اور پھر فاریہ خود یہ چاہتی تھی کہ وہ ہیروئن کے اسمگلروں کو گرفتار کرا دے، اب یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ ان اسمگلروں کی فہرست میں بیگ صاحب کا نام بھی شامل تھا اور بہرحال یہ ممکن نہیں تھا کہ باقی سب کو تو پکڑوا دیا جائے مگر بیگ صاحب کو چھوڑ دیا جائے۔

"فاریہ.......... بیگ صاحب کی گرفتاری ناگزیر ہو چکی ہے"۔ انسپکٹر قدیر نے دھیمے لہجے میں کہا۔ اس کے انداز میں افسردگی تھی۔

"میں جانتی ہوں قدیر.......... مگر مجھے اس بات پر کوئی صدمہ نہیں بلکہ میں خوش ہوں کہ ملک دشمن عناصر کو گرفتار کرواتے ہوئے میں نے اپنے ذاتی مفاد یا اقربا پروری کو خود پر اثر انداز نہیں ہونے دیا۔" اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز بھرا رہی تھی مگر اس نے خود پر قابو رکھا تھا۔ اس کے چہرے سے کسی کمزوری کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

"آئی ایم سوری فاریہ، یہ ناپسندیدہ کام مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی کرنا پڑے گا"۔ یہ کہتے ہوئے انسپکٹر قدیر کھڑا ہو گیا۔ میں اور فاریہ بھی اس کے ساتھ ہی باہر آ گئے۔ وہ پہلے پورچ کی طرف گیا۔ چند لمحوں بعد جب وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں تھیں۔ میں نے دیکھا کہ ہتھکڑیوں پر نگاہ پڑتے ہی فاریہ نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ شاید اس میں دیکھنے کی تاب نہیں تھی۔

انسپکٹر قدیر نے لحہ بھر کو فاریہ کی طرف دیکھا، ٹھٹکا اور پھر تیزی سے بیگ صاحب کے کمرے کے دروازے کی طرف چل دیا۔ ابھی ہم بیگ صاحب کے کمرے سے چند قدم کے فاصلے پر ہی تھے کہ اچانک گولی چلنے کی آواز نے ہمیں اچھلنے پر مجبور کر دیا۔ آواز اتنے قریب سے آئی تھی کہ میرے کانوں میں سیٹیاں بجنے لگیں۔ میں بوکھلا کر پلٹا اور اس طرف بھاگا جدھر میں نے فاریہ کو چھوڑا تھا مگر وہ ہماری ہی طرف بھاگتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اس کے پیچھے چوکیدار اپنی بندوق سنبھالے چلا آ رہا تھا۔

"اقبال کیا ہوا؟" وہ چیخی۔

اس کے اس سوال نے مجھے چونکا دیا اور میں بے اختیار انسپکٹر قدیر کی طرف دوڑا اور اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں جو خیال آیا وہ بہت خوفناک تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ انسپکٹر قدیر، بیگ صاحب کے کمرے کی طرف بھاگا تھا۔ میں فاریہ اور چوکیدار، تقریباً ساتھ ہی بیگ صاحب کے کمرے تک پہنچے تھے دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں سیدھا اندر داخل ہو گیا۔ میرے ذہن میں جو خیال آیا تھا وہ صحیح تھا۔ سامنے ہی بیگ صاحب فرش پر بکھرے پڑے تھے۔ ان کی کنپٹی سے خون بہہ رہا تھا۔ فاریہ چیخ کر آگے بڑھی مگر انسپکٹر قدیر نے اسے روک لیا۔

یعقوب منہ کھولے حیران کھڑا تھا۔ گولی چلنے کی آواز نے سلطان کو ہی نہیں زاریہ کو بھی یہاں تک آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ذرا سی دیر میں ہی کہرام مچ گیا۔ زاریہ جو بیگ صاحب کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ خود فاریہ کی حالت بھی بہت خراب تھی۔ کچھ بھی تھا اُس نے ایسا تو کبھی نہ چاہا ہو گا، وہی کیا، میں نے بھی ایسا نہیں سوچا تھا میں یہ ضرور چاہتا تھا کہ انہیں ان کے کیے کی سزا ملے مگر جو سزا انہوں نے اپنے لیے چنی تھی وہ بہت ہیبت ناک تھی۔

اس وقت انسپکٹر قدیر اور اس کے مزید دو آدمیوں کی موجودگی نے ہم سب کو بڑی پریشانی سے بچا لیا تھا ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ اس خودکشی کو قتل سمجھا جاتا۔ انسپکٹر نے قانونی کارروائی کرنے کے بعد لاش اٹھوا کر پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی۔ اس کارروائی میں صبح ہو گئی۔ فاریہ، زاریہ کو سنبھال رہی تھی مگر وہ تو یوں مچل مچل کر رو رہی تھی جیسے کسی نے اس کی ماں کو اس سے جدا کر دیا ہو۔ بے چاری یہ کہاں جانتی تھی کہ جس شخص کے لیے وہ تڑپ رہی ہے اس نے ان دونوں بہنوں کو ایسی جگہ پہنچا دیا تھا کہ اگر وہ چاہتا تو انہیں انہی کی کوٹھی سے دھکے دے کر نکال دیتا اور وہ کوڑی کوڑی کی محتاج ہو جاتیں۔ یہ سب نہ جاننا اس کے لیے بہتر ہی تھا۔ پیار نہ سہی، پیار کا احساس ہی انسان کو جینے کا کتنا حوصلہ دیتا ہے، یہ تو میں ہی جانتا تھا۔

اگلی صبح سلطان نے جا کر ماسی اور سوہنی کو اس حادثے کے بارے میں بتایا تو وہ دونوں اس کے ساتھ ہی کوٹھی آ گئیں۔ سوہنی کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ یہ میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر سفیدی چھائی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں وحشت تھی اور کوئی ایسی

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

بات تھی جس نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔ مجھے اس کی بدنصیبی پر رونا آیا کہ میری تمنا کرنے کی اسے کیسی کڑی سزا مل رہی ہے کہ میں اس کے قریب ہوتے ہوئے بھی اس کی دسترس سے دور ہوں۔ اس کے لیے کچھ بھی تو نہیں کر پایا تھا مگر اب میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں سوہنی کو مرنے نہیں دوں گا۔ اپنا لمحہ لمحہ اور پیار کا قطرہ قطرہ اس کی نذر کر دوں گا۔ آج میرا سب سے بڑا مشن پورا ہو چکا تھا میں نے فاریہ کا قرض اتار دیا تھا۔ ان تمام لوگوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا تھا جو فاریہ اور زاریہ ہی کے نہیں پوری قوم کے دشمن تھے۔ اب مجھ پر سوہنی کا قرض باقی تھا یا ماں اور صغرا کا اور.......... اور میرے باپ کا جو میری آزادی کی خواہش کی پاداش میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ سوہنی کا علاج کروا کے میں سیدھا گاؤں جاؤں گا اور راجو اور چوہدری کو ایسا سبق دوں گا کہ ان کی نسلیں بھی یاد رکھیں گی اور زندگی بھر معصوم لوگوں کو غلام کرنے کی جرأت نہیں کر سکیں گی۔

وہ تمام دن عجیب افراتفری میں گزر گیا۔ مغرب سے کچھ پہلے پولیس نے بیگ صاحب کی لاش واپس کی' اسی وقت قدیر نے بتایا کہ بہادر' زید اور وصی صاحب کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور فاریہ کی فیکٹری سیل کر دی گئی ہے۔ اس وقت یہ انکشاف بھی ہوا کہ عذرا' جس کا میرے اغوا کے بعد سے کچھ پتا نہ تھا' بہادر کی قید میں تھی۔ انسپکٹر قدیر کے ہمراہ وہ بھی آئی تھی۔ اس نے بتایا کہ بہادر کو علم ہو گیا تھا کہ وہ اصل میں فاریہ کی ساتھی ہے اس نے اسی وقت اسے قید کر دیا تھا۔ مجھے شرمندگی تھی کہ میں اسے بالکل بھول چکا تھا۔ قصور میرا نہ تھا بلکہ حالات کچھ اس انداز میں پیش آتے رہے کہ میں الجھ کر رہ گیا۔ ویسے میں نے واپس آنے کے بعد فاریہ سے اس کے بارے میں پوچھا تو تھا مگر اس نے بتایا کہ عذرا کا کچھ پتا نہیں ہے۔ وہ اس کے گھر میں بھی گئی تھی مگر پتا چلا تھا کہ گھر بند ہے اور وہاں سے وہ لوگ کہیں اور جا چکے ہیں تب وہ سمجھی کہ شاید عذرا خود ہی ان لوگوں کو لے کر کہیں چلی گئی ہے مگر عذرا نے بتایا کہ وہ خود حیران ہے کہ وہ عورت کہاں گئی جسے وہ ماں کہتی تھی۔ بہرحال کیوں کہ عذرا کا اس سے کوئی رشتہ نہیں تھا اس لیے اسے یہ سن کر کچھ بھی دکھ نہیں ہوا کہ وہ لوگ نہیں ہیں۔

فاریہ نے عذرا کو اپنے ساتھ رہنے کی آفر کی جسے اس نے قبول کر لیا تھا۔ سلطان کے سر کا زخم بھر گیا تھا وہ تین روز تک خاموش رہا مگر تیسرے روز ہی اس نے کہہ دیا کہ وہ اپنے گھر جا رہا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ فاریہ اب کسی حال میں بھی سوہنی وغیرہ کو کہیں نہیں جانے دے گی۔ وہ

میرے روکنے کے باوجود نہ رکا اور تیسرے دن رات کو اپنے گھر چلا گیا۔ ہم لوگوں کو فاریہ نے نہیں جانے دیا۔ اسی رات سوہنی کی حالت مزید بگڑ گئی۔ ڈاکٹر طارق جو بیگ صاحب کی وفات پر بھی موجود تھے اس کی طرف سے بہت پریشان تھے۔ فاریہ نے انہیں فون کر کے بلایا تھا۔ انہوں نے سوہنی کا معائنہ کیا' کچھ دوائیں دیں اور پریشان پریشان سے باہر آ گئے' میں ان کے پیچھے چلا آیا۔ انہوں نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ "مسٹر اقبال' سوہنی کو بالکل تنہا نہ چھوڑیئے گا"۔

"ڈاکٹر' کیا سوہنی کا مرض لاعلاج ہے؟"

"ہاں مسٹر اقبال' کم از کم اب ہم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ دھیرے دھیرے گہرے اندھیروں کی طرف بڑھ رہی ہے"۔ انہوں نے غمگین لہجے میں کہا۔

"نہیں ڈاکٹر.......... کچھ تو ہو سکتا ہو گا.......... اس نے تو ابھی کچھ بھی نہیں دیکھا.......... وہ تو گاؤں کی آزاد اور صاف ستھری فضاؤں میں رہی ہے' اسے ایسا کوئی مرض نہیں ہو سکتا"۔

"اس مرض کا تعلق آب و ہوا سے نہیں ہے مسٹر اقبال' یہ خوفناک مرض کہیں بھی رہنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ آپ.......... آپ ان کے لیے دعا کریں اور انہیں تنہا نہ چھوڑیں ایسا نہ ہو کہ گزرنے والا کوئی لمحہ آپ کے لیے پچھتاوے چھوڑ جائے"۔

میں نے کہنا چاہا کہ وہ اسے بچا لیں مگر وہ رکے نہیں۔ اپنا بیگ اٹھا کر پورچ کی طرف چلے گئے۔ ان کی باتوں کی بازگشت مجھے اپنے وجود میں گونجتی محسوس ہوئی اور میں پلٹ کر سوہنی کے کمرے کی طرف بھاگا۔

فاریہ اور زاریہ بھی وہیں موجود تھیں۔ ماسی میراں کی قوتِ برداشت ختم ہو چکی تھی۔ وہ سوہنی کے سرہانے بیٹھی' منہ پر دوپٹہ ڈالے بری طرح رو رہی تھی۔

"ماسی!" میں نے دھیرے سے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ہائے بالے میں کیا کروں.......... ارے میری زندگی بھر کی پونجی لٹ جائے گی۔ میں کیسے جیوں گی بالے.......... میں نے کیا گناہ کیا ہے ربا.......... میری سوہنی کو بچا لے.........."

"ماسی.......... صبر کر ماسی خدا ضرور رحم کرے گا"۔ میں نے آنسوؤں کو حلق میں اتارتے ہوئے کہا اور خود سوہنی کے قریب بیٹھ گیا۔

وہ ہوش میں نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ غشی میں ہو۔ کبھی کبھی وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

میں کچھ کہتی مگر اس کی آواز اتنی مدھم تھی کہ میں باوجود کوشش کے کچھ بھی سن نہ پایا تھا۔ فاریہ اور زاریہ بھی بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"سوہنی.......... سوہنی آنکھیں کھول' میں تیرا مجرم ہوں سوہنی' تجھے کوئی بھی سکھ نہیں دے سکا۔ آنکھیں کھول.......... سوہنی.......... سوہنی آنکھیں کھول۔" پیار کتنی بڑی طاقت ہے اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا تھا۔ "سوہنی.......... تو.......... تُو ٹھیک ہے نا؟ تو ٹھیک ہو جائے گی سوہنی"۔

وہ دھیرے سے مسکرائی۔ "بالے.......... تُو خوش رہنا بالے.......... اور.......... اور ماں کو لے آنا"۔

"ہاں سوہنی تُو جلدی سے ٹھیک ہو جا پھر ہم دونوں ماں کو لینے چلیں گے"۔

"ہاں.......... آں.......... بالے.......... میرا منہ خشک ہو رہا ہے۔ کانٹے.......... کانٹے سے پڑ گئے ہیں۔"

"پیاس لگی ہے سوہنی؟"

"آں.......... ہاں.......... بہت پیاسی ہوں بالے"۔

وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔ وہ تو جنم جنم کی پیاسی تھی۔ پیار کی بدلی اس پر برسی ہی کب تھی! میں بھاگ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں چاہتا تو کسی سے پانی منگوا سکتا تھا مگر میں یہ کام خود کرنا چاہتا تھا۔ اب تک سوہنی نے مجھ سے کچھ مانگا ہی کب تھا۔ میں پانی کا گلاس لیے کمرے میں داخل ہوا تو کمرے میں غضب کا شور تھا۔ فاریہ' زاریہ' ماسی' حمیدہ سبھی سسکیاں لے لے کر رو رہے تھے۔

"خاموش ہو جاؤ تم لوگ.......... دیکھتے نہیں کہ وہ بیمار ہے"۔ یہ کہہ کر میں سوہنی کی طرف بڑھا۔ کمرے میں اچانک سناٹا چھا گیا تھا۔ "سوہنی.......... لے سوہنی پانی پی لے.........."

مگر سوہنی نے جواب نہیں دیا۔ وہ یوں ہی آنکھیں موندے لیٹی رہی۔ اچانک مجھے کمرے میں گہرے سناٹے کا احساس ہوا۔ میرے حلق میں اچانک کانٹے سے اُگ آئے۔ میں نے گھبرا کر سب کی طرف دیکھا۔ ان سب کی آنکھوں میں گہری ویرانی تھی اور نامعلوم سا احساس تھا۔ جس نے میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑا دی۔ میں سوہنی پر جھک گیا۔

"سوہنی.......... سوہنی.........." میں نے اس کے رخساروں کو تھپتھپایا۔

"اقبال.........." اچانک فاریہ نے میرے کاندھوں پہ ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے نگاہ اٹھا کر فاریہ کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تاسف تھا۔ میں سُن رہ گیا۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتی تھی میں سمجھ گیا تھا۔ "سوہنی.........." میرے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر پھیلا اطمینان وہیں منجمد ہو گیا تھا۔ وہ ساکت تھی' تمام دکھوں اور پریشانیوں سے آزاد۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیا کروں۔ اسی وقت ماسی میراں پچھاڑ کھا کر گری۔ فاریہ اور زاریہ اس کی طرف لپکیں اور میں بھاگتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔ باہر آ کر میں سیدھا لان میں چلا گیا جہاں اندھیرا تھا۔ میں جی بھر کر رونا چاہتا تھا۔ میں جانے کتنی دیر تک روتا رہا۔ آج تو میرا سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ میں نے خدا سے بس ایک سوہنی ہی کی تمنا کی تھی مگر وہ بھی مجھے نہ ملی۔ آج مجھے اپنی بدنصیبی کا لمحہ لمحہ یاد آ رہا تھا۔ وہ لمحہ جب میں نے چوہدری کی غلامی سے آزادی چاہی تو مجھے چوری کے الزام میں بند کر دیا گیا۔ میری ماں' باپ اور بہن پر عذاب نازل کیے گئے اور جب میں وہاں سے فرار ہو کر اپنی بہن کو بچانے گیا تو میرے باپ کو مجھ سے ہمیشہ کے لیے چھین لیا گیا اور ماں مجھ سے بچھڑ گئی پھر صغرا کو مار دیا گیا اور میں بالکل تنہا رہ گیا۔

شہر آ جانے کے بعد کون سے عذاب تھے جو مجھ پر نہیں آئے' احساسات کی وہ کون سی تپش تھی جو شعلے بن کر مجھے نہ جھلساتی رہی۔ مجھ سے میرا اپنا پن چھین لیا گیا' میری معصومیت میری سادگی سب کچھ مجھ سے چھن گیا' اور اب میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی مجھے نصیب نہ ہوئی۔ میں تو سوہنی کو بتا بھی نہ پایا تھا کہ اس کے پیار نے مجھے کتنا بے خود کر دیا تھا میں اسے کس قدر چاہتا تھا' اسے دنیا کی ہر خوشی دینے کی خواہش کو کتنا سنبھال کر چھپا کر رکھا تھا میں نے' کچھ بھی تو نہیں کہہ پایا تھا۔ کاش مجھے چند لمحات ہی مل جاتے کہ میں اس کی آنکھوں میں جھانک سکتا' اسے اپنا دل چیر کر دکھا سکتا' کاش.......... میں یاد کرتا رہا اور روتا رہا۔ اچانک مجھے آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے آستین سے آنکھیں پونچھ لیں۔ وہ فاریہ تھی جو میرے بالکل سامنے کھڑی تھی۔ وہ بہت گہری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"اقبال.......... رو لو.......... جی بھر کے رو لو رونے سے دل کا بوجھ کم ہو جاتا ہے۔ تم مرد ہو تو کیا ہوا.......... فولاد تو نہیں ہو.......... پتھر تو نہیں ہو نا' دکھ تو مردوں کو بھی اتنا ہی ہوتا

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

ہے جتنا عورتوں کو ہوتا ہے پر.......... عورتیں دھاڑیں مار مار کر رو لیتی ہیں' تم بھی رو و اقبال' یہ حق تو تمہیں بھی ہے نا؟" وہ روتی جا رہی تھی اور بولتی جا رہی تھی۔ میں واقعی برداشت نہ کرپایا اور رو دیا ہم دونوں جانے کتنی دیر یونہی بیٹھے روتے رہے۔

وہ سچ کہتی تھی' رونے سے دل کا بوجھ کم ہو گیا تھا اور پھر چوتھے دن کوٹھی سے ایک اور جنازہ نکلا' میری محبت کا' میرے ارمانوں کا جنازہ' میری تمناؤں کا جنازہ اور پھر یوں ہوا جیسے میرے تمام احساسات بھی سوہنی کے ساتھ دفن ہو گئے۔ میں نے خود کو پتھر کا سا محسوس کیا' بے حس اور سرد مہر' بس میری آنکھیں تھیں جو سب کچھ دیکھ رہی تھیں یا میرے کان تھے جو سب کچھ سن رہے تھے مگر محسوس کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا میں بالکل کسی روبوٹ کی طرح ضروریات نمٹا رہا تھا۔ اب نہ فاریہ کی تاسف بھری نگاہیں دیکھ کر کچھ احساس ہوتا تھا اور نہ ماسی کی آنکھوں سے بہتے آنسو ہی وجود میں نمی پیدا کرتے تھے۔ زاریہ بے چاری تو اب تک بیگ صاحب کی موت پر آنسو بہا رہی تھی کہ اب سوہنی کی بے وقت موت نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اتنے تھوڑے سے دن میں ہی اسے سوہنی سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ تمام وقت اسی کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ وہ یہ تو نہیں جانتی تھی کہ سوہنی میرے لیے کیا تھی مگر پھر بھی وہ میرے سینے سے لگ کر گھنٹوں روتی رہی تھی۔

میرے پاس تو دلاسا دینے کو بھی الفاظ نہ تھے میرے پاس تو کچھ بھی نہ تھا۔ سبھی کچھ تو سوہنی اپنے ساتھ لے گئی تھی.......... میں پتھر بنا اسے روتا بلکتا دیکھتا رہا اور بس.......... سوہنی کیا گئی کائنات کی تمام رعنائیاں' تمام رنگ اور زندگی دینے والا ہر احساس ختم ہو گیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں نے سوہنی کو کھو دینے کے بعد کس طرح دن گزارے مگر دن گزرتے چلے گئے۔ فاریہ اور زاریہ تو خود پر قابو پا گئیں مگر ماسی میراں کی سانسوں میں تو صرف سسکیاں بھر کر رہ گئی تھیں۔ اس کی نگاہیں خلاؤں میں بھٹکا کرتیں اور وہ پوری کوٹھی میں بھٹکی ہوئی روح کی طرح تیرتی پھرتی پھر جب کبھی کبھی اسے ہوش آتا اور مجھ پر نگاہ پڑتی تو چونک اٹھتی۔ اسے جیسے ایک دم احساس ہو جاتا کہ میں سوہنی کا پیار اور اس کی تمنا تھا۔ وہ میری بلائیں لیتی اور کہتی.......... "بالے' وہ تجھے بہت پیار کرتی تھی بالے.......... کاش تُو اسے اپنا لیتا۔"

تب میرا کلیجہ کٹ جاتا۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ ماسی یہی تو وہ آرزو تھی جس نے مجھے زندہ رہنے کا حوصلہ بخشا ہوا تھا۔ اب تو میری سانس صرف ایک کانٹے میں اُلجھی ڈور تھی کہ

جانے کب اور کس لمحے یہ کانٹا بھی ٹوٹ جاتا۔ میرا جی تو چاہتا تھا کہ اسے سب کچھ بتا دوں کہ میں کیا محسوس کر رہا ہوں مگر صرف یہ سوچ کر چپ ہو جاتا تھا کہ اسے اب یہ سب بتا کر کیا کروں گا۔

کافی دن گزر گئے۔ شاید دس دن یا شاید اس سے بھی زیادہ' فاریہ دھیرے دھیرے مجھے میری سوچوں کے حصار سے باہر لے آئی مگر مجھ میں زندگی کی ترنگ پیدا نہ کر سکی' ہاں اس کی ان کوششوں سے اتنا ہو گیا کہ مجھے وہ تمام کچھ جو سوہنی کی موت کے بعد سے دھندلا نظر آ رہا تھا' اب واضح اور صاف دکھائی دینے لگا گو میری اب کوئی منزل نہ تھی مگر اب میرے سامنے ایک راستہ ضرور تھا۔ وہ راستہ جو میرے ماضی کو جاتا تھا۔ ہاں وہ راستہ جس کے اختتام پر میری پاگل ماں اب بھی میرا اور صغرا کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ راستہ جو میرے وجود میں دہکتی آگ کی تپش سے مجھے جھلسائے دیتا تھا۔

شہر کے ان عذابوں سے جان چھوٹی تو میرے وجود میں لگائے گئے وہ زخم ہرے ہو گئے جن کی پاداش میں مَیں اپنا سب کچھ گنوا چکا تھا اپنا معصوم اور خوب صورت ماضی' اپنا پیار' اپنا باپ پھر اپنی ماں اور بہن' مجھے ان زخموں کا قرض چکانا تھا۔ اپنے ہر جدا ہونے والے رشتے کا حساب لینا تھا اور جب یہ احساس شدت اختیار کر گیا تو میں نے خود پر قابو پا لیا۔ مجھے ابھی زندہ رہنا تھا۔

پھر ایک روز میں نے فاریہ کو بتا دیا کہ میں گاؤں جا رہا ہوں وہ یہ سن کر چپ رہ گئی۔ ایک گہرا سناٹا چھا گیا اس پہ۔

"اقبال میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہارے ساتھ چلوں گی"۔

"مگر میں اکیلا جانا چاہتا ہوں"۔

"نہیں اقبال.......... تمہارے وجود میں دہکتی آگ کی تپش مجھے محسوس ہو رہی ہے .... تم.......... تم پتا نہیں کیا کرو گے' دیکھو اقبال اب تمہارے پاس جو کچھ بچا ہے اسے اپنے انتقام کی آگ میں نہ جلا ڈالنا۔ تم چوہدری سے نہیں بھڑنا بس ماں کو لے کر چلے آنا۔ اگر تم یہ وعدہ کرو گے تو.......... میں تمہیں اکیلا جانے دوں گی ورنہ.......... میں تمہارے ساتھ چلوں گی"۔

"سوری میڈم' میں اپنے معاملات کو اپنے طور پر طے کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے بھی میڈم

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

میرے خیال میں اب میری یہاں ضرورت نہیں ہے' آپ مجھے آزاد کر دیجئے"۔

"اقبال.........." وہ تڑپ اٹھی۔ "کیسی باتیں کر رہے ہو تم.......... میں نے تمہیں پابند تو نہیں کیا ہے"۔

"آپ نے نہیں میرے حالات نے اس حصار میں قید کر دیا تھا میڈم مگر اب میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں' میرا خیال ہے کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب میں اپنے آپ میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ پلیز.......... آپ کہہ دیجئے کہ اب سے میرا آپ کا کوئی ناتا نہیں' مجھ پر اب کوئی قرض نہیں' میں آزاد ہوں.......... بالکل آزاد' آپ کے اس طرح کہہ دینے سے میری روح کی بے چینی ختم ہو جائے گی۔ میں اپنے مشن پر سکون سے جا سکوں گا"۔

"اقبال اگر تم یہاں خود کو قیدی سمجھتے ہو تو.......... ٹھیک ہے۔ تم آزاد ہو' تم اپنا میرا کوئی ناتا نہیں رکھنا چاہتے تو تم مالک ہو مرضی کے' مجھے تمہیں مجبور کرنے کا کوئی حق بھی نہیں.......... مگر اقبال.......... میں تمہاری زندگی چاہتی ہوں......"

"میں اس بارے میں نہیں سوچتا' میرے سامنے صرف اور صرف چوہدری اور اس کے بیٹے راجو کی موت ناچ رہی ہے' میں ان دونوں سے اپنے گھر کے بکھیر دیے جانے کا بدلہ لینا چاہتا ہوں اور اگر اس میں مجھے اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے تو میں سمجھوں گا کہ میں جیت گیا' میں مر جاؤں گا مگر انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ قسم میں نے اپنی بہن کی لاش پر کھائی تھی میڈم.......... جسے پورا کرنا ہی میری زندگی ہے اور بس' مجھے اجازت دیجئے اور میری غلطیوں کو معاف کر دیجئے گا"۔

"اقبال.........." اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"نہیں میڈم.......... بس اب کچھ اور نہ کہئے گا"۔

"او کے اقبال.......... وِش یو گڈ لک"۔ اس نے بھرائی آواز میں کہا اور میں اس کے پاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اگلے روز جب میں نے سلطان کو بتایا کہ میں گاؤں جا رہا ہوں تو وہ چونک اٹھا۔ اس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ "تُو اکیلا جائے گا؟"

"ہاں سلطان' میں اکیلا جاؤں گا"۔

"نہیں بالے' میں تمہیں اکیلا نہیں جانے دوں گا۔ میں.......... میں چلوں گا تیرے

ساتھ"۔

"نہیں دوست' تُو نے اب تک جو کچھ میرے لیے کیا وہ بہت ہے' میں اپنے انتقام کی آگ میں تجھے نہیں جلنے دوں گا"۔

"مجھ سے مار کھانے والی باتیں نہ کر بالے.......... بس میں نے جو کہہ دیا کہ میں ساتھ جاؤں گا اور سن ہم یہاں سے راجہ کے ڈیرے پر چلیں گے۔ راجہ نے بھی تو وعدہ کیا تھا نا؟"

"ہاں تجھے پتا ہے کہ راجہ کہاں ہے؟"

"ہاں' اب سردیاں بڑھ گئی ہیں نا' راجہ نے سب کچھ چھوڑ دیا ہو گا وہ اب ساری سردیاں اپنے ڈیرے پر گزارے گا۔ ہم پہلے وہاں چلیں گے"۔

"پھر تو وہاں خان بھی ہو گا!" میں نے کہا۔

"ہاں.......... وہاں خان بھی ہو گا"۔

تب میں خوش ہو گیا کہ ابھی نور یعنی شانی کا وہ پیغام میرے سینے پر بوجھ بنا ہوا تھا جو اس نے اپنے بھائی خان کو پہنچانے کے لیے مجھے دیا تھا۔ شانی کا معصوم مگر غمگین چہرہ اور شادو کی آنکھوں میں بھری ویرانی میری آنکھوں کے سامنے ناچ گئی۔ اس طرح میں خان کو بتا سکتا تھا کہ اس کی شانی اور شادو اس کا انتظار کر رہی ہیں۔

"ٹھیک ہے سلطان' تُو چل میرے ساتھ"۔

"کب چلنا ہے؟"

"آج.......... ابھی.......... اسی وقت چل"۔

"جھلا ہوا ہے کیا' ماسی میراں کا کیا ہو گا"۔

"وہ یہیں رہے گی۔" اچانک فاریہ کی آواز آئی۔ میں اور سلطان دونوں ہی چونک گئے۔ "ہاں سلطان' اقبال نے ہم سے ناتا ختم کیا ہے مگر ماسی نے نہیں' ماسی کو میں کہیں بھی نہیں جانے دوں گی"۔

میں نے سر جھکا لیا۔ سلطان بھی خاموش رہا۔ فاریہ کچھ دیر کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہوں میں عجیب سی بات تھی جس نے میرے سارے بدن میں سنسنی پھیلا دی اور میں نے گھبرا کر نگاہیں جھکا لیں۔ وہ جس خاموشی سے آئی تھی اسی خاموشی سے پلٹ گئی۔

اگلے روز ہم نے ضروری سامان ساتھ لیا اور سب کو خدا حافظ کہہ کر نکل آئے۔ فاریہ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

بس چپ چاپ ہمیں دیکھتی رہی' منہ سے کچھ بھی نہ بولی مگر اس کی آنکھیں کچھ کہہ رہی تھیں۔ میں اس سے نگاہیں نہ ملا سکا اور کوٹھی سے باہر چلا آیا۔ سلطان نے مجھے بتایا تھا کہ ہمیں زیادہ تر پیدل سفر کرنا ہے مگر یہ سفر ساہیوال کے بعد ایک چھوٹے سے گاؤں سے شروع ہو گا۔ ہم بس اڈے پر پہنچ گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد بس میں سفر کر رہے تھے۔ گو میرا دل بہت گھبرا رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے میں اپنے سارے خواب' ساری آرزوئیں اور ساری خوشیاں پیچھے کہیں چھوڑے جا رہا ہوں مگر میں خود پر قابو کیے رہا۔ میں جانتا تھا کہ جس سفر پر میں روانہ ہو رہا ہوں وہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ مجھے اپنے واپس آنے کی نہ توقع تھی اور نہ خواہش' خواہش تھی تو بس اتنی کہ اس حویلی کو پھونک ڈالوں' جس کے مکینوں نے میرے ہنستے بستے گھر کو اجاڑ دیا۔ وہ گھر جہاں جھمکوں میں لٹکے ننھے ننھے موتیوں کی چمک تھی یا پیروں میں بندھی ان پازیبوں کی چھنکار جس کی ہر آواز میرے پیار کی گواہی بن کر میرے آنگن سے ہوتی ہوئی دور دور تک پھیل جاتی تھی۔

وہ گھر جہاں مجھے ماں کا پیار' باپ کی شفقت اور بہن کی محبت نصیب تھی میں اپنے اس گھر کی تباہی کا بدلہ لینا چاہتا تھا' چاہے بدلے کی اس آگ میں خود بھی جل کر بھسم ہو جاؤں۔ میں سوچتا رہا اور بس آگے ہی آگے جانے والے لمبے رستے کو تیزی سے روندتی بڑھتی چلی گئی۔ ہم گھر سے نکلے تو سویرا تھا مگر اب سورج سروں پر پہنچ چکا تھا اور دھوپ کی گرم نرماہٹ بدل کر بھلی لگ رہی تھی۔ راستے میں ایک چھوٹے سے ہوٹل کے پاس بس والے نے بس روک دی۔ میں اور سلطان بھی نیچے اتر آئے ہم نے منہ ہاتھ دھویا سلطان نے ٹفن میں سے کھانا نکالا جو فاریہ نے جانے کب اسے دے دیا تھا۔ ہم نے ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر کھانا کھایا' ہوٹل سے چائے منگوا کر پی اور دوبارہ بس میں آ بیٹھے۔

سفر پھر شروع ہو گیا مجھے اونگھ آ گئی تھی۔ سلطان نے مجھے اٹھایا۔ "بس تیار ہو جا۔ آگے اترنا ہے"۔ اس نے اپنا تھیلا کندھے پر لٹکاتے ہوئے کہا۔

میں بھی اترنے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا یہ ایک سرسبز علاقہ تھا۔ سڑک کے دونوں جانب اونچے اونچے درخت تھے۔ دور دور تک آبادی نہ تھی۔ مجھے حیرانگی ہوئی کہ سلطان کہاں اترنے کو کہہ رہا ہے مگر میں منہ سے کچھ نہ بولا۔

تقریباً بیس منٹ کے سفر کے بعد ہم ایک ایسی سڑک پر پہنچ گئے جس کے دائیں جانب

دور تک سرسوں کے کھیت تھے۔ سلطان نے بس وہیں رکوالی اور ہم دونوں اتر گئے۔ "یہاں تو کہیں آبادی نہیں ہے؟" میں نے سلطان سے پوچھا۔

"ہمیں آبادی میں نہیں جانا یار.......... ہم راجہ کے ڈیرے پر جا رہے ہیں۔ وہ آبادی میں نہیں ویرانی میں رہتا ہے"۔ سلطان نے بیزار لہجے میں جواب دیا۔ "تو چپ چاپ چلتا رہ۔"

پھر میں کچھ نہ بولا وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ جب مجھے کچھ معلوم نہ تھا تو بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ سلطان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اب ہم سرسوں کے ایک کھیت کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ چلتے چلتے گھنٹا بھر ہو گیا مگر کھیت شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ میری پنڈلیوں میں اینٹھن سی ہونے لگی۔ اب مجھے اتنا پیدل چلنے کی عادت ہی کب رہی تھی۔ شہری زندگی نے جہاں مجھے بہت کچھ دیا تھا وہاں مجھ سے بہت کچھ چھین بھی لیا تھا۔ ورنہ میں تو میلوں بغیر تھکے چل لیتا تھا۔ مجھے ابا کا جملہ یاد آ گیا کہ بیٹا جتنا اپنے پیروں پر چلے گا اتنا ہی زیادہ جئے گا اور یہ پیر ہمیشہ طاقتور رہیں گے۔ ورنہ بڑھاپے میں دوسروں کا محتاج ہونا پڑے گا اور محتاج کی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ ابا کے اس جملے نے مجھ میں ہمت پیدا کی اور میں نے اپنی رفتار تیز کر دی کچھ ہی دیر بعد جب کھیت ختم ہوا تو میں اپنے سامنے بکھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھروندے دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اب ہم ایک ایسی پگڈنڈی پر جا رہے تھے جو سیدھی گاؤں کی طرف جا رہی تھی۔ سورج آہستہ آہستہ مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ ہم بستی کے ان گھروندوں کے درمیان پہنچ گئے اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ باباجی کا گاؤں تھا۔ وہی گاؤں جہاں سے ہم پہلے بھی گزرے تھے اور جہاں میں نے ریشماں کی آنکھوں میں راجہ کے لیے بہت سے دیپ جلے دیکھے تھے۔ مگر راجہ نے اسے نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ مجھے حیرت صرف یہ تھی کہ جب ہم پہلے یہاں آئے تھے تو وہ تمام راستہ تو بڑا پتھریلا تھا میں نے سلطان سے پوچھا تو وہ ہنس دیا۔

"شہر چھوڑتے ہی تیری عقل نے بھی ساتھ چھوڑ دیا ہے کیا؟"

"نہیں یہ بات نہیں.........." میں جھینپ گیا۔

"بے وقوف' وہ پرلی طرف کا راستہ تھا۔"

میں نے اس وقت واقعی خود کو بے وقوف محسوس کیا۔ چند لمحوں بعد سلطان ایک

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

دروازے پر رک گیا۔ اس نے دستک دی۔ دروازہ کھولنے والی ریشماں ہی تھی۔ اس نے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا پھر مسکرائی۔ ”تُو بھی راجہ کا سجن ہے نا؟“

”جی!“ میں نے سر ہلایا۔

”اندر آ جاؤ‘ سلطان تُو کیسا ہے‘ کہاں تھا اتنے روز؟“ اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

”اری کون ہے............ کبھی پلٹ کر نہیں بتاتی کہ کون ہے............ بس بولنا شروع کر دیتی ہے“۔ اندر سے بھرائی ہوئی آواز آئی۔

”راجہ کے ساتھی ہیں بابا............“ وہ پلٹ کر زور سے بولی۔

”اوہ............ کون؟“

اتنی دیر میں ہم اندر داخل ہو چکے تھے۔ سامنے چھپر تلے‘ رضائی میں لپٹا بوڑھا بابا آنکھیں چندھیا کر ہمیں دیکھ رہا تھا۔

”میں ہو بابا جی‘ سلطان!“

سلطان اور میں اس کے قریب پڑی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ اس نے سلطان کو پہچان لیا۔ البتہ میرے بارے میں سلطان نے اسے یاد دلایا کہ میں پچھلی بار ان لوگوں کے ساتھ آیا تھا۔ ہمیں بیٹھے ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اچانک آندھی آ گئی اور ہواؤں کے جھکڑوں کے ساتھ ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ریشماں بھاگ کر چھپر تلے آ گئی مگر لمحہ بھر میں ہی بارش سب کچھ بھگو گئی۔

ہم نے جلدی سے بابا جی کی چارپائی دونوں طرف سے پکڑی اور اندر کوٹھری میں لے آئے۔ ریشماں اتنی دیر میں دوسری چارپائی بھی اندر اٹھا لائی۔ ٹھنڈی ہوا نے میرے بدن میں کپکپی دوڑا دی تھی۔ اب اندھیرا ہو گیا تھا۔ ریشماں نے تیل کے اسٹوو پر چائے کی دیگچی چڑھا دی اور خود وہیں بیٹھ گئی۔

”بیٹا ایسے موسم میں تم لوگوں کو وہاں پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔ ویسے بھی راجہ نے کہا تھا کہ ابھی اس طرف کوئی نہ آئے۔ اس نے ریشماں کو بھی منع کر دیا ورنہ وہ تو روز کھانا لے کر جاتی تھی۔

”مگر کیوں بابا............ خیریت تو ہے نا؟“ سلطان نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔

”آں............ ہاں............ کچھ بتایا تو نہیں تھا پر............ ٹھہر میں ریشماں سے پوچھتا ہوں“۔ یہ کہہ کر بابا نے ریشماں کو آواز دی۔

”جی بابا!“

”راجہ نے تجھے کیا کہا تھا ریشم؟“

”اس نے کہا تھا کہ مجھے کھانے کی ضرورت نہیں ہے اب ادھر نہ آنا اور سن کسی کو بھی نہ آنے دینا کوئی پوچھے تو کچھ نہ بتانا............ اور بس............“ ریشماں نے راجہ کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

”کوئی پوچھے تو کچھ نہ بتانا............!“ سلطان زیرِ لب بڑبڑایا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ............“

اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ اچانک دروازہ دھڑ دھڑا اٹھا۔ آواز اتنی زور کی تھی کہ ہم سب ہی اچھل پڑے۔

”کک............ کون؟“ ریشماں نے سہمے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”ٹھہر ریشم‘ میں دیکھتا ہوں“۔ سلطان نے جلدی سے کہا اور ریشم سہم کر رک گئی۔

سلطان دروازے کی طرف بڑھا............ میری نگاہیں اس کے تعاقب میں تھیں۔ چھپر تلے سے نکلتے ہی وہ بارش کے پانی میں شرابور ہو گیا تھا۔ اس نے پوچھا............ ”کون ہے؟“

”دروازہ کھولو“ باہر سے گرج دار آواز آئی۔ اور سلطان نے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی ریشماں کی چیخ گونج اٹھی۔

میں اور سلطان دونوں دروازے کی طرف لپکے۔ پولیس کی وردی میں ملبوس وہ لمبا چوڑا جوان مجھے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی نظر آ گیا۔ اس لمحے آسمان پر چمکنے والی بجلی میں مجھے دروازے کے قریب کھڑی پولیس جیپ بھی دکھائی دے گئی اور تبھی مجھے وہ طوفانی رات بھی یاد آ گئی جس کی سیاہی میں آج تک اپنے پہلو میں لپیٹے پھر رہا تھا۔ وہ رات جس رات پولیس میرے دروازے پر آئی تھی۔ ایسی ہی طوفانی رات تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے میں بھولا بھالا بالا تھا جو قانون کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں جانتا تھا‘ مجبور تھا‘ مجھ پر چوری کا الزام تھا اور چوہدری میرا ایسا دشمن تھا جس کی طاقت سے ٹکر لینا میرے بس میں نہ تھا مگر آج میں اقبال تھا‘ میرے وجود کا بھولا پن مجھ میں بھڑکتے شعلوں نے جلا کر خاکستر کر دیا تھا اور آج میں قانون۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

کی تمام حدود سے واقف تھا۔

"ریشماں تیرا ہی نام ہے؟" انسپکٹر کی گرجدار آواز سنائی دی۔

اس سے پہلے کہ ریشماں کوئی جواب دیتی' میں دروازے تک پہنچ گیا۔ میں نے لرزتی کانپتی ریشماں کو پیچھے کردیا اور خود سینہ تان کر انسپکٹر کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ "جی فرمایئے انسپکٹر صاحب' کیسے زحمت کی؟" میں نے بڑے پُرسکون اور ٹھہرے ہوئے مگر مضبوط لہجے میں پوچھا۔

اسے شاید توقع نہیں تھی کہ یہاں اس سے اس قدر مضبوط لہجے میں گفتگو کرنے والا بھی مل سکتا ہے۔ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا اور میری بات کا جواب دینے کی بجائے ریشماں سے مخاطب ہوا۔ "یہ کون ہے؟"

"جی............ یہ............!" ریشماں روہانسی ہوگئی تھی۔

"میں اس کی خالہ کا بیٹا ہوں۔" میں نے فوراً تیز لہجے میں جواب دیا۔ "آپ کیا چاہتے ہیں اس سے؟"

"ہمیں اطلاع ملی ہے کہ راجہ یہاں آیا ہوا ہے۔" اس نے میرے کاندھے سے اوپر' اندر کی جانب جھانکتے ہوئے کہا۔

"اوہ نہ پُتر............ وہ یہاں نہیں آیا' کسی نے دشمنی میں تجھ سے کہہ دیا ہوگا۔" میرے بولنے سے پہلے ہی بوڑھا بول اٹھا۔ جو کسی وقت ہمارے قریب آکھڑا ہوا تھا۔

"دیکھو باباجی............ میں تو بڑا لحاظ کرتا ہوں تمہارا' مگر تم جانتے ہو خان زادہ کیسا آدمی ہے' اوپر تک پہنچ جاتا ہے اور پھر میری نیندیں حرام ہو جاتی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ میرے علاقے سے گزرے' اور اسے میرے ہاتھوں نقصان پہنچے۔"

"ہاں پُتر میں جانتا ہوں خان زادہ کو پر یہ سچ ہے کہ وہ یہاں نہیں آیا اگر آتا تو میں خود ہی اسے روانہ کردیتا' اس کا نقصان تو گاؤں کا کوئی فرد بھی نہیں چاہتا' وہ تو فرشتہ ہے پُتر............"

"ٹھیک ہے باباجی' ویسے ایک بات بتادوں' میری نظریں بہت تیز ہیں اور مجھ پر اوپر سے بڑا دباؤ ہے' وہ نظر آگیا تو میں مجبور ہو جاؤں گا۔" اس نے ذرا دھیمے لہجے میں کہا۔

میں ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے حیران تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ پولیس آئی ہے' کوئی ہنگامہ ہوگا پھر راجہ کا نام سن کر تو میرا دم ہی نکل گیا تھا کہ پولیس کو علم ہوگیا کہ

ریشماں اور اس کا باپ راجہ کے بارے میں جانتے ہیں اور اب وہ ان دونوں کو گرفتار کرلے گی یا کم از کم ان پر تشدد کرکے راجہ کا پتا معلوم کرنے کی کوشش کرے گی مگر یہاں تو عجیب پُراسرار سی گفتگو شروع ہوگئی تھی۔

"وہ یہاں نہیں آئے گا پُتر............ تُو بے فکر رہ!" باباجی نے بڑے رازدارانہ انداز میں جواب دیا۔

"اس کے حق میں یہی بہتر بھی ہے ورنہ............" انسپکٹر نے بھرپور نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے اونچی آواز میں کہا اور پلٹ کر جیپ میں جا بیٹھا چند لمحوں بعد جیپ اسٹارٹ ہوئی اور آگے بڑھ گئی۔

ہم سب جو بارش میں شرابور ہو چکے تھے دروازہ بند کرکے اندر چلے آئے۔

"مجھے یہی ڈر تھا............ یہی ڈر تھا مجھے............" باباجی زیرِ لب بولے۔

"کیا بات ہے بابا............ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔" میں نے بابا کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"پُتر خان زادہ ایک بلا کا نام ہے' آسیب ہے وہ جس نے اس گاؤں کی آزاد فضا کو دھیرے دھیرے نگلنا شروع کردیا ہے۔ اس ہندو سادھو کے بعد یہ گاؤں آزاد ہوگیا تھا عذابوں سے مگر یہ خان زادہ............ خدا اسے غارت کرے' نہ معلوم اس گاؤں کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھا بابا' اس سے پہلے جب ہم آئے تھے تو............"

"نہیں اُس وقت تو یہاں چین کا راج تھا پُتر' اس عذاب کو یہاں نازل ہوئے چند مہینے ہی گزرے ہیں۔ وہ نہ معلوم کہاں سے آگیا ہے مگر آتے ہی اس نے اپنی چوہدراہٹ دکھانا شروع کردی ہے۔ گاؤں کے سیدھے سادے لوگوں کو ورغلا کر ایک دوسرے کے خلاف نفرت بھر دی ہے ان کے دلوں میں۔ اسے راجہ کے بارے میں پتا چل گیا کہ وہ ڈاکو ہونے کے باوجود یہاں ہر دل عزیز ہے بس............ پورے گاؤں میں پہرے لگا دیئے اپنے آدمیوں کے' وہ نہیں چاہتا کہ وہ اس گاؤں میں آئے اور لوگوں کو پھر کسی مشکل میں پھنسا دیکھے' وہ جانتا ہے کہ راجہ کسی کی بدمعاشی برداشت کر ہی نہیں سکتا۔ بڑے اثر و رسوخ والا ہے' اوپر تک پہنچ ہے اس کی' اسے پتا چل گیا ہوگا کہ ریشماں اس کے ٹھکانے سے واقف ہے اسی لئے پولیس

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

بھیج دی یہاں مگر یہ جو سپاہی آیا تھا نا یہ بھی احسان مند ہے اس کا۔"

بات کچھ میری سمجھ میں آگئی تھی۔ "بابا جی! اگر ایسا ہے تو پھر خان زادہ کو بھی معلوم ہوگا کہ یہ سپاہی راجہ کا احسان مند ہے اور اگر اب تک نہیں معلوم ہوا تو جلد ہی معلوم ہو جائے گا' ایسی صورت میں تو خطرہ اور بڑھ سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ آپ لوگوں کو پریشان کرنے کے لئے کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرے۔"

"ہاں پُتر........... وہ کر سکتا ہے' سب کچھ کر سکتا ہے پر کیا کریں' خدا پر بھروسا کر کے بیٹھے ہیں وہی کچھ بہتری کی راہ نکالے گا۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "چھوڑ پُتر تو کچھ آرام کر لے پھر رات کو ریشماں تجھے راجہ تک پہنچا دے گی۔"

"بابا........... ریشماں واپس کیسے آئے گی؟"

"میری فکر نہ کر بابو........... مجھے کچھ نہیں ہوتا۔" ریشماں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور چارپائیوں پر کھیس بچھانے لگی۔

میرا ذہن الجھ گیا تھا۔ مجھے خطرے کی بُو محسوس ہو رہی تھی مگر بابا اور ریشماں دونوں ہی پُرسکون تھے۔ بارش تیز ہو چکی تھی۔ میں نے سلطان سے پوچھا کہ ہم راجہ تک کیسے پہنچیں گے؟"

"کچھ بھیگنا ہی تو پڑے گا' اس تک پہنچنے کے لئے ان حالات میں یہ بہترین وقت ہے۔ کسی کو گمان بھی نہ ہوگا کہ ریشماں ایسے موسم میں اس کے ٹھکانے تک جا سکتی ہے۔" سلطان نے جواب دیا۔

میرا جی چاہا کہ میں اسے بتاؤں خطرہ دھیرے دھیرے بڑھتا محسوس ہو رہا ہے مگر یہ بھی سچ تھا کہ یہ احساس ہونے کے باوجود میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتا تھا۔ میں یہاں کے حالات سے ناواقف تھا اور نہیں جانتا تھا کہ میں کس قسم کے خطرے کی بُو محسوس کر رہا ہوں۔ میں سلطان سے کچھ کہے بغیر لیٹ گیا۔ میں نے ذہن کو خالی کر دینا چاہا مگر اس میں ناکام رہا کوئی چیز تھی جو میرے دماغ میں رینگتی اور سرسراتی محسوس ہو رہی تھی۔

رات دھیرے دھیرے گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ریشماں نے کمروں کی دیواروں میں بنے طاقچوں میں دیئے جلا دیئے تھے اور خود شاید کھانا پکانے میں مصروف تھی کیونکہ مسلسل برتنوں کی آوازوں کے ساتھ ہی مٹی کے کچے توے کی سوندھی سوندھی خوشبو مجھے بھوک کا احساس

دلا رہی تھی۔ میرا خیال ٹھیک تھا۔ وہ کچھ ہی دیر بعد فرش پر بچھی دری پر کھانا رکھ رہی تھی۔

"آؤ باؤ روٹی کھالو۔"

میں اور سلطان دونوں اٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد ہم کھانے سے فارغ ہو گئے تو ریشماں نے کپڑے میں لپٹی روٹیاں اور ٹفن ٹائپ کے ایک ڈبے میں سالن ڈال کر ان دونوں کو ایک ٹوکری میں رکھا اور اپنی چادر اوڑھ کر کھڑی ہو گئی۔ "چلو' ان لوگوں کو بھی بھوک لگی ہو گی۔"

میں نے حیرت سے ریشماں کی طرف دیکھا۔ وہ کتنی بہادر لڑکی تھی۔ اتنی رات گئے وہ روزانہ اکیلی جاتی تھی اور آج تو موسم بھی خطرناک تھا۔ جاتے ہوئے تو ہم لوگ ساتھ ہوتے مگر آنا تو اسے تنہا ہی تھا پھر بھی وہ کتنی ہشاش بشاش تھی۔ اس کے چہرے پر کہیں خوف کا نام بھی نہ تھا۔

"بابا دروازہ بند کر لو۔ میں آؤں گی تو پہلے پچھلی دیوار بجاؤں گی پھر دروازہ' ایسا نہ ہو تو در مت کھولنا ورنہ وہ لوگ جان جائیں گے کہ میں گھر میں نہیں ہوں۔ سوتے بنے رہنا۔ ٹھیک ہے نا...........؟" اس نے بابا کو ایسے سمجھایا جیسے وہ کوئی ننھا بچا ہو۔

"ٹھیک ہے ریشم مگر........... تو جلدی آجانا' پُتر دیر ہو جاتی ہے تو میرا دل گھبرانے لگتا ہے اور آج تو جانے کیوں گھبراہٹ ہو رہی ہے۔"

"میں جلدی آجاؤں گی۔"

"بابا........... آپ فکر نہ کریں۔ میں ریشماں کے ساتھ ہی واپس آجاؤں گا۔ ایسے حالات میں اور اتنی رات گئے تنہا نہیں آنا چاہئے۔"

"ہاں........... ہاں پُتر! یہ ٹھیک ہے' اس طرح مجھے اطمینان رہے گا اور تو کوئی بات نہیں' ریشماں پہلے بھی اکیلی گئی آئی ہے مگر وہ خان زادہ آج یہیں ہے........... گاؤں میں' اور وہ اچھا آدمی نہیں ہے پُتر۔"

"آپ فکر نہ کریں میں واپس آؤں گا۔"

بابا نے دروازہ بند کر لیا۔ ہم چند لمحے دروازے پر کھڑے رہے۔ ریشماں چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھی۔ پھر اس نے ہمیں پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اپنے مکان کی آڑ میں پچھلی طرف بڑھنے لگی۔ بارش کی تیزی میں کمی آگئی تھی مگر پھوار اب بھی پڑ رہی تھی۔ باہر اندھیرا زیادہ گہرا نہیں تھا۔ ہم بہ آسانی چلتے ہوئے کافی دور نکل آئے۔ ریشماں نے ایسا راستہ اختیار کیا

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

تھا جو بل کھاتا ہوا سرسوں کے کھیتوں کی طرف جاتا تھا۔ ہم کچھ دیر تو کچے گھروندوں کے درمیان سے گزرتے رہے پھر جلد ہی ہم کھلے حصے میں نکل آئے جہاں جگہ جگہ جھاڑیاں تھیں جن سے بچتے بچاتے ہم کھیتوں میں داخل ہو گئے۔ یہ کھیتوں کے درمیان سے گزرنے والا پتلا سا راستہ تھا۔ اب ہمارے دیکھ لئے جانے کا خطرہ ٹل چکا تھا۔ ہم نے رفتار تیز کر دی۔ میرا خیال تھا کہ ہمیں کھیتوں کی دوسری طرف جانا ہے جہاں سے گزر کر میں اور سلطان اس گاؤں پہنچے تھے مگر تقریباً کھیتوں کے درمیان میں پہنچتے ہی ریشماں نے راستہ تبدیل کر لیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد ہم کھیتوں سے باہر نکل آئے اور وہاں سے ڈھلوان شروع ہو گئی۔ ڈھلوانی علاقہ بارش کی وجہ سے بہت خطرناک ہو گیا تھا۔ مجھے اور سلطان کو سنبھل سنبھل کر چلنا پڑ رہا تھا مگر ریشماں یوں چل رہی تھی جیسے کسی پگڈنڈی پر چل رہی ہو ڈھلوان کے بعد ہی جنگل شروع ہو گیا۔ ہم جنگل میں داخل ہو گئے جنگل میں داخل ہوتے ہی ریشماں نے ہم دونوں کو روک دیا۔

"تم دونوں یہاں رکو۔"

"مگر.........!" میں نے کہنا چاہا۔

"وہ اندھیرے میں تم دونوں کو میرے ساتھ دیکھ کر سوچ سکتے ہیں کہ تم دونوں مجھے زبردستی یہاں تک لائے ہو اور ان لوگوں کے دشمن ہو۔ تم یہاں رکو میں جا کر انہیں بتا دوں گی کہ تم دونوں راجہ سے ملنے آئے ہو۔"

"ریشم صحیح کہتی ہے بالے۔" سلطان کا جواب سن کر میں خاموش ہو گیا۔

ریشماں ہمیں وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ میں اور سلطان درخت کے نیچے تنے سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ پھوار اب تیز ہو گئی تھی' کبھی کبھی چمکنے والی بجلی لمحہ بھر کو اجالا سا پھیلا کر غائب ہو جاتی تھی۔ اس لمحے بھر کے اجالے میں سارا ماحول عجیب ہیبت ناک سا محسوس ہوتا تھا۔

"یہ لڑکی ہے یا چھلاوہ؟" میں نے سلطان سے کہا۔

وہ ہنس دیا۔ "کافی جی دار ہے۔ ویسے راجہ سے تعلق رکھنے والی لڑکی کو جی دار ہی ہونا چاہئے۔"

"کیا مطلب! کیا وہ اور راجہ........."

"نہیں راجہ نہیں مگر وہ تو راجہ پر جان دیتی ہے نا' خوب جانتی ہے کہ اسے ڈرپوک لوگ پسند نہیں ہیں۔ ویسے محبت بڑی جرأت پیدا کر دیتی ہے بالے......... یہاں اتنی دور' رات کو اکیلا آنا اور پھر واپس بھی جانا اور وہ بھی ایک لڑکی کے لئے بڑا خوفناک کام ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا ہمیں آہٹ محسوس ہوئی۔ کوئی ہماری طرف آ رہا تھا۔ میں اور سلطان چوکنے ہو گئے۔ میں نے درخت کی آڑ لے لی اور سلطان زمین پر بیٹھ گیا۔

وہ جو بھی تھا اب قریب آ چکا تھا۔ میں ساکت کھڑا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ راجہ کے ساتھیوں میں سے ایک ہو گا کیونکہ وہ اسی طرف سے آیا تھا جس طرف ریشماں گئی تھی۔

"سلطان.........!" ایک سرگوشی ابھری۔

سلطان کھڑا ہو گیا۔ میں بھی درخت کی آڑ سے نکل آیا۔

"کون.........؟" سلطان نے پوچھا۔

"دادو۔" جواب ملا۔

میرے لئے یہ نام اجنبی تھا۔ سلطان آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گیا۔ وہ ہمیں لئے ہوئے آگے بڑھا۔ تقریباً دس منٹ چلتے رہنے کے بعد ہم گھاس پھوس سے بنے ہوئے ایک جھونپڑے میں داخل ہو گئے۔ باہر سے اس جھونپڑے پر اتنی جھاڑیاں اور کانٹے ڈالے گئے تھے کہ کوئی دیکھنے والا یہ محسوس ہی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ کوئی پناہ گاہ بھی ہو سکتی ہے۔

اندر داخل ہوتے ہی میری نگاہ گھاس پھونس کے اس بستر پر پڑی جس پر راجہ لیٹا ہوا تھا اور اس کے قریب ہی ریشماں پریشان کھڑی تھی۔

"سردار........." سلطان راجہ کو دیکھتے ہی آگے بڑھا اور اس کے ہاتھ آنکھوں پر لگا کر چوم لئے۔ راجہ نے بڑی محبت سے اسے تھپ تھپایا۔ پھر میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"کیسا ہے تو......... کیا نام ہے تیرا......... بالا' بالا ہے نا؟"

"جی سردار' آپ کی مہربانی ہے سردار ورنہ میں جیتا نہ ہوتا' یہ زندگی آپ کی دین ہے۔" میں نے بھی اس کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے جواب دیا۔

"نئیں اوئے......... یہ کفر کی باتیں ہیں......... تو تو بالکل شہریوں والے انداز میں باتیں کر رہا ہے۔"

"سردار آپ کو بخار ہے!" میں نے اس کے گرم ہاتھوں اور جلتی ہوئی آنکھوں سے

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

محسوس کر کے کہا۔

"بس ایسے ہی، موسم کی وجہ سے ہو گیا۔ بارش تھم گئی کیا؟"

"نہیں تھمی تو نہیں البتہ ہلکی ضرور ہو گئی ہے۔" میرے بولنے سے پہلے دادو نے جواب دیا۔

"بیٹھو تم لوگ۔" اس نے ہمیں اشارہ کیا پھر دادو سے مخاطب ہوا۔ "دادو تو اس رضیہ سلطانہ کو گھر چھوڑ آ۔" اس کا اشارہ ریشماں کی طرف تھا۔

رضیہ سلطانہ کے نام پر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ ریشماں نے مجھے گھور کر دیکھا۔

"یہ نہ کہا کر مجھے!" اس نے غصے میں کہا۔

"تجھے کیوں برا لگتا ہے؟" راجہ شرارت کے موڈ میں تھا۔ مجھے اس وقت وہ بہت اچھا اور بہت مختلف سا لگا۔ وہ ہر وقت غصے میں رہنے والا اور مسلسل آنچ دینے والا راجہ جیسے وقت کی دھند میں کہیں کھو گیا تھا میں نے اسے کبھی اتنا ملائم اور اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ مجھے وہ اس موڈ میں بے حد اچھا لگا۔

"ہاں، برا لگتا ہے میں ریشم ہوں اور بس.........." ریشم نے منہ پھلا کر جواب دیا۔

"حرکتیں تو تیری رضیہ سلطانہ والی ہیں۔ کتنی مرتبہ کہا ہے تجھ سے کہ یوں اکیلی، اس گھنے جنگل میں، رات گئے منہ اٹھا کر نہ آ جایا کر۔"

"انہیں لے کر آئی تھی۔" اس نے ہم دونوں کی طرف اشارہ کیا۔

"آج.......... مگر پندرہ روز سے تو ہر روز کسی نہ کسی بہانے آ جاتی ہے۔"

"تم بیمار جو ہو۔" اس نے معصومیت سے کہا۔ اس کے لہجے میں بے پناہ محبت موجزن تھی۔ لمحہ بھر کو جھونپڑے میں سناٹا چھا گیا۔ ریشماں کی محبت بھری تشویش کو سبھی نے محسوس کیا تھا حتیٰ کہ راجہ بھی اسے حیرت سے دیکھنے لگا مگر جلد ہی اس نے نگاہیں چرا لیں۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے.......... دادو اسے چھوڑ آ۔"

"وہ.......... راجہ.......... انسپکٹر آیا تھا۔ کہتا تھا، خان زادہ دباؤ ڈال رہا ہے۔ راجہ تو یہاں سے چلا جا ورنہ وہ تجھے گرفتار کر لیں گے۔"

لمحہ بھر پہلے شبنم محسوس ہونے والا راجہ، اچانک شعلہ بن کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "وہ کتا.......... مجھے گرفتار کرائے گا.......... اس سے کہہ دینا ریشم کہ راجہ کسی ایسی چیز کا نام

نہیں جسے آسانی سے قابو کیا جا سکے اور یہ بھی کہہ دینا کہ موت راجہ کی صورت میں تجھ سے قریب آ چکی ہے۔ میں اس کے گرد آگ کا وہ حصار بنا دوں گا کہ اس کا وجود لمحہ لمحہ آنچ سے پگھل کر اس کی ہڈیوں سے الگ ہو جائے گا۔"

راجہ کا لہجہ نفرت انگیز تھا۔ ریشم سہم کر کونے میں جا کھڑی ہوئی۔ راجہ کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ وہ غصے میں کانپ رہا تھا۔

"سردار یہ خان زادہ کون ہے، مجھے اس کا ٹھکانہ بتا دیں اور پھر آپ آرام کریں۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

"نئیں اوئے.......... راجہ اپنا شکار خود کھیلتا ہے۔" وہ غرا کر پلٹا۔

"میرے اوپر قرض ہے سردار، میں یہ بوجھ اتارنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں بالے تجھ پر اتنا بوجھ نہیں ہے جتنا مجھ پر ہے۔ سات لاشوں کا بوجھ ہے مجھ پر بالے.......... سات لاشوں کا۔ خان زادہ کے جسم کے سات ٹکڑے کروں گا میں، پھر ان ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے آگ میں ڈالوں گا۔"

"راجہ ایسی باتیں نہ کر، ایسی باتیں نہ کر راجہ.........." ریشماں رو پڑی۔

ریشماں کے آنسوؤں نے جیسے راجہ کے وجود میں بھڑکنے والی آگ کو بجھا دیا۔ وہ بستر پر ڈھے گیا۔ "تو.......... گئی کیوں نہیں؟"

"میں.......... نہیں جاؤں گی میں، تیرے ساتھ ہی مروں گی۔ مجھے بھی جلا ڈالنا آگ میں، جس آگ میں مَیں جل رہی ہوں وہ تو نہ جینے دیتی ہے اور نہ مرنے.........." وہ دوڑ کر راجہ کے پیروں کے قریب بیٹھ گئی۔

"پگلی جا چلی جا.......... تیرا بوڑھا باپ تیری راہ دیکھ رہا ہو گا اور سن جب تک خطرہ ہے اس طرف نہ آنا.......... مجھے کچھ نہیں ہو گا۔" آخری جملہ اس نے یوں کہا جیسے ریشماں کی محبت نے اسے ہرا دیا ہو۔

وہ جانا تو نہیں چاہتی تھی مگر ہم سب نے اسے مجبور کر کے بھیج دیا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ راجہ کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ یہ وعدہ میں نے اپنے آپ سے بھی کیا تھا میری تو تمام محبتیں ختم ہو چکی تھیں مگر میں ریشماں کی محبت کو ختم نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ میرے یقین دلانے پر ریشماں چلی گئی۔ یہاں آنے سے پہلے میرا ارادہ تھا کہ میں ریشماں کی حفاظت کی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

وجہ سے اس کے ساتھ ہی واپس جاؤں گا مگر جب میں نے دیکھا کہ دادو اسے گھر تک چھوڑنے جارہا ہے تو میں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور خود وہیں رہ گیا۔

راجہ کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اس کا بخار بڑھتا جارہا تھا۔ اس پر غشی طاری ہو رہی تھی۔ میں نے سلطان سے کہا وہ ٹھنڈا پانی لا دے۔ وہ پانی لے آیا تو میں نے رومال پانی میں بھگو کر راجہ کے ماتھے پر رکھ دیا۔

"سلطان، خان وغیرہ نظر نہیں آرہے۔" میں نے سلطان سے پوچھا۔

"خان، سردار کے لئے دوا لینے گیا ہے۔ دلاور اور کریم باہر پہرہ دے رہے ہیں، باقی لوگ نا معلوم کہاں ہیں۔ مجھے دادو نے انہی لوگوں کے بارے میں بتایا ہے۔" سلطان نے جواب دیا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ میں پانی سے بھیگا رومال رکھتا رہا۔ کافی دیر بعد راجہ کا بخار کچھ کم ہوا۔ اسی لمحے کریم کے ساتھ خان جھونپڑے میں داخل ہوا اور مجھے اور سلطان کو دیکھ کر حیران ہوگیا۔ "تم لوگ کب آئے؟"

"کافی دیر ہوگئی۔ تم دوا لائے ہو؟" سلطان نے پوچھا۔

"ہاں .... کیسا ہے سردار؟" اس نے سوئے ہوئے راجہ کی طرف دیکھا اور تھیلے میں سے کچھ ٹیبلیٹس نکال کر میری طرف بڑھا دیں۔ میں نے پیناڈول کی گولی نکال لی مگر راجہ بے خبر سو رہا تھا۔ میں نے اسے نیند سے جگانا مناسب نہ سمجھا اس کے لئے آرام بھی اتنا ہی ضروری تھا جتنا کہ دوا۔

سردی بڑھ گئی تھی۔ تیز ہوا کے ساتھ بارش بھی تیز ہوگئی تھی۔ میں نے اپنی چادر بھی راجہ کو اوڑھا دی۔ کریم نے اینٹوں کے درمیان بنے ہوئے چھوٹے سے گڑھے میں کچھ لکڑیاں ڈال کر آگ جلا دی اور میں، سلطان اور خان آگ کے گرد بیٹھ گئے۔ کریم واپس باہر چلا گیا۔ تب میں نے خان سے خان زادہ کے بارے میں پوچھا کہ وہ کون ہے اور کیوں راجہ کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور یہ کہ راجہ کی اس سے کیا دشمنی ہے؟

"یہ لمبی داستان ہے بالے۔ یوں سمجھ لے کہ یہی خان زادہ ہے جس نے راجہ کو ایک بھیانک روپ میں قید کردیا تھا وہ سیدھا سادا راجہ جسے صرف اور صرف محبت کی تلاش تھی اور جس نے اپنی محبت کو حاصل بھی کرلیا تھا اسے نفرت کی بھٹی میں جلا کر ڈاکو بنانے والا یہی

خان زادہ ہے بالے۔ خان زادہ نے بھی اسی لڑکی سے محبت کی تھی جسے راجہ کی محبت نے پارس بنا دیا تھا۔ وہ اس لڑکی کو حاصل نہ کرسکا تو اس نے راجہ کے بھرے گھر کو آگ لگا دی جس میں اس کی ماں، بہن، بھائی، باپ اور راجہ کی محبت، اس کی بیوی بھی جل مری تھی بالے .... اور ظلم تو یہ کہ وہ ماں بننے والی تھی۔ راجہ دن اور رات آنے والے ننھے فرشتے کے خواب دیکھا کرتا تھا مگر وہ فرشتہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی زندہ در گور کردیا گیا۔ بس اسی روز سے راجہ ایک شعلے میں تبدیل ہوگیا۔ اس نے خان زادہ کی حویلی کو آگ لگادی .... اس کے کھیت کھلیان اور مویشی جلا ڈالے مگر جانے خان زادہ کیسے بچ گیا۔ راجہ تو سمجھا تھا کہ وہ بھی جل مرا ہوگا مگر .... جانے کیسے ہوا یہ کہ وہ بچ گیا۔ تجھے بیگ صاحب کے پاس چھوڑنے کے بعد ہم لوگ کراچی چلے گئے تھے۔ وہاں راجہ کو کوئی کام تھا، وہیں ایک روز اچانک راجہ اور خان زادہ کا آمنا سامنا ہوگیا مگر وہ ایسی جگہ تھی کہ وہ لوگ ایک دوسرے کو کچھ نہ کہہ سکے لیکن اس روز کے بعد راجہ کا سکھ چین ختم ہوگیا۔ راجہ کراچی سے سیدھا اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ خان زادہ اب گاؤں میں نہیں رہتا مگر یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نے اپنے آدمی راجہ کے پیچھے لگا دیئے ہیں۔ وہ اثر و رسوخ والا آدمی ہے۔ شاید اس کے آدمیوں نے ہی راجہ کی یہاں موجودگی کے بارے میں اسے اطلاع دی ہوگی۔ یہ گاؤں خان زادہ کے چچا کی جاگیر تھا مگر یہ بات بہت پرانی ہے اب تو وہاں ایسا کوئی بھی نہیں تھا کہ جو دعویٰ کرتا مگر خان زادہ نے اپنا گاؤں چھوڑنے کے بعد یہاں آکر پرانی حویلی کو آباد کردیا اور دھیرے دھیرے اپنے پاؤں جما لئے۔ یہ سب ہمیں یہاں آکر پتا چلا تھا۔ راجہ کے خوف سے وہ حویلی میں چھپا بیٹھا ہے، اس نے محافظوں کی ایک ٹیم پال رکھی ہے مگر راجہ کہتا ہے کہ وہ جب تک خان زادہ کو جلا کر ختم نہیں کردے گا یہاں سے نہیں جائے گا۔ خان خاموش ہوا تو دور تک گہری خاموشی چھا گئی، بس بارش اور ہوا کی آواز تھی جو چاروں طرف گونج رہی تھی۔

"مگر ایسی حالت میں یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے خان۔" پھر میں نے بتایا کہ کس طرح ریشماں کے گھر انسپکٹر آیا تھا۔ وہ یہ سن کر پریشان ہوگیا۔

"مگر سردار کچھ سننے کو تیار نہیں۔ وہ نہیں مانے گا۔ میں اسے خوب جانتا ہوں۔" خان نے گہری سانس لے کر جواب دیا۔ "ہمارا تو کچھ نہیں ہے دوست، ہم تو تنہا ہیں، جان بھی دے کر اسے بچانے کی کوشش کرسکتے ہیں مگر وہ تو خان زادہ کو اپنے ہاتھوں سے مارنا چاہتا ہے۔"

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

اس نے خود کو تنہا کہا تو مجھے یاد آیا کہ میں تو اپنے سینے میں اس کے لئے خوشخبری چھپائے بیٹھا ہوں۔

"اور وہ .... شادو ...." میں نے ایک دم کہا تو وہ اچھل پڑا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

"کک .... کیا کہا تُو نے؟"

میں مسکرایا۔ "ہاں خان .... تیرا انتظار کرنے والے تو بہت ہیں خان' چاچا .... چاچی' شادو .... اور سب سے بڑھ کر شانی ...."

"شانی ....!" اس کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ "وہ تو .... جانے کہاں ہوگی۔" وہ خواب کے عالم میں بولا پھر چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

"خان .... میرے دوست تیری بہن' تیری شادو اور چاچا' چاچی کے ساتھ مل کر تیری راہ تک رہی ہے۔"

وہ بے قراری سے آگے بڑھا اور اس نے میرے دونوں شانے تھام لئے۔ "بالے تُو کیا کہہ رہا ہے .... تُو سچ کہہ رہا ہے نا؟ مگر تُو ان سب کو کیسے جانتا ہے اور .... شانی .... شانی کہاں تھی ....؟"

تب میں نے اسے شروع سے آخر تک ساری داستان سنادی۔ خان کی حالت خراب ہو رہی تھی کبھی تو لگتا تھا جیسے وہ رونے والا ہو اور کبھی وہ قہقہہ مار کر ہنس دیتا تھا۔

"خان' میں تیری شانی سے وعدہ کر آیا ہوں کہ تجھے بہت جلد وہاں بھیجوں گا۔ پلیز خان ایسا نہ کرنا کہ وہ سب مجھے وعدہ خلاف سمجھ لیں۔ وہ سب تیرا انتظار کر رہے ہیں۔" میں نے کہا تو وہ مجھ سے لپٹ گیا۔

"میں .... میں جاؤں گا بالے .... تُو نہیں جانتا بالے کہ شانی کو کھو دینے کی خلش نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔ میں نے ہمیشہ خود کو مجرم سمجھا کہ وہ میری وجہ سے کھو گئی' میں تیرا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا بالے .... کبھی نہیں۔"

ایک بوجھ تھا جو اتر گیا۔ خان یہ سب سن لینے کے بعد ایسا مگن ہوا کہ وہیں پتھر پر سر ٹکا کر لیٹ گیا۔ پھر میں نے اس کے چہرے پر ہزاروں رنگ اترتے دیکھے اور میں خود بھی قریب ہی آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ میں اس وقت خود کو بہت تنہا' اکیلا اور خالی خالی سا محسوس کر رہا

تھا۔ میرے اندر' میرے اردگرد کوئی بھی نہ تھا' میرے سارے رنگ جیسے حالات کی دھوپ نے اُڑا دیے ہوں۔ میرے سامنے صرف ایک منظر تھا' وہ اندھیرا اور قبرنما کمرا' جہاں فرش پر میرے باپ کی سرد لاش پڑی تھی اور میری ماں کے حلق سے نکلنے والی عجیب عجیب آوازیں تھیں جنہوں نے مجھے جکڑ رکھا تھا۔ یہ آخری بوجھ تھا جسے میں جلد از جلد اتارنا چاہتا تھا۔ راجو اور چوہدری کے بھیانک چہرے اور ان کی درندہ آنکھوں میں تیرتی خباثت کی چمک تھی جو اندھے راستوں میں مجھے کشاں کشاں اپنی طرف بلا رہی تھی۔ اب مجھ میں اور ان میں بہت کم فاصلہ تھا۔ میرے وہ تمام جذبے جو ناتمام تھے' رہ رہ کر ماں کی پُرسکون آغوش کی خواہش کو شدید کر رہے تھے۔ میں نے خود پر طاری ہو جانے والے اقبال کو کُھرچ کر پھینک دیا تھا۔ میں وہی بالا بن جانا چاہتا تھا جسے لُوٹا گیا تھا اور جو اپنے لٹ جانے پر انتقام لینا چاہتا تھا ورنہ یہ اقبال تو قدم قدم پر مجھے روک رہا تھا۔ کبھی انسانیت کا واسطہ دے کر اور کبھی تہذیب کو آڑے لا کر' اور وہ بالا جو مجھ میں کہیں بہت اندر پڑا سسک رہا تھا۔ مجھے اندر سے دبوچے ہوئے تھا اور اس کے تیز نوکیلے پنجے میرے وجود میں خراشیں سی ڈال رہے تھے۔ دبوچے جانے کی یہ کیفیت بہت اذیت ناک تھی' ان تمام اذیتوں سے زیادہ وحشت ناک جنہیں اب تک میں سہتا آیا تھا۔ میں اس راجو کو زندہ چھوڑ دینے کو گناہ تصور کرتا تھا جس نے میری بہن صغرا کے پھول سے بدن کو لہو رنگ کیا تھا۔ وہ راجو جس نے میرے باپ کو موت کی نیند سلا دیا تھا اور سب سے بڑھ کر میری محبت کو لوٹ لیا تھا۔ وہ سوہنی جو محض میرا خواب دیکھنے کی سزا میں لوٹی گئی اور اسے مجھ سے جدا کر دیا گیا۔ میرے ہنستے بستے گھر کو اجاڑ دینے والا راجو اور اس کی موت ہی میری منزل تھی۔ مجھے اندھی رات کے غار میں اتارنے والا راجو میرے دل و دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا اور میں سکون چاہتا تھا ایسا سکون کہ کوئی آواز ہو نہ تصور' نہ کوئی جذبہ اور نہ کوئی احساس۔ بس میں ہوں' میں ہوں اور بس میں ہوں یا میری ماں کی محبت بھری آغوش۔ یہ میرا آخری خواب تھا اور جس کی تعبیر حاصل کرنے کا میں نے تہیہ کر لیا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اب اس خواب کی تعبیر اپنی قسمت کو بھی نہیں چھیننے دوں گا۔

میں عذاب سوچوں میں گھرا رہا اور وقت جانے کب اور کیسے گزرتا چلا گیا۔ اچانک میں نے آہٹ محسوس کی۔ گردن پھیر کر دیکھا تو راجہ کو چاق و بند کھڑا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے اپنے سرہانے سے ریوالور نکال کر نیفے میں اُڑسا۔ وہ

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

شاید نہیں جانتا تھا کہ میں جاگ رہا ہوں۔ میں نے بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا اور دھیرے سے اپنا بازو آنکھوں پر اس طرح رکھ لیا جیسے میں سو رہا ہوں مگر میں ایک جھری سے اسے بہ غور دیکھ رہا تھا۔ سلطان اور خان دونوں بے خبر سو رہے تھے۔ راجہ نے جھونپڑے سے نکلتے وقت ایک نگاہ ہم تینوں پر ڈالی اور دبے پاؤں باہر چلا گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کہاں گیا ہے اور اس کا کیا ارادہ ہے اور یہ بھی کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں کچھ دیر انتظار کرتا رہا پھر بے چین ہو گیا تو میں نے خان کو جگا کر اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ راجہ گاؤں کی طرف نہ نکل جائے جہاں پولیس اس کی گھات میں بیٹھی ہے۔ خان میری پوری بات سننے سے پہلے ہی معاملے کو سمجھ گیا اور باہر کی طرف بھاگا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ سلطان بھی اٹھ گیا تھا وہ بھی میرے ساتھ ہی باہر آگیا۔ باہر گھور اندھیرا تھا اور بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ سخت سردی تھی جو راجہ کے لئے بہت خطرناک بھی ہو سکتی تھی کیونکہ اسے سخت بخار تھا۔ میں اور سلطان گہرے اندھیرے میں آگے بڑھنے لگے۔ ابھی ہم زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ ہمیں خان کی آواز سنائی دی جو ہمیں پکار رہا تھا۔ ہم آواز کی سمت بڑھے آسمان پر چمکنے والی بجلی کی چمک ہمیں راستہ دکھا رہی تھی۔ اسی چمک میں ہمیں خان بھی نظر آگیا جو زمین پر جھکا ہوا تھا۔

"بالے .... اٹھاؤ اسے ...."

"کون ہے؟"

"سردار!"

تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ زمین پر پڑے راجہ پر جھکا ہوا تھا۔ ہم نے راجہ کو اٹھا کر جھونپڑے میں پہنچایا۔ وہ بری طرح بخار میں پھنک رہا تھا۔

"نہیں .... مجھے چھوڑ دو .... میں خان زادہ کو .... جلا ڈالوں گا۔" وہ غشی کے عالم میں بڑبڑایا۔

"تم ٹھیک تو ہو جاؤ سردار، میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کتے کی لاش تمہارے قدموں میں لا کر ڈال دوں گا۔" خان نے اس کے کندھے کو تھپتھپایا۔

"نہیں .... اس کتے کو میں خود ماروں گا .... بہت جان ہے مجھ میں .... میں نے اس سے وعدہ کیا تھا خان، جب اس نے میری بانہوں میں دم توڑا تھا تو اس کی آنکھوں میں

بھرے سب خواب خون آلود تھے خان، اسے بچے کی بہت تمنا تھی، خدا نے ہمیں بچہ دیا تھا خان، مگر اس کتے نے ہمیں اس کی صورت دیکھے بغیر ہی ہم سے چھین لیا، وہ بچہ میرا اور زیبو کا خواب تھا، آرزو تھا ہماری، ابھی تو میں نے زیبو کو جی بھر کر پیار بھی نہیں کیا تھا خان .... ابھی تو بہت سی باتیں تھیں جو اَن کہی رہ گئیں .... نہیں خان .... وہ میرے حلق کا کانٹا ہے، میں اسے تباہ کر دوں گا ...." وہ بولے جا رہا تھا اور ہم سب کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ اسے کچھ ہوش نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے مجھے اس وقت وہ بہت معصوم لگا۔ اس کی شخصیت کا وہ مضبوط خول جو اس نے خود پر چڑھا رکھا تھا ٹوٹ چکا تھا اور اس کے اندر سے جو راجہ نکلا تھا وہ بہت بے بس، بہت دکھی اور بہت مجبور تھا، آنسوؤں میں بھیگا ہوا ایک بے بس انسان۔ اس کے اس روپ نے مجھے تڑپا کے رکھ دیا تھا۔

"ہاں سردار .... میں جانتا ہوں۔ میں جانتا ہوں سردار کہ تُو بہت دکھی ہے ...." خان بے اختیار رو دیا۔

میں اٹھ کر جھونپڑے سے باہر آگیا۔ راجہ کا دکھ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا یا شاید میرے اپنے اندر بھرے دکھ باہر آنے کو بے چین ہو رہے تھے، میں باہر آ کر بے ساختہ رو دیا اور اتنا رویا کہ میرے جی کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ بارش اب تھم چکی تھی اور آسمان کے کنارے سرمئی ہونے لگے تھے۔ میرا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ میں اندر جاؤں۔ میں باہر ہی ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ سلطان اور خان دونوں راجہ کے پاس تھے۔ دادو ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ اب مجھے اس کی طرف سے تشویش ہونے لگی تھی۔ معلوم نہیں راجہ نے اسے واپس آنے کو کہا بھی تھا یا نہیں۔ راجہ کی ایسی حالت نہیں تھی کہ میں اس سے کچھ پوچھتا۔ دھیرے دھیرے میرے اندر بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کچھ ہو گیا ہے یا جیسے کچھ ہونے والا ہے یہ کیفیت میرے لئے نئی نہیں تھی۔ اب سے پہلے بھی میں اس کیفیت کو محسوس کر چکا تھا، آپ اسے میری چھٹی حِس کہہ سکتے ہیں اس لئے کہ ایسا محسوس کرنے کے بعد واقعی کچھ نہ کچھ ہوا ضرور تھا۔ یہ بے چینی اور بڑھی تو میں گھبرا کر جھونپڑے میں چلا آیا۔

اندر حالات کافی بدلے ہوئے تھے۔ راجہ دیوار کے قریب پڑے پتھر سے کمر ٹیک کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مگا تھا اور مگے سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ دوسری طرف سلطان اور خان بیٹھے ہوئے تھے۔ آگ جلی ہوئی تھی اور سلطان چائے مگوں میں سے نکال رہا تھا۔ راجہ

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

اس وقت کافی بہتر حالت میں تھا البتہ اس کی آنکھوں کے سرخ ڈورے کچھ اور گہرے ہو رہے تھے۔

"اب آپ کیسے ہیں سردار؟" میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں بالے۔ زندگی میں پہلی بار بیمار ہوا ہوں۔ شاید ٹوٹ چکا تھا اس لئے ....جب انسان خود کو بہت زیادہ مضبوط اور بے حس سمجھ رہا ہوتا ہے تو.......... دراصل وہ اور کمزور اور حساس ہو چکا ہوتا ہے اور اپنی اس کمزوری کو پوری طرح سمجھ بھی رہا ہوتا ہے تبھی وہ خود پر بے حسی اور مضبوطی کا خول چڑھا لیتا ہے مگر جب وہ مصنوعی خول اس پر ضرورت سے زیادہ دباؤ ڈال دیتا ہے تو وہ بکھر جاتا ہے اور مضبوطی کے اس کے خول کے بعد بکھر جانا بڑا تباہ کن ہوتا ہے۔ میری باتیں سمجھ رہا ہے نا تو..........؟ یہ خول تو بھی اتار دے۔ خود کو ہلکا پھلکا کر دے جو کچھ کرنا چاہتا ہے کر گزر.......... جتنا برداشت کرے گا اتنا ہی کمزور ہوتا چلا جائے گا.......... جیسے.......... جیسے میں.........."

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس نے خود پر جتنا جبر کیا تھا اتنا ہی بکھر چکا تھا۔ جس راجہ سے میں پہلی بار ملا تھا اس راجہ میں اور آج کے نڈھال اور تھکے تھکے راجہ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

میں جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ اچانک باہر آہٹ ہوئی۔ میں اور خان اچھل کر کھڑے ہوگئے۔ اس لئے کہ آہٹ کے ساتھ ہی ایک نسوانی دبی دبی چیخ سنائی دی تھی۔ چیخ کی آواز شاید راجہ نے بھی سن لی تھی۔ وہ ایک ہی چھلانگ میں جھونپڑے کے دروازے پر پہنچ گیا مگر اس سے پہلے کہ ہم جھونپڑے سے باہر نکلتے، ریشماں بھاگتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور قلابازی کھا کر فرش پر لڑھک گئی۔ ابھی ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا کہ ایک لمبا تڑنگا آدمی جھونپڑے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

"راجہ.......... تو کب تک مجھ سے بھاگتا۔ آج میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" اس نے غرّا کر کہا۔

"اچھا ہوا خان زادے کہ تو خود ہی چل کر یہاں آ گیا۔ تیری تلاش میں بھٹکتے بھٹکتے تو میری قوتِ برداشت بھی جواب دیتی جا رہی تھی۔" راجہ نے اطمینان سے جاب دیا۔

"تجھ سے دشمنی شروع کرانے والی بھی عورت تھی راجہ، وہ عورت جو تیری محبت میں

پاگل ہو چکی تھی اور تجھے انجام تک پہنچانے والی بھی عورت ہے۔ یہ عورت جو تیری محبت میں پاگل ہے۔ ویسے میں اس کا شکر گزار ہوں کہ اسی کی وجہ سے تیرے ٹھکانے تک پہنچ گیا، اور وہ تیرا محافظ کتا جو اسے پہنچانے گیا تھا باہر لاش کی صورت میں پڑا ہے۔ ویسے اس کے جسم پر اتنی گولیاں لگی ہیں کہ شاید تو اسے پہچان بھی نہ پائے گا۔" اس نے انتہائی سفاکی سے جواب دیا۔

ریشماں گھسٹتی ہوئی دیوار تک پہنچ گئی تھی اور اب دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی باچھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ کلائی زخمی تھی اور رخسار پر انگلیوں کے نشان بنے ہوئے تھے مگر نہ تو اس کی آنکھوں میں خوف تھا اور نہ ہی اس کے چہرے پر ملال بلکہ وہ خان زادے کو اس طرح گھور رہی تھی جیسے ابھی اس پر چھلانگ لگا کر اس کی تکہ بوٹی کر ڈالے گی۔

خان زادہ اکیلا تو نہیں آیا ہوگا اس کے ساتھی یقیناً باہر موجود ہوں گے مگر جھونپڑے میں وہ تنہا ہی داخل ہوا تھا اور یہ ہمارے لئے بہتر تھا اس لئے کہ میں اس کے انتہائی بائیں جانب تھا۔ خان اور سلطان دائیں جانب کھڑے تھے اور راجہ اس کے بالکل سامنے تھا۔ میں نے خان اور سلطان کی طرف دیکھا۔ مجھے لگا جیسے خان نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اشارہ کیا ہو مگر وہ کیا چاہتا تھا یہ میں سمجھ نہیں سکا۔ بہرحال میں نے اپنے کوٹ کے اندر سے ریوالور کی موجودگی کو محسوس کیا اور غیر محسوس انداز میں اپنا ہاتھ بغل میں پڑی اس پیٹی پر رکھ لیا جس میں ریوالور تھا۔ چند ہی لمحوں بعد ریوالور میرے ہاتھ میں تھا مگر میں نے کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ حالات کس کروٹ بیٹھتے ہیں اور یہ کہ راجہ کا اگلا قدم کیا ہوگا۔ خان بھی شاید بالکل تیار تھا اس لئے کہ اس کے جبڑے ایک دم بھنچ گئے تھے اور اس کا ہاتھ چادر کے اندر تھا جو نہی میری نگاہیں اس سے ملیں اس نے پلکیں جھپکا کر مجھے اطمینان دلا دیا۔

"خان زادے، یہ تیرے حساب میں آٹھویں لاش ہے۔" راجہ نے غیر محسوس انداز میں پیچھے سرکتے ہوئے کہا۔ وہ شاید خان زادہ کی توجہ ہٹانا چاہتا تھا۔

"نہیں راجہ.......... کوئی چالاکی نہیں۔" وہ ایک دم چوکنا ہو گیا اور اس نے اپنے ریوالور والے ہاتھ کو حرکت دی۔ اس کے ریوالور کا رخ راجہ کے سر کی طرف تھا۔ "میں

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

چاہوں تو تجھے ابھی کتے کی موت مار سکتا ہوں مگر میں پاگل نہیں ہوں۔ مجھے تو ابھی زندہ رہنا ہے' دنیا کی رنگینیوں کو سمیٹنا ہے راجہ' عیش کرنا ہے' تیری طرح جنگلوں میں مارا مارا تو نہیں پھرنا ہے مجھے' میں تجھے نہیں ماروں گا بلکہ تجھے پولیس کے حوالے کر کے سرخرو ہو جاؤں گا۔ ایک خطرناک مجرم کو پولیس کے حوالے کرنا ہر شہری کا فرض ہے اسے قانون کو اپنے ہاتھوں میں نہیں لینا چاہئے اور ویسے بھی گولی مار دینا بہت آسان موت ہے اور تجھے آسان موت دینا بے وقوفی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تُو جیل کی سلاخوں کے پیچھے اپنی زندگی کے دن انگلیوں پر گنے اور پھر ایک دن تمہیں اس کال کوٹھری سے نکال کر پھانسی کے پھندے تک لے جایا جائے۔ تیرے چاروں طرف سناٹے میں صرف موت کے قدموں کی چاپ گونج رہی ہو اور تُو قدم بہ قدم موت کی طرف بڑھے۔ کاش میں اس وقت وہاں موجود ہوں کاش ....''

''تیری یہ آخری آرزو میں پوری نہیں ہونے دوں گا خان زادے۔ تُو میری موت کا تماشا دیکھنے کے لئے زندہ ہی نہیں ہوگا۔'' راجہ نے غرا کر جواب دیا۔ شاید وہ آگے بھی بڑھنا چاہتا تھا مگر عین اسی لمحے ریشماں بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔

''نہیں راجہ ....'' وہ چیخی۔

''ہٹ جا میرے سامنے سے۔'' راجہ نے ریشماں کو دھکا دیا مگر وہ پھر بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔

''نہیں راجہ .... تجھے میری قسم۔''

''ہاہاہا..........'' خان زادہ نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ''کتنا خوش قسمت ہے تُو کہ عورتیں تیری محبت میں خود کو قربان کر دینے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ زیبو نے بھی تُو خود کو تجھ پر قربان کر دیا تھا نا؟''

زیبو کا نام سنتے ہی راجہ جیسے پاگل ہو گیا۔ اس نے خان زادہ پر چھلانگ لگا دی۔ مجھے اور خان کو بھی اسی وقت موقع مل گیا اور ہم نے اپنے ریوالور نکال لئے مگر وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے زمین پر گرے۔ اسی وقت ایک دھماکا ہوا اور ساتھ ہی ریشماں کی کربناک چیخ گونج اٹھی۔ خان زادہ کے ریوالور سے نکلی ہوئی گولی ریشماں کے پیٹ میں جا لگی تھی اور وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر گرتی چلی گئی۔ خان چھلانگ لگا کر راجہ اور خان زادہ کے سروں پر پہنچ گیا اور اس نے ریوالور کی نال خان زادہ کی کنپٹی پر رکھ دی۔ میں

ریشماں کی طرف لپکا مگر خان کی آواز نے میرے قدم تھام لئے۔ ''بالے .... باہر کا خیال رکھ۔'' پھر وہ خان زادہ سے مخاطب ہوا۔ ''ریوالور پھینک دے۔''

اس نے فوراً ہی ریوالور پھینک دیا اور راجہ کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ''خان اسے مارنا نہیں' یہ میرا شکار ہے۔''

''راجہ .... یہ مت بھول کہ پولیس پہنچنے والی ہوگی۔'' اس نے راجہ کو دھمکایا مگر اس کا چہرہ پیلا پڑ چکا تھا۔ وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا شاید اسے اب اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے کسی ساتھی کو اپنی مدد کے لئے اندر کیوں نہیں لایا۔ سلطان' ریشماں کو سنبھال رہا تھا۔ اس لئے میں دبے پاؤں باہر نکل آیا۔

باہر نکلتے ہی کریم اور دلاور میرے سامنے آ گئے۔

''دیکھو کریم باہر..........''

''وہ پڑے ہیں دونوں!'' کریم نے میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہا۔ ''ہم نے ان دونوں کو ٹھکانے لگا دیا ہے اندر سب ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں تم دونوں صرف باہر کا خیال رکھو۔ ممکن ہے اس کے اور بھی ساتھی ہوں اور تمہاری غفلت سے فائدہ اٹھالیں۔''

''ہم زندگی میں کبھی غافل نہیں رہے دوست۔ سردار تک اگر کوئی پہنچ جائے تو سمجھ لینا کہ ہم اس دنیا میں نہیں رہے۔'' دلاور نے گرج دار آواز میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔

اندر کا منظر کربناک تھا۔ ریشماں کی کھلی ہوئی آنکھیں راجہ پر جمی ہوئی تھیں اور ان میں دھیرے دھیرے موت کا اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ خان اب بھی اپنا ریوالور خان زادے کی کنپٹی پر رکھے کھڑا تھا جبکہ سلطان اور راجہ دونوں ریشماں کو سنبھال رہے تھے۔

''راجہ .... تُو .... مجھے پیار کرتا .... ہے نا؟'' ریشماں نے اکھڑے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''ہاں .... ریشماں' اب تیرے سوا میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ ہمت کر ریشم .... تجھے کچھ نہیں ہونا چاہئے۔''

مگر راجہ کے منہ سے ''ہاں'' سنتے ہی ریشماں کا سر ڈھلک چکا تھا۔ ایک تیر سا میرے دل

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

میں اتر گیا۔ میں پاگل ہو گیا۔ مجھے صغرا اور سوہنی دونوں یاد آ گئیں۔ میں غصے میں پلٹا اور پوری قوت سے خان زادہ کی کمر پر لات ماری۔ وہ بری طرح قلابازیاں کھاتا ہوا دور جا گرا۔ سلطان اور راجہ چیخ کر کھڑے ہو گئے۔

"نہیں بالے ...." راجہ زور سے چیخا۔ "ہاتھ نہ لگانا اسے .... یہ .... یہ میرا شکار ہے۔" پھر اس نے ایک نظر ریشماں پر ڈالی جو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکی تھی۔ خان کی آنکھوں میں بھی خون اترا ہوا تھا۔ سلطان کی حالت بھی کچھ مختلف نہ تھی مگر راجہ کی وجہ سے ہم سب بے بس تھے۔

راجہ کے چہرے پر عجیب زلزلے کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے' ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور وہ دھیرے دھیرے خان زادے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

خان زادہ نے پیچھے سرکنے کی کوشش کی مگر خان نے ایک زوردار لات اس کی کمر پر ماردی اور وہ کراہ کر اوندھا گیا۔ راجہ اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ راجہ نے اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لئے۔ خان زادہ کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ وہ گھگھیانے لگا مگر راجہ تو جیسے اندھا ہو چکا تھا۔ اس نے خان زادہ پر گھونسوں اور لاتوں کی بارش کر دی۔

کچھ ہی دیر بعد خان زادہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کا چہرہ جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔

"خان! آگ میں لکڑیاں اور ڈال دے۔ یہ آگ تو اسے جلانے کو کافی نہیں ہے۔" راجہ کی سرسراتی ہوئی آواز گونجی اور میں نے اس کے لہجے میں بلا کی سفاکی محسوس کی۔ یہ اتنی تھی کہ میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔

خان نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور کونے میں رکھی لکڑیاں آگ میں ڈال دیں۔ ذرا دیر بعد ہی آگ بھڑک اٹھی۔

"اس کو ہوش میں لاؤ تاکہ یہ خود کو جلتا ہوا دیکھ سکے اور محسوس کر سکے' اسے پتا چلے کہ زندہ جلنے کی اذیت کیسی ہوتی ہے۔"

سلطان نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر پانی ڈالا اور پانی کے چند قطرے اس کے خون آلود ہونٹوں پر بھی ٹپکائے چند منٹ بعد ہی وہ کسمایا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے

چہرے پر بے پناہ خوف پھیل گیا۔ بھڑکنے والی آگ سے اٹھتے ہوئے شعلوں کے سائے پورے جھونپڑے میں لرز رہے تھے اور لکڑیاں کے چٹخنے کی ہیبت ناک آوازیں رونگٹے کھڑے کر رہی تھیں۔

"نن .... نہیں .... راجہ ...." وہ ہکلایا۔

"شش .... خاموش ...." راجہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔ "یہ آوازیں سن رہا ہے تو .... یہ آوازیں اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ یہ لکڑی چٹخنے کی آوازیں' کچھ ہی دیر بعد تیری ہڈیاں بھی اسی طرح چٹخیں گی خان زادے .... اور وہ آوازیں مجھے بڑا سکون دیں گی پھر میں سکون سے مر سکوں گا۔ آج میرا انتقام پورا ہو جائے گا خان زادے' تو نے یہاں تک آ کر مجھ پر احسان کیا ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے مگر خوفناک لہجے میں بول رہا تھا۔

اچانک دروازے پر کریم داد نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے قریب جا کر پوچھا۔

"وہ سردار ....باہر جنگل کے چاروں طرف پولیس گھیرا ڈال رہی ہے۔"

میں' سلطان اور خان یہ بات سن کر اچھل پڑے مگر راجہ اسی طرح پُرسکون انداز میں بیٹھا رہا اور اس کی نگاہیں بدستور خان زادے پر جمی رہیں جو یہ خبر سن کر خوش ہو گیا تھا۔

"خان یہ ریوالور مجھے دے دو۔" راجہ نے ہاتھ بڑھایا تو خان نے اسے ریوالور دے دیا۔ راجہ نے ریوالور کا رخ خان زادہ کے پیٹ کی طرف کیا اور گولی چلا دی۔ خان زادہ کی چیخ گونجی اور سناٹے کو چیرتی چلی گئی۔

"میں تیرے پیٹ میں گولی اس لئے مار رہا ہوں خان زادے کہ تو بھاگنے کی کوشش نہ کرے اور مرے بھی نہیں تجھے تو جل کر مرنا ہے نا .... یہ موت تو نے خود ہی اپنے لئے چن لی تھی خان زادے ...." اتنا کہہ کر راجہ کھڑا ہو گیا مگر اس نے اپنا پیر خان زادے کی کھوپڑی پر رکھ کر دبا دیا تھا۔ اب خان زادے کا چہرہ راجہ کے بوٹ تلے بے بس تھا۔

"خان' تم سب لوگ پچھلے حصے سے نکل سکتے ہو۔ پولیس ابھی صرف گھیرا ڈالنے کی کوشش کر رہی ہے مگر تم اس راستے سے واقف ہو جہاں اس کی رسائی ممکن نہیں پولیس کو یہاں تک پہنچنے میں بھی ابھی گھنٹا بھر لگے گا اور وقت تم لوگوں کے لئے کافی ہے۔"

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

جاؤ............"

"مگر سردار آپ............" میں نے کہنا چاہا۔

"جاؤ............" وہ گرجا۔

"نہیں سردار ہم یہاں آپ کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔" اس بار خان اور کریم بیک وقت بول اٹھے۔

"یہ میرا حکم ہے خان' میرا آخری حکم ماننے سے انکار کردو گے؟"

"مگر سردار............"

"چلے جاؤ خان' وقت ضائع کرنے سے تم لوگوں کو نقصان ہوگا۔ مجھے............ مجھے اب کہیں نہیں جانا خان۔ زیبو کے بعد ریشماں بھی چلی گئی۔ میں اسے یہاں چھوڑ کر کہیں بھی نہیں جاؤں گا اور ابھی تو مجھے ان شعلوں کو بھڑکانا ہے خان کے جسم کے ٹکڑے ڈال کر شعلوں کا رقص دیکھنا ہے۔ جاؤ چلے جاؤ ورنہ............" وہ غصے میں چیخا اور اس نے ریوالور کا رخ ہم لوگوں کی طرف کردیا۔

ہم میں سے کوئی بھی اسے اس طرح تنہا چھوڑنے کو تیار نہیں تھا مگر راجہ تو جیسے پاگل ہی ہوگیا تھا' میں اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھ رہا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ جب تک وہ اپنی کیفیت سے چھٹکارا پاتا پولیس ہم تک پہنچ جاتی اور پھر ہم سب ہی دھر لئے جاتے۔ بالآخر ہم لوگ مجبور ہوگئے اور جھونپڑے سے باہر چلے آئے۔ ہمیں دور ہی سے پولیس کی ٹارچوں کی روشنیاں نظر آگئی تھیں۔

"اسی طرف............!" خان نے سرگوشی کی اور پلٹ کر ایک جانب دوڑ لگادی۔

ہم سب اس کے پیچھے تھے۔ ابھی ہمیں زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ خان زادہ کی کرب ناک چیخوں سے جنگل گونج اٹھا' ساتھ ہی راجہ کے قہقہوں کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ خان زادہ کی چیخوں میں اتنا کرب تھا کہ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے مگر ہم رکے نہیں اس لئے کہ یہ آوازیں پولیس والوں نے بھی سن لی ہوں گی۔ مجھے یقین تھا کہ راجہ گرفتار ہونے سے نہیں بچ سکے گا۔ ہم تیز قدموں سے آگے بڑھتے رہے۔ ہم جھونپڑے سے کافی دور نکل آئے تھے مگر پھر بھی گوشت جلنے کی کراہیت انگیز بدبو نے ایک بار پھر لرزا دیا۔ ہم سب کے قدم تھم گئے۔

"وہ............ وہ پاگل ہوگیا۔" میں بڑبڑایا۔

"اب وہ پکڑا جائے گا خان!" کریم کی سرگوشی میں بلا کا خوف تھا۔

اسی وقت گولی چلنے کی آواز آئی اور پھر گہرا سناٹا چھا گیا۔

"وہ پکڑا نہیں جائے گا۔ وہ............ وہ مرگیا۔" خان نے نڈھال لہجے میں جواب دیا۔

سب کو سانپ سونگھ گیا۔ میں جانتا تھا کہ خان صحیح کہہ رہا ہے' راجہ خود کو پولیس کے حوالے نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے آخری لمحے میں اس کی آنکھوں میں جم جانے والے عزم کو دیکھ لیا تھا اور شاید خان بھی جان چکا تھا کہ وہ کیا کرے گا۔

"یہاں ٹھہرنا خطرناک ہے بالے' بہت جلد پولیس جان جائے گی کہ ہم فرار ہوچکے ہیں۔ یہاں کچھ دور ایک پہاڑ ہے' زیادہ اونچا نہیں ہے' ہم اگر اس پہاڑ کے پار اتر گئے تو یہاں کی پولیس سے محفوظ ہوجائیں گے اور اس علاقے سے دور نکل جانا بھی آسان ہوجائے گا کیونکہ پہاڑ کے قریب سے ریل کی پٹری گزرتی ہے' ہم کسی نہ کسی طرح ٹرین پر چڑھ سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے چلو!"

ہم تقریباً گھنٹا بھر کے بعد ہی اس پہاڑ تک پہنچ گئے۔ اب صبح کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ ہمیں سورج نکلنے سے پہلے ہی پہاڑ کی دوسری طرف اترنا تھا ورنہ ممکن تھا ہم پولیس کی نظروں میں آجاتے۔ پہاڑ واقعی زیادہ اونچا نہیں تھا' تھوڑی سی محنت کے بعد ہم دوسری طرف اتر گئے تھکن سے بری حالت ہوچکی تھی اس لئے چلنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ سخت پیاس کی وجہ سے حلق خشک ہوگیا تھا۔ پہاڑ سے نیچے اترتے ہی میں زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ مجھے کر دیکھ کریم' دلاور' سلطان اور خان بھی بیٹھ گئے۔

سب خاموش تھے' سب کی آنکھوں میں اداسی تھی۔ راجہ کی جدائی اور اس کی عجیب وغریب موت نے سب کے ہونٹوں پر مہر لگادی تھی۔ وہ شخص' جس کے ایک اشارے پر اتنے بہت سے جوان اپنی جان لٹانے کو تیار رہتے تھے' اس وقت بے گوروکفن تنہا اس جھونپڑے میں پڑا ہوگا۔ اس کی میت کو کندھا دینے والوں میں اس کا ایک بھی وفادار ساتھی نہیں ہوگا بلکہ اس کی لاش لاوارث لاشوں کے درمیان ڈال دی جائے گی۔ یہ احساس ہی میرے لئے اذیت ناک تھا۔ میں جتنا اسے بھلانے کی کوشش کررہا تھا اتنا ہی میرا ذہن اس کی یاد میں جکڑتا جارہا تھا۔

میں نے اپنے باقی ساتھیوں کے چہروں پر نگاہ ڈالی۔ وہ سب ہی خلاؤں میں گھور رہے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

تھے۔ میں جانتا تھا کہ راجہ کا چہرہ ان سب کے تصورات پر چھایا ہوا ہو گا۔ وہ سب بھی اسی کے بارے میں سوچ رہے ہوں گے۔ ایک گھنٹا آرام کرنے کے بعد ہم پھر چل پڑے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ریل کی پٹڑی پر اس وقت ایک مال گاڑی کھڑی تھی۔ خان کے اشارے پر ہم سب اس کی طرف بڑھے۔ خان نے ڈرائیور سے کہا کہ ہماری گاڑی کو ایک حادثہ پیش آگیا تھا جس کی وجہ سے وہ ناکارہ ہو گئی ہے اور ہم سب میلوں کا سفر پیدل طے کر کے یہاں تک پہنچے ہیں اور راستوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اس لئے وہ ہماری مدد کرے۔ ڈرائیور شریف آدمی تھا۔ اس نے ہم پر ترس کھایا اور ہمیں اگلے اسٹیشن تک پہنچا دینے کا وعدہ کیا۔ اس نے ہمیں پانی بھی پلایا اور یوں ہم دو گھنٹے کے تھکا دینے والے سفر کے بعد ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر اتر گئے۔

یہ نور آباد نامی گاؤں تھا۔ بڑا خوبصورت اور سرسبز علاقہ تھا۔ اسٹیشن گو ویران تھا مگر باہر ایک دو دکانیں تھیں اور ایک ٹھیلے پر مرغ چھولے بک رہے تھے۔ ٹھیلے والا ٹھیلے کے نیچے لیٹا سستا رہا تھا۔ ہم چاروں کو اپنی جانب آتا دیکھ کر وہ جلدی سے ٹھیلے کے نیچے سے نکل آیا۔ ہم نے پیٹ بھر کر مرغ چھولے کھائے۔ پیٹ بھر جانے کے بعد ہمارے ہوش ٹھکانے آگئے تھے۔ میرا تو جی چاہ رہا تھا کہ میں وہیں کہیں پڑ کر سو جاؤں مگر ایسا بہت مشکل تھا۔

"بالے.........." خان نے بیڑی سلگاتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

"ہوں!"

"اب تیرا کیا پروگرام ہے؟"

"خان.......... میں.......... میں اپنے گاؤں جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے پھر ہم پہلے تیرے گاؤں چلتے ہیں.......... تجھے بھی تو حساب چکتا کرنا ہے نا؟"

"نہیں خان.......... تجھے اپنے گاؤں جانا ہے۔ شانی تیرا انتظار کر رہی ہو گی۔" پھر میں کریم' دلاور اور سلطان سے مخاطب ہوا۔ "اور تم لوگ.......... جہاں چاہو جا سکتے ہو۔"

"بالے.......... ہم راجہ کو کھو چکے ہیں' اب تجھے نہیں کھونا چاہتے۔" خان نے دھیرے سے کہا۔

"خان' راجہ وہ مرکز تھا کہ جس کی وجہ سے ہم سب ایک تھے' مگر اب' جب وہ مرکز ہی

نہیں رہا تو پھر' اور ویسے بھی ہم بھلا ساتھ رہ کر کیا کریں گے' میرا مشورہ ہے خان کہ اب تم لوگوں کو ایک نئے سرے سے زندگی گزارنا چاہئے۔ زندگی جنگلوں میں نہیں ہوتی خان' یہ گھروں کے آنگنوں میں ہوتی ہے' جہاں بہت سے چہرے' بہت سی آوازیں انسان کو اس کی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں' اسے رشتوں کا احساس دلاتی ہیں۔ جذبوں سے روشناس کراتی ہیں' انسان جذبوں اور رشتوں ہی کا تو نام ہے خان' جب تم اپنے گاؤں جاؤ گے تو تمہیں معلوم ہو گا کہ زندگی کسے کہتے ہیں' اور کریم.......... دلاور' میں نہیں جانتا کہ تم لوگوں کا انتظار کرنے والے کہاں ہیں مگر یہ ضرور جانتا ہوں کہ وہ کہیں نہ کہیں آج بھی تمہارے منتظر ہوں گے۔ جاؤ کریم زندگی کی طرف لوٹ جاؤ۔" میں نے تھکے ہوئے اور کھوکھلے لہجے میں کہا' اس لئے کہ میں جو انہیں زندگی کی طرف لوٹ جانے کو کہہ رہا تھا خود موت کے راستے کا انتخاب کر چکا تھا۔ صرف اس لئے کہ اب دنیا کے کسی کونے میں کوئی بھی میرا منتظر نہیں تھا اور دنیا میں تنہا ہونا کیسا اذیت ناک ہوتا ہے اس کا احساس مجھے راجہ کی کیفیت نے دلا دیا تھا۔ میں بھی وہی کر رہا تھا جو راجہ کر چکا تھا۔

خان مجھے تنہا چھوڑنے کو تیار نہ تھا مگر میرے بہت اصرار پر اور قسمیں دینے پر وہ گاؤں جانے پر تیار ہو گیا۔ کریم اور دلاور بھی جانے کو تیار ہو گئے مگر سلطان خاموش تھا اور پھر ہم سب جدا ہو گئے۔ خان مجھ سے جدا ہوتے بہت اداس تھا' اس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اس کے گاؤں ضرور آؤں گا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں اگر زندہ ہوا تو ضرور آؤں گا خان نے مجھے تنبیہہ کی تھی کہ میں تنہا راجو اور چوہدری سے بھڑنے کی کوشش نہ کروں بلکہ وہ جب گھر والوں سے مل کر آئے گا تو ہم ساتھ ہی گاؤں جائیں گے بلکہ اس نے تو جگہ بھی طے کر لی کہ ہم اسی گاؤں میں' اسی اسٹیشن پر دوبارہ ملیں گے۔ میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا اور اسے جھوٹی تسلی بھی دی کہ میں تنہا کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ اسے تو یقین آگیا مگر سلطان مجھے جس انداز میں دیکھ رہا تھا اس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ میرے ارادوں سے خوب واقف ہے۔

خان' کریم اور دلاور چلے گئے۔ اب دوپہر ہو چکی تھی۔ میں نے اور سلطان نے گاؤں کے ایک چھوٹے سے ہوٹل پر کھانا کھایا۔ سلطان کی گہری خاموشی اور اس کی چبھتی ہوئی نگاہیں مجھے پریشان کر رہی تھیں۔ وہ سائے کی طرح میرے ساتھ تھا اور اس نے اب تک

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

جانے کی بات نہیں کی تھی۔ میں شام ہونے سے پہلے پہلے اپنے گاؤں پہنچ جانا چاہتا تھا اس لئے اس کی طرف سے پریشان تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس طرح میرا سایہ بنا رہے اور خود کو بھی موت کے اس جال میں پھنسا دے جو صرف میرا انتظار کر رہی ہے۔

میں جانتا تھا کہ اس کے گھر کے برابر میں رہنے والی وہ معصوم سی صورت کی لڑکی اس کی منتظر ہوگی جو مجھ سے اس لئے ناراض تھی کہ میرے وہاں پہنچنے کے بعد سلطان اس سے دور ہوگیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی حسین آنکھوں میں جلنے والے دیئے بجھ جائیں۔

"سلطان.........." تنگ آ کر میں نے اسے مخاطب کیا۔

"ہوں!"

"سلطان اب تُو بھی چلا جا۔ یہاں سے تجھے لاہور کے لئے لاری مل جائے گی۔"

"میں جانتا ہوں۔" اس نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھ کر جواب دیا۔ "میں جانتا ہوں کہ یہاں سے لاہور جانے والی لاری مل جائے گی مگر میں لاہور نہیں جا رہا۔"

"کیوں.......... پھر کہاں جائے گا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تیرے ساتھ.........." اس نے پُرسکون انداز میں جواب دیا۔

"مگر میں تمہیں ساتھ نہیں لے جانا چاہتا۔"

"میں تیرے چاہنے یا نہ چاہنے کا پابند نہیں ہوں جو میرا جی چاہے گا میں وہی کروں گا۔"

"یہ کیا بات ہوئی' میں نہیں چاہتا کہ .... کہ تُو میرے ساتھ رہے تو کیا زبردستی ہے؟"

"بالے .... مجھ سے بحث کرنا بیکار ہے' میں تیرے ارادوں سے واقف ہوں اور تجھے اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"مگر میرا ہے کون .... تجھے کیا حق ہے کہ تُو .... دیکھ سلطان تجھے چلا جانا چاہئے' وہ لڑکی اچھی لڑکی ہے' میں چاہتا ہوں کہ جب میں ماں کو لاہور لے کر پہنچوں تو .... وہ تیرے گھر پہ ہو' میرا اور ماں کا استقبال کرنے کے لئے.........." میں نے اسے بہلانا چاہا۔

"مگر میں چاہتا ہوں کہ تُو اور ماں اس لڑکی کا استقبال کرنے کے لئے میرے گھر موجود ہوں اور اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم ساتھ ہی گاؤں جائیں اور وہاں سے ماں کو لے کر لاہور چلے جائیں۔"

"سلطان تُو میری بات مانتا کیوں نہیں .... میں تجھ سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا' پھر تُو کیوں میرے پیچھے پڑا ہے؟" میں غصے میں چیخ اٹھا۔

"اس لئے کہ میں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔ میں نے تجھ سے کہا نا کہ مجھ سے بحث نہ کر' خواہ مخواہ تھک جائے گا۔" اس نے اسی اطمینان سے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر بے پرواہی کے ساتھ عزم بھی تھا۔ آنکھوں میں سرد مہری تھی جس نے مجھے یہ احساس دلا دیا تھا کہ واقعی اس سے اس موضوع پر بحث بالکل بیکار ہے۔ ویسے اس کے رویے نے جہاں مجھے غصہ دلایا تھا وہاں اس کی قدر بھی میرے دل میں بڑھا دی تھی۔ اس نے آج تک بُرے وقت میں میرا ساتھ دیا تھا اور وہ اب بھی میرا ساتھ چھوڑنے پر تیار نہ تھا کہ اس کا ساتھ میری بہت سی مشکلیں آسان کر دے گا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ میں ماں کو اس کے ساتھ شہر روانہ کر سکتا تھا پھر میں آسانی سے راجو اور چوہدری سے انتقام لے سکتا تھا۔ اس خیال نے مجھے کافی ہلکا پھلکا کر دیا اور میں خاموش ہوگیا۔

میں نے اسی رات گاؤں جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اب میرے یہاں وہاں بھٹکنے کا جواز بھی نہیں تھا۔ میں اپنے انتقامی جذبوں کے بوجھ تلے کچلا ہوا تھا۔ میں اس بوجھ سے آزاد ہونا چاہتا تھا۔ ہم اسی رات گاؤں کے سفر پر روانہ ہوگئے۔ لاری ہمیں آسانی سے مل گئی تھی اور یہ آخری لاری تھی جو ہمارے گاؤں کے قریب سے گزر کر آگے جاتی تھی۔ گو اس سڑک سے میرے گاؤں کا فاصلہ کافی تھا مگر میں مزید انتظار نہیں کرنا چاہتا تھا اور ویسے بھی رات گئے میرا وہاں جانا' دن میں جانے سے بہتر تھا۔ حالانکہ میرا حلیہ اب کافی بدل چکا تھا مگر پھر بھی وہ میرا گاؤں تھا' وہاں کے رہنے والے مجھے بچپن سے دیکھتے آئے تھے ان کا مجھے پہچان لینا کوئی تعجب خیز امر نہیں تھا بلکہ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ مجھے ہر روپ میں پہچان لیں گے۔ سلطان مجھے بتا چکا تھا کہ گاؤں والے مجھے مُردہ سمجھ چکے ہیں۔ چوہدری نے سب کو یقین دلا دیا ہے کہ بالا پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ سوائے غلام رسول سپاہی کے سبھی نے اس بات پر یقین کر لیا تھا۔ اب میرا پروگرام بھی یہی تھا کہ میں اندھیری رات میں غلام رسول سپاہی کے گھر تک آسانی سے پہنچ جاؤں گا۔ اس سے مجھے گاؤں کے حالات بھی معلوم ہو جائیں گے اور وہاں میں اپنی ماں سے بھی مل لوں گا۔

سفر بڑا تھکا دینے والا تھا' پرانی اور کھٹارا لاری یوں چل رہی تھی جیسے صدیوں چلتی ہی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

رہے گی۔ مجھے نہ نیند آرہی تھی' نہ بھوک اور نہ ہی پیاس لگی تھی بس ایک عجیب و غریب سی کیفیت طاری تھی جسے نہ خوشی کہا جاسکتا تھا اور نہ غم' شاید یہ اتنے برس بعد اپنے گاؤں جانے مگر گاؤں میں کچھ نہ پانے کی حقیقت اور اس کا تکلیف دہ احساس تھا۔ ہاں میرے وجود پر جو ایک جذبہ بہت واضح تھا وہ نفرت کا جذبہ تھا جس نے میرے دماغ کو بری طرح جکڑ رکھا تھا۔

بس اونچے نیچے اور کچے راستوں پر سفر کرتی رہی' دونوں جانب گھور اندھیرے میں کبھی کبھی کوئی منظر نظر بھی آتا تو وہ اتنا مبہم ہوتا کہ کوئی تاثر چھوڑے بغیر گزر جاتا تھا۔ سلطان خاموش بیٹھا تھا۔ میں بھی کچھ نہ بولا بس آنکھیں بند کئے سوچتا رہا کہ جب میں اپنی ماں سے ملوں گا تو کیا وہ مجھے پہچان لے گی؟ وہ جو ہوش و خرد سے بے گانہ ہو چکی ہے اور اگر اس نے مجھے پہچان لیا اور صغرا کے بارے میں سوال کیا تو میں اسے کیا جواب دوں گا میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔

بس کے تمام مسافر اونگھ رہے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور سر کو سیٹ کی پشت سے ٹکا لیا۔ رات کے دو بج چکے تھے اور میرے اندازے کے مطابق ابھی گھنٹے بھر کا سفر باقی تھا۔ یہ گھنٹا ایک صدی بن کر گزرا۔ اب میں چوکنا بیٹھا تھا کیونکہ مجھے گاؤں سے کافی پہلے اترنا تھا۔ میری نگاہیں کھڑکی سے باہر لگی ہوئی تھیں۔ یہ بس جس سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ وہ سڑک اس پہاڑی کے دامن میں تھی جہاں سے میں پہلی بار فرار ہوا تھا اور جہاں صغرا گولی کا شکار ہو کر مجھ سے جدا ہوئی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد میں نے مطلوبہ جگہ پر بس رکوائی اور سلطان کے ساتھ نیچے اتر آیا۔ بس آگے بڑھ گئی۔ سلطان نے حیرت سے چاروں دیکھا پھر بولا۔ "یہ تو کہاں اتر گیا؟"

"یہاں سے تقریباً دس کلومیٹر کے فاصلے پر میرا گاؤں ہے۔" میں نے گہری سانس لے کر جواب دیا۔

"مگر یہاں اترنے کی کیا ضرورت تھی؟" اس نے برا سامنہ بنایا۔

"اس لئے کہ یہ بس میرے گاؤں نہیں جاتی بلکہ یہ اسی سڑک پر سفر کرتی ہوئی آگے چلی جاتی ہے اور میرا گاؤں اس طرف ہے۔" میں نے ہاتھ سے دائیں جانب اشارہ کیا۔

وہ کچھ بڑبڑایا تھا مگر آواز اتنی کم تھی کہ سنائی نہیں دیا اور کچھ میں نے دھیان نہیں دیا۔ میں اب فضاؤں میں بسی اپنائیت کو پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔ ماضی کے لمحات آنکھوں میں

گھوم رہے تھے مگر کرب کی کیفیت بھی بڑھتی جارہی تھی۔ اس لئے کہ میری پشت پر وہ پہاڑی تھی جس پر میں صغرا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہوا تھا اور میرے سامنے جنگل کا وہ حصہ تھا جہاں ان درندوں نے میری بہن کو قید کرکے اس پر زیادتی کی کوشش کی تھی۔

"کدھر جانا ہے؟ مجھے تو یہاں سے راستے کا پتا ہی نہیں چل رہا۔" سلطان کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"ہاں .... یہاں سے تمہیں پتا نہیں چلے گا۔ چلو ہمیں یہ جنگل کراس کرنا ہے۔"

میں نے دھیرے سے جواب دیا اور سڑک کراس کرکے جنگل کی طرف بڑھا۔ راستے میں میں نے سلطان کو بتایا کہ اسی جنگل میں وہ چھوٹا سا مکان ہے جہاں راجو اور اس کے ساتھیوں نے صغرا کو قید کیا تھا اور پیچھے والی پہاڑی پر اس نے میری بانہوں میں جان دی تھی۔ اب ہم اسی طرف بڑھ رہے تھے جہاں وہ مکان تھا۔ میں چیک کرنا چاہتا تھا کہ کیا وہ اب بھی راجو کا عیش کدہ ہے یا ویران ہو چکا تھا۔

جنگل بہت گھنا نہیں تھا آدھے گھنٹے کے بعد ہی ہم اس جگہ پہنچ گئے۔ مکان پر نیا رنگ و روغن ہو چکا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ مکان اب بھی راجو وغیرہ کے استعمال میں ہے۔ دروازے پر تالا پڑا تھا۔ میں نے تالا ہاتھ میں پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ اچھا خاصا مضبوط تالا تھا مگر نہ معلوم مجھ میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی کہ تالا دوسرے جھٹکے ہی میں میرے ہاتھ میں آگیا۔ میں نے ایک نگاہ سلطان پر ڈالی' وہ مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ حیرت تو خود مجھے بھی تھی مگر میں نے اپنی حیرت کو چھپالیا اور تالے کو کنڈی سے نکال کر دور پھینک دیا۔

اندر داخل ہوئے تو یوں محسوس ہوا جیسے ابھی ابھی کوئی وہاں سے اٹھ کر گیا ہے۔ توقع کے مطابق وہاں شراب کی بوتلیں' گلاس' سگریٹ کے خالی پیکٹ اور کھانے پینے کی کچھ چیزیں پڑی تھیں۔

"بالے .... یہاں کوئی تھا' ممکن ہے وہ زیادہ دور نہ گیا ہو اور واپس آجائے۔" سلطان نے سرگوشی کی۔

"ہوں ...." میں نے سر ہلا کر اس کے خیال کی تائید کی اور اسے دروازے پر ٹھہرنے کا اشارہ کر کے خود اندر چلا گیا۔ ایک کمرا اندر بھی تھا جسے بیڈ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ یہاں بھی عیاشی کے تمام لوازمات موجود تھے۔ میرا خون کھول اٹھا۔ راجو اب بھی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

جانے کس کس کی بیٹی اور کس کس کی بہن کو لوٹ رہا تھا۔ "راجو اب میں تجھے اس قابل نہیں چھوڑوں گا کہ تو............" میں زیر لب بڑبڑایا۔

بہرحال اس وقت اس مکان میں کوئی بھی نہ تھا۔ البتہ سلطان کا خیال صحیح ثابت ہو سکتا تھا کہ وہ لوگ ممکن ہے واپس آجائیں۔ اسی خدشے کے پیشِ نظر میں وہاں دیر تک نہیں رکا اور ہم دونوں باہر آگئے۔ سلطان نے اس اندھیرے میں بھی تالا تلاش کر لیا پھر تالے کو کنڈی میں اٹکا کہ ہم وہاں سے ہٹ گئے۔ تقریباً پندرہ بیس منٹ بعد ہی ہم گاؤں میں داخل ہو رہے تھے۔ پورا گاؤں سویا ہوا تھا۔ کبھی کبھی کسی کتے کے بھونکنے کی آواز گہری خاموشی کو چیر جاتی تھی۔ میں بیان نہیں کر سکتا اس وقت میری کیا کیفیت تھی میں جس طرح رات کے اندھیرے میں اس گاؤں سے فرار ہوا تھا اسی طرح گاؤں میں داخل ہو رہا تھا۔ یہاں کا چپہ چپہ میرا جانا بُوجھا تھا اس لئے اپنے گھر تک پہنچنے میں مجھے کوئی دشواری نہ ہوئی۔ دروازے پر تالا دیکھ کر میرا دل دھڑک اٹھا۔ میں ٹھٹک گیا۔ سلطان نے بھی حیرت سے پہلے دروازے کو پھر مجھے دیکھا۔

میں نے آگے بڑھ کر دھیرے سے دروازے کو دھکا دیا' وہ کھلتا چلا گیا اور دروازے کے چرچرانے کی آواز دور تک پھیلتی چلی گئی۔ اندر گہرا اندھیرا تھا میں نے ڈرتے ڈرتے اندر قدم رکھ دیا۔ بے پناہ تنہائی نے مجھے ہولا دیا تھا۔ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ میرا گھر ہے' میرا گھر جہاں زندگی کی تمام رنگینیاں اپنی تمام تر معصومیت کے ساتھ جھوما کرتی تھیں۔ رقص کیا کرتی تھیں۔ ابا کی آوازیں' اماں کے لہجے کا دھیما پن اور صغرا کی ہنسی کی آوازیں گونجا کرتی تھیں۔ وہاں گہری چپ کا راج تھا اور تنہائی چمگادڑوں کی طرح چھت سے لٹکتی محسوس ہوتی تھی۔

میں چند قدم آگے بڑھا تو کسی چیز سے ٹکرا گیا۔ وہ لالٹین تھی جس کے لڑھکنے کی آواز سے میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔ میں نے لپک کر لالٹین اٹھا لی۔ اسے ہلا کر دیکھا تو اس میں تیل موجود تھا۔ میں نے جلدی سے جیب سے ماچس نکالی اور لالٹین جلائی۔ لالٹین جلتے ہی ہمارے سائے' ہماری پشت کی جانب لمبے ہو کر دیواروں تک پھیل گئے اور بھڑکتے تھرکتے شعلے کی لَو آنگن میں عجیب عجیب سے سائے بنانے لگی۔ آنگن میں ابا کی لاٹھی' اماں کی چادر اور میرے بستر پر لگنے والی دری پڑی تھی۔ یہ تمام چیزیں گرد آلود تھیں۔ میں لالٹین لئے کوٹھری جانب بڑھا۔ سلطان بھی میرے پیچھے تھا۔ میں جیسے ہی کوٹھری میں داخل ہوا اچھل

پڑا۔ سامنے بچھی چٹائی پر اماں گٹھڑی بنی پڑی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے ہوئے تھے اور سر کو گھٹنوں کے درمیان چھپایا ہوا تھا۔ پہلی نظر میں وہ مجھے بے جان لگی تھی۔

"اماں............" میں تمام احتیاط بالائے طاق رکھ کر چیخ اٹھا اور اس کی طرف لپکا۔

"ہش............ چپ کر............ اس نے سن لیا تو وہ آجائے گا' اور صغرا کو بھی ایسے ہی لے جائے گا جیسے غلام رسول کی بیوی کو لے گیا ہے۔" وہ ایک دم بول اٹھی۔ اس کی ویران آنکھوں میں بلا کا خوف اور وحشت تھی۔ اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔ اس کے بالوں میں مٹی بھری تھی کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے اور ہاتھوں کی پشت پر خراشیں سی پڑی تھیں۔ میں بے اختیار رو دیا۔ "اماں............ دیکھ میں آیا ہوں............ میں ہوں اماں' تیرا بالا............ تیرا اپنا بالا ہوں اماں' میرا گلا گھونٹ دے' مجھے جان سے مار دے اماں' مجھ ایسے بزدل کا مر جانا ہی بہتر ہے کہ جو نہ باپ کو بچا سکا نہ بہن کو اور............ اور تجھے بھی زندہ درگور کر دیا۔" میں اس کے پیروں کو پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے مگر اماں تو خوفزدہ نگاہوں سے دروازوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"بالے............ تو نے سنا نہیں ماں نے کیا کہا ہے؟" سلطان نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "بالے ہوش میں آ............ خود کو سنبھال اور ماں کی بات دھیان سے سن' شاید وہ غلام رسول کی بیوی کو بھی لے گئے ہیں۔"

سلطان کی بات سن کر میں اچھل پڑا۔ میں نے واقعی اماں کی بات پر دھیان نہیں دیا تھا۔ میں تو اسے دیکھ کر پاگل ہو گیا تھا۔ "اماں............ کیا کہہ رہی تھی تُو............ کون لے گیا غلام رسول کی بیوی کو............ بول............" میں نے اماں کو دونوں کندھوں سے پکڑ لیا۔

"چپ کر جا رے............ ورنہ وہ میری بچی کو لے جائے گا۔ پہلے بھی لے گیا تھا نا............ بڑی مشکل سے لائی تھی میں اسے' نہ لاتی تو مار دیتا۔ پہلے بھی مار دیا تھا۔" وہ سرگوشی میں بول رہی تھی۔ یوں جیسے واقعی اسے ڈر ہو کہ کوئی سن لے گا۔

"اماں............ کون لے گیا اسے؟" سلطان نے قریب آکر سرگوشی میں پوچھا۔

"وہ لے گیا ہے............ راجو............ اس نے آنچل سے منہ کو باندھ دیا تھا۔ غلام رسول کو پتا ہی نہ چلا۔ میں............ میں یہاں آگئی۔ یہاں صغرا اکیلی تھی نا اس لئے............ ورنہ وہ اسے بھی لے جاتے۔"

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

میرا کلیجہ پھٹ گیا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اماں کی حالت پر چیخ چیخ کر روؤں مگر یہ وقت رونے کا نہیں تھا.......... غلام رسول میرا محسن تھا۔ وہ اس کی بیوی کو لے گیا تھا مجھے ہر حال میں اسے بچانا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اسے لے کر کہاں جائے گا۔ میں تو بچپن سے راجو کے ساتھ رہا تھا' اس کی نس نس سے واقف تھا۔ میں فوراً ہی کھڑا ہو گیا۔ "سلطان تو یہاں اماں کے پاس رک میں غلام رسول کے گھر جاتا ہوں۔"

"نہیں' میں بھی چلوں گا۔ اماں کو غلام رسول کے گھر چھوڑ دیں گے۔" وہ یہ کہتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

میں نے اس نازک وقت میں اس سے الجھنے کی کوشش نہیں کی اور دروازے کی طرف لپکا۔ سلطان اماں کو بڑی مشکل سے اٹھا سکا' اسے کہنا پڑا کہ صغرا' غلام رسول کے گھر اکیلی ہے۔ اسے اس کی حفاظت کے لئے وہیں رہنا چاہئے۔ تب کہیں جا کر وہ اٹھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ راستے میں اماں کوئی گڑبڑ کرے اور کسی کی آنکھ کھل جائے۔ اسی وجہ سے میں اسے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا مگر اماں پر طاری خوف نے اسے بولنے ہی نہ دیا۔ وہ راستے بھر ہم سے زیادہ محتاط رہی۔ غلام رسول کے گھر کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ میں دبے پاؤں اندر داخل ہوا۔

اماں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ غلام رسول کے خراٹے گھر میں گونج رہے تھے اور وہ بے خبر پڑا سو رہا تھا۔ میں اسے جگائے بغیر اس کوٹھری نما کمرے میں داخل ہو گیا جہاں دروازے کے کنڈے پر لالٹین لٹکی ہوئی تھی اور جو اس مکان کا واحد کمرہ تھا۔ توقع کے مطابق دو چارپائیاں پڑی تھیں جن میں سے ایک بستر تو ٹھیک تھا مگر دوسرے پلنگ پر سمٹی ہوئی چادر اور تکیے کی حالت سے پتا چلتا تھا کہ اس بستر پر یا تو کوئی تڑپا ہے یا شدید مزاحمت کی وجہ سے بستر شکن آلود ہوا ہے۔ مجھے اماں کی بات کا یقین ہو گیا تو میں غلام رسول کے بستر کے قریب آ گیا۔ سلطان اماں کو لئے اندر داخل ہوا تو میں نے اسے اندر سے دروازہ بند کرنے کا اشارہ کیا۔ اس نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا لی۔

میں نے دھیرے سے غلام رسول کا کندھا ہلایا۔ پہلے تو اس پر کوئی اثر نہ ہوا مگر دوسری مرتبہ ہلانے پر اس نے کسمسا کے آنکھیں کھول دیں۔ "کون ہے.......... کیا ہے؟" پھر وہ مجھے سرہانے کھڑا دیکھ کر اچھل پڑا۔ "کک.......... کون ہو تم؟" وہ ہکلایا۔ مگر دوسرے ہی

لمحے اس کی نگاہ سلطان پر پڑی۔ اس نے پلٹ کر پھر مجھے سرہانے کھڑا دیکھا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ بات سمجھ چکا ہے۔ وہ جان گیا ہے کہ سلطان کے ساتھ میں ہی ہوں۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور جھپٹ کر مجھے سینے سے لگا لیا۔ "ب.......... بالے.......... تُو.......... تُو آ گیا بالے.........." اس کی آواز بھرا رہی تھی۔

اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ روح فرسا خبر اسے کیسے سناؤں کہ راجو نام کا درندہ اس کی ناموس کو اٹھا کر لے گیا ہے اس کی نگاہ اپنی بیوی کے شکن آلود بستر پر پڑی۔ "سکینہ.......... سکینہ.........." اس نے آواز دی مگر جانے کیوں اس کے چہرے پر خوف سا پھیل گیا تھا۔ اس نے میری اور سلطان کی طرف دیکھا' ہم دونوں کے چہروں پر سنگین خاموشی نے اسے بوکھلا دیا۔ وہ ایڑیوں کے بل پورے گھر میں ناچ گیا۔ وہ مسلسل سکینہ کو آوازیں دے رہا تھا۔

"چپ کر جا غلام رسول.......... ورنہ وہ تجھے بھی لے جائیں گے۔" اماں کی سرگوشی نے فضا میں درد سا پھیلا دیا۔

"وقت نہیں ہے غلام رسول' وہ سکینہ کو لے گئے ہیں۔ خود کو سنبھال اور کوئی ہتھیار لے لے۔" سلطان نے اسے شانوں سے پکڑ کر کہا۔

اس کے منہ سے دبی دبی چیخ نکلی جسے اس نے فوراً ہی دبا لیا۔ دوسرے لمحے ہی اس کے چہرے پر سختی اتر آئی۔ آنکھوں میں شدید نفرت نے جال سا بُن دیا۔ وہ بھاگا ہوا کوٹھری میں چلا گیا جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

وقت واقعی بہت گزر چکا تھا۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا وہ لوگ کتنی دیر پہلے اسے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ میں نے اماں کو وہیں رکنے کو کہا اور اسے جھوٹی تسلی دی کہ میں صغرا کو لینے جا رہا ہوں اور پھر ہم تیزی سے باہر آ گئے۔ نہ معلوم کیوں مجھے یقین تھا کہ راجو سکینہ کو لے کر اسی جنگل والے مکان میں جائے گا۔ میں اسی طرف کو بھاگا۔ راستے میں سلطان نے غلام رسول کو بھی بتا دیا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ غلام رسول پر جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔ اس کی خاموشی خوفناک تھی اور میں جانتا تھا کہ اس خوفناک خاموشی کے بعد کیا ہوتا ہے۔

اب تقریباً صبح ہونے والی تھی گویا خطرہ بڑھتا جا رہا تھا میں راجو کو اسی اندھیرے میں پکڑنا چاہتا تھا ورنہ تو یہ گاؤں تھا یہاں لوگ صبح کاذب پر ہی اٹھ جاتے تھے اور میں چاہتا تھا کہ ہمیں کوئی اور نہ دیکھے۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مجھے اب کیا کرنا ہے۔ یہ میں سوچ چکا

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

تھا۔ تنہا راجو کو مار دینے سے میرے جذبہ انتقام کو تسلی نہ ہوتی' میں تو چوہدری کو بھی کتے کی موت مارنا چاہتا تھا۔ اس کے گھر کو آگ لگا دینا چاہتا تھا۔ اس کے کھیت کھلیان اور مویشی جلا دینا چاہتا تھا تب کہیں جا کر مجھے سکون حاصل ہوتا۔

ہم کسی نہ کسی طرح چھپتے چھپاتے اس مکان تک پہنچ گئے ہمارا اندازہ صحیح تھا۔ مکان سے چند گز کے فاصلے پر چوہدری کی جیپ کھڑی تھی۔ مکان کی کھڑکیاں بند تھیں مگر ان کے شیشوں اور جھریوں سے روشنی جھانک رہی تھی ہم دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھے۔

میں نے غلام رسول کو سمجھا دیا تھا کہ راجو پر گولی نہ چلائے۔ میں اسے اپنے ہاتھوں سے اذیت دے کر مارنے کی قسم کھا چکا ہوں۔ اس نے یہ بات سن کر بے بسی سے مجھے دیکھا اور پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اندر سے کسی عورت کے چیخنے کی آواز نے ہمیں لرزا دیا۔ چیخ ایسی کرب ناک تھی کہ جیسے اسے ذبح کیا جا رہا ہو۔ چیخ سن کر غلام رسول بے قابو ہو گیا۔ اس نے مجھے دھکا دیا اور لات مار کر دروازہ کھول دیا۔

وہ چار آدمی تھے۔ ایک آدمی سکینہ کے دونوں ہاتھ پکڑے اسے بے بس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سکینہ کی حالت ایسی تھی کہ مجھ سے دیکھا نہ گیا' اسے لوٹ لیا گیا تھا بلکہ اس پر بری طرح تشدد کیا گیا تھا۔ وہ چاروں ہمیں دیکھ کر اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ اسی لمحے غلام رسول کے ریوالور سے نکلی ہوئی گولی نے اس آدمی کو ڈھیر کر دیا جو سکینہ کو پکڑے ہوئے تھا۔

"کوئی حرکت نہ کرے ورنہ ...." میں نے گرج کر کہا۔

"تت .... تم کون ہو؟" راجو کی خوف زدہ آواز نکلی۔ اس کے دونوں ساتھیوں نے گھبرا کر ہاتھ اٹھا دیئے۔

"تمہاری موت۔" میں نے آگے بڑھ کر پستول کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔

اس لمحے گولی چلنے کی آواز نے ہم سب کو اچھلنے پر مجبور کر دیا۔ میں خود بھی گھبرا گیا تھا کہ کہیں گولی میرے پستول سے تو نہیں نکلی مگر ساتھ ہی گونجنے والی نسوانی چیخ نے مجھ پر سکتہ طاری کر دیا۔

غلام رسول کے ریوالور کی نال سے دھواں نکل رہا تھا اور وہ بت بنا سکینہ کو تک رہا تھا۔ جو مر چکی تھی۔

"یہ .... یہ تُو نے کیا کیا غلام رسول؟" سلطان نے اسے جھنجوڑ دیا۔

"اس نے .... منہ پھیر لیا تھا سلطان .... وہ اس قابل نہیں رہی کہ .... مجھ سے نگاہ ملا سکتی' اس کا زندہ رہنا بیکار تھا .... اس کا میرے سوا دنیا میں کوئی تھا ہی نہیں اور اب .... وہ .... میرے بعد کہاں جاتی .... وہ مرنا چاہتی تھی سلطان .... اس نے مجھ سے التجا کی تھی ...." وہ ایسے بول رہا تھا جیسے خواب میں بول رہا ہو۔ راجو کے دونوں ساتھیوں کے رنگ پیلے پڑ چکے تھے۔ میرا جی تو چاہا کہ اسی وقت ساری گولیاں راجو کی کھوپڑی میں اتار دوں مگر میں اسے آسان موت نہیں دینا چاہتا تھا۔

راجو خوف سے آنکھیں بند کیے ہوئے تھا اور اس کے دونوں ساتھی کھڑے گھگیا رہے تھے۔

"یہ .... کمینہ .... درندہ ...." غلام رسول' راجو کو گھورتا ہوا آگے بڑھا۔

"غلام رسول .... گولی مت چلانا ...." میں چیخا۔

سلطان اس کے پیچھے لپکا مگر اسی وقت ایک دھماکا ہوا راجو اور اس کے ساتھیوں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں اور راجو کے برابر میں کھڑا ہوا شخص سینہ پکڑے ہوئے فرش پر گرتا چلا گیا۔ راجو اور اس کا دوسرا ساتھی میرے قدموں میں گر گئے وہ کتوں کی طرح مجھ سے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے۔ راجو اب تک مجھے نہیں پہچانا تھا ورنہ وہ مجھے نام لے کر مخاطب کرتا۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں کون ہوں مگر غلام رسول پاگل ہو چکا تھا۔ وہ مجھے موقع نہیں دے رہا تھا۔ اس نے صرف چند منٹ میں تین زندگیوں کو ختم کر دیا تھا۔

سلطان نے اسے پکڑ کر ریوالور چھیننا چاہا۔

"خبردار' میرے قریب نہ آنا ورنہ میں ...." اس نے غرا کر ریوالور کا رخ سلطان کی جانب کر دیا۔

غلام رسول .... تُو نے وعدہ کیا تھا!" میں چیخا

"ہاں .... میں نے وعدہ کیا تھا .... مجھے یاد ہے اپنا وعدہ بالے ....؟" وہ خوابیدہ لہجے میں بولا مگر اب اس کی نگاہیں راجو کے تیسرے ساتھی کے چہرے پر جم گئی تھیں۔ "یہ سب تیرے مجرم بھی تو ہیں بالے ...."

"بالے ....!" راجو کے منہ سے سسکاری نکلی۔ وہ سر اٹھا کر مجھے دیکھ رہا تھا۔

"ہاں بالا ...." میں نے اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ کر کھڑا کر دیا۔ "تیری موت'

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

تیرے خاندان کی موت راجو.......... تیری وجہ سے جتنے بھی قتل ہوئے ہیں میں تجھ سے ہر قتل کا بدلہ لوں گا۔ میں قانون ہوں.......... میں عدالت ہوں.......... میں جج ہوں‘ گواہ ہوں‘ وکیل بھی میں ہوں راجو‘ آج تجھے تیرے سارے جرائم کی سزا ملے گی۔“

”بالے .... مم .... مجھے معاف .... میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں .... میں .... میں تجھے‘ سب کچھ دے دوں گا .... مجھے مت مارنا بالے ....“

وہ ہاتھ جوڑ کر گھگیانے لگا۔

”سب کچھ دے دے گا؟ سب کچھ .... ؟ صغرا .... ابا .... اماں .... سوہنی .... میرے گھر کی رونقیں‘ میری خوشیاں .... یہ .... یہ سکینہ بھی‘ اسے بھی زندگی دے دے گا تو؟“

”نہیں بالے‘ یہ موت تُو دے سکتا ہے مگر..........“ غلام رسول کی سرسراتی ہوئی آواز نکلی‘ پھر وہ راجو سے مخاطب ہوا۔ ”راجو اب میری باری ہے چھوٹے چوہدری‘ تُو نے گاؤں کی ہر لڑکی کی معصومیت چھین لی‘ اب تجھ سے تیری زندگی چھن جائے گی راجو‘ پھر بھی قرض ادا تو نہیں ہوتا‘ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ میں تیری بہن کو اٹھا کر یہاں لاتا اور تیرے سامنے اس کے بدن کی بوٹی بوٹی کاٹ کر تیرے آگے پھینکتا مگر کیا کروں کہ میں انسان ہوں ایسا سوچ بھی لوں تو کلیجہ پھٹنے لگتا ہے‘ تیری طرح کتا ہوتا تو یہ کر گزرتا۔“

”نہیں غلام رسول‘ مجھے معاف کر دے‘ میں .... میں اسے نہیں لایا تھا۔“ اس نے گھگیا کر سکینہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ لوگ لائے تھے۔“ اس نے اپنے ساتھیوں پر الزام لگایا۔

”میں .... میں نہیں لایا۔“ راجو کے دوست نے روتے ہوئے کہا جو اب بھی خود کو راجو کے پیچھے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس کی آواز سنتے ہی غلام رسول نے ریوالور والا ہاتھ سیدھا کیا اور گولی چلا دی۔ وہ ایک دل خراش چیخ کے ساتھ سامنے رکھی ٹیبل پر اوندھا گیا۔ راجو بری طرح رونے لگا تھا۔

”غلام رسول ....“ میں پھر چیخا‘ مجھے خدشہ تھا کہ وہ راجو کو بھی مار دے گا۔

سلطان نے اس کے دونوں بازو پیچھے سے پکڑنے چاہے مگر وہ مچھلی کی طرح اس کی گرفت سے نکل گیا اور اس نے چیخ کر اسے قریب آنے سے منع کیا۔

”مجھے بچالو .... بچالو مجھے‘ یہ مار دے گا۔“ راجو نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”نہیں چوہدری‘ میں بالے سے وعدہ کر چکا ہوں‘ میں تجھے نہیں ماروں گا۔ تجھے مُردہ دیکھنے کی شاید مجھے حسرت ہی رہ جائے۔“

میں نے سلطان کو آنکھ سے اشارہ کیا کہ وہ پیچھے سے اسے قابو کرنے کی کوشش کرے۔ سلطان غیر محسوس انداز میں اس کی پشت کی جانب سرکنے لگا۔ میں نے اسے باتوں میں لگانا چاہا مگر لمحوں میں وہ سب کچھ ہو گیا جس کا کسی کو گمان بھی نہ تھا۔ غلام رسول نے ریوالور کی نال کنپٹی پر رکھ کر ٹرائیگر دبا دیا تھا۔ خون کا فوارہ اُچھلا اور وہ زمین پر ڈھیر ہوتا چلا گیا۔

ہم سب کے منہ سے بیک وقت چیخ نکلی اور پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ سلطان اس کی طرف لپکا‘ اس نے نبض دیکھی دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کرنے لگا مگر اب سب کچھ بیکار تھا۔ میں جانتا تھا کہ غلام رسول جیسا غیرت مند آدمی اب زندہ رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اب اس چھوٹے سے کمرے میں پانچ لاشیں پڑی تھیں۔ پورے کمرے کے فرش پر خون بہہ رہا تھا۔ راجو کی حالت بری تھی۔ سلطان پر بھی سکتہ طاری تھا حالت تو میری بھی .... بہت بری تھی‘ خون دیکھ کر میرا جی متلا رہا تھا مگر حالات ایسے نہیں تھے کہ میں بھی ہوش کھو بیٹھتا۔ اب تو مجھے راجو کی طرف سے خطرہ ہو گیا تھا۔ وہ جان بچانے کے لئے کچھ بھی کر سکتا تھا اس لئے میں نے اپنی نگاہیں اس کے زرد چہرے پر جما دیں۔ وہ آنکھیں مونڈے جھوم رہا تھا اور پھر وہ بھی کسی لاش ہی کی طرح ڈھیر ہو گیا۔ وہ شاید بے ہوش ہو چکا تھا اور یہ بہتر ہی ہوا تھا ورنہ اسے قابو کرنے میں مشکل بھی پیش آ سکتی تھی۔ سلطان ابھی تک دم بہ خود کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کیا تو وہ چونک اٹھا۔

”سلطان‘ کوئی رسّی تلاش کرو۔“

”کک .... کیوں؟“ وہ اس انداز میں بولا جیسے کسی نے اسے سوتے سے جگا کر کچھ کہا ہو۔

”اسے باندھوں گا‘ یہ بے ہوش ہو چکا ہے۔“

تب وہ ہوش میں آ گیا۔ اس نے لاشوں کو ایک نظر دیکھا اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔ چند لمحوں بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں نائیلون کی ڈوری تھی۔ میں نے راجو کے ہاتھ پاؤں باندھے اور اسے کندھوں پر ڈال لیا۔ ”چلو!“ میں نے سلطان سے کہا جو قریب بیٹھا

خلاؤں میں گھور رہا تھا۔

"کک .... کہاں؟" وہ چونکا۔

"میں نے تجھ سے کہا تھا کہ میرے ساتھ نہ آ۔" میں نے جھنجلا کر جواب دیا۔

میری بات سن کر اس نے خود کو فوراً ہی نارمل کر لیا۔ "میں نے پوچھا ہے کہاں جانا ہے؟ یہاں کوئی ٹھکانہ ہے تیرے پاس؟"

"میں اسے اسی غار میں لے جاؤں گا جس غار میں تم لوگوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہاں ایک وہی محفوظ جگہ ہے مگر تُو وہاں نہیں رہے گا بلکہ تجھے واپس گاؤں آنا ہو گا۔"

"کیوں ....؟"

"تُو یہاں سے ماں کو لے کر دوسرے گاؤں جائے گا وہاں ماسی میراں کا بھائی رہتا ہے۔ ماں کو اس کے پاس چھوڑ کر تُو چاہے شہر چلے جانا۔"

"مجھ سے بکواس نہ کرنا۔ میں یہاں واپس آؤں گا۔" اس نے غصے سے جواب دیا۔

"اچھا اب یہاں سے تو چل' سویرا ہونے لگا ہے' روشنی ہو گئی تو ہم کسی کی نظروں میں بھی آ سکتے ہیں۔"

ہم دونوں باہر نکلے آسمان کے کنارے سرمئی ہو گئے تھے' ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور پن چکی کی گھوں گھوں گونج رہی تھی۔ گویا لوگ جاگنے لگے تھے۔ میں اور سلطان تیز قدموں سے پہاڑ کی طرف چل دیئے جو یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ راجو بہت بھاری تھا' میری سانس پھول رہی تھی۔ پسینہ گُدی پر رینگ رہا تھا مگر میں جانتا تھا کہ اگر میں نے رفتار ہلکی کی تو مصیبت میں پڑ سکتا ہوں' میں روشنی ہونے سے پہلے پہلے غار تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہی ہم غار تک پہنچ گئے۔ غار میں داخل ہونے سے پہلے ہی میری نگاہ اس جگہ پر پڑی جہاں میں نے صغرا کی قبر بنائی تھی مگر وہاں اب ایک گڑھا تھا اور بس۔ اس گڑھے پر نگاہ پڑتے ہی نفرت اور غصے کی لہر نے مجھ میں آگ سی لگا دی۔ دکھ سے میری آنکھیں دھندلا گئیں اور میں نے راجو کو زمین پر پٹخ دیا۔ اس کے منہ سے کراہ نکلی وہ تڑپا اور ہوش میں آ گیا۔

"راجو' کتے' یہ دیکھ .... یہ میری بہن کی قبر تھی' یہاں اس کا مُردہ جسم دفن تھا مگر تو نے اور تیرے باپ نے اس کے مُردہ جسم کو بھی نہیں بخشا' اب میں تجھے اس قبر میں زندہ دفن کر دوں گا۔"

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"نن .... نہیں۔"

"حرامزادے .... میں تیری بوٹیاں کاٹ کاٹ کر تیرے باپ کو بھیجوں گا۔ اسے یہاں بلواؤں گا' اس کے سامنے تیرے زندہ جسم کو اس قبر میں اتاروں گا کتے! تیرے گھناؤنے جرائم کی سزا ایسی دوں گا کہ تیری نسلیں رہتی دنیا تک حکمرانی سے توبہ کر لیں گی۔" یہ کہتے ہوئے میں نے دو تین لاتیں اس کی پسلیوں میں ماریں۔ وہ بلبلا کر چیخنے لگا تھا۔

"یہاں تجھے بچانے والا کوئی نہیں ہے درندے ...." میں نے ایک زوردار لات اس کی کمر پر دے ماری۔

"پپ .... پانی' پانی ...." وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بڑبڑایا۔ اس کی آنکھیں چڑھ گئی تھیں اور رنگ بالکل سفید ہو رہا تھا۔

سلطان نے میری طرف دیکھا۔

"اسے پانی پلا دو سلطان' اسے مرنے نہیں دینا ہے۔" میں نے اپنی پیشانی سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔

وہ سر ہلا کر باہر نکل گیا تو مجھے خیال آیا کہ ہمارے ساتھ پانی یا کھانے کی کوئی چیز بھی نہیں اور ابھی یہاں معلوم نہیں کب تک رہنا پڑے' ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ سلطان ایک بالٹی میں پانی لے آیا۔ مجھے حیرت ہوئی تب سلطان نے بتایا کہ بالٹی اور کچھ دوسرا سامان یہاں موجود ہے جسے راجہ وغیرہ نے ایک گڑھا کھود کر اس میں چھپا دیا تھا اور اس گڑھے پر گھاس پھونس ڈال دی تھی۔ وہ ایسی تمام جگہوں پر جہاں اسے کبھی قیام کرنا پڑا تھا' ایسا انتظام رکھتا تھا کہ کسی وقت ضرورت پڑنے پر وہ ٹھکانہ استعمال کیا جا سکے۔ بہرحال میں نے سلطان سے کہہ دیا کہ وہ فوری طور پر گاؤں واپس جائے اور اس سے پہلے کہ راجو کی عیاشی گاہ پر ہونے والے ہنگامے کی اطلاع کسی کو ملے کچھ کھانے پینے کی چیزیں اور غلام رسول کے گھر سے کمبل وغیرہ لے آئے۔ میں نے اسے کہا تھا کہ وہ ماں کو بھی یہاں لے آئے تاکہ یہاں سے فرار ہوتے ہوئے وہ دوبارہ گاؤں میں نہ رہ جائے۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ ضرورت کا سامان منگوانے کے بعد اسے سلطان کے چک نمبر ستاون بھیج دوں گا جہاں ماسی میراں کا بھائی رہتا تھا

سلطان نے راجو کو پانی پلایا اور خود گاؤں چلا گیا۔ میں نے راجو کو غار کے ایک تاریک کونے میں ڈال دیا اور خود گھوم پھر کر غار کا جائزہ لیا۔ لگتا تھا جیسے ہمارے اور راجہ کے فرار کے

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

بعد پولیس نے وہاں چھاپہ مارا کیونکہ جگہ جگہ فرش پر چائے کے مگے ٹوٹے پڑے تھے ایک کیتلی بھی پڑی تھی اور لگتا تھا جیسے اسے کسی نے ٹھوکر ماری ہو۔ وہ ایک طرف سے پچکی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اٹھالیا اور ایک پتھر سے اسے ٹھونک ٹھونک کر قابلِ استعمال بنالیا۔ مجھے یقین تھا کہ سلطان ضرورت کی چیزوں میں چائے کا سامان اور سگریٹ بھی لائے گا۔ مجھے چائے اور سگریٹ کی شدت سے طلب ہو رہی تھی۔ البتہ بھوک کا احساس جیسے ختم ہو گیا تھا۔ تھکن کی وجہ سے میرے بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور پھر راجو جیسے گینڈے کو اٹھا کر لانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اب وہ غار کے اندھے کونے میں خاموش پڑا تھا۔ میں نے بکھری ہوئی گھاس جمع کر کے بستر بنایا اور اس پر لیٹ گیا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی سلطان آگیا۔ ماں اس کے ساتھ تھی مگر وہ بہت سہمی ہوئی تھی۔ سلطان نے مضبوطی سے اس کا بازو پکڑا ہوا تھا جسے وہ مسلسل چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ سلطان کے دوسرے ہاتھ میں ایک بڑی ٹوکری اور کندھے پر کمبل اور کھیس تھا۔

”پکڑا اسے بڑی مشکل سے یہاں لایا ہوں اور غلام رسول کے گھر سے جو بھی سامان ملا لے آیا ہوں۔ اس کے ساتھ بازار جانا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔“

میں نے لپک کر ماں کو تھام لیا۔ ”اماں .... اماں دیکھ مجھے‘ میں بالا ہوں‘ تیرا بیٹا بالا .... مجھے پہچان اماں ورنہ .... ورنہ میں مرجاؤں گا۔“ میں رو دیا۔

اماں کے چہرے سے خوف کچھ کم ہو گیا۔ وہ مجھے غور سے دیکھنے لگی۔ ”مگر بالا تو صغرا کو لینے گیا ہے۔ آجائے گا وہ۔ دیکھ لینا تو‘ وہ ضرور آئے گا۔ بڑا جی دار ہے وہ‘ وہ آئے گا تو پوری بستی کو آگ لگا دے گا۔“

”ہاں اماں .... میں .... میں پوری بستی کو آگ لگا دوں گا‘ میں بالا ہوں اماں‘ میں صغرا کو تو واپس نہیں لا سکتا اماں مگر ان درندوں کو میں تباہ کر دوں گا جنھوں نے تجھ سے تیری خوشیاں چھین لیں۔ آ .... ادھر آ اماں‘ دیکھ‘ یہ .... یہ ہے وہ درندہ جس نے تجھ سے تیرا سہاگ چھین لیا تھا جس نے تیری پھول سی بیٹی کو مٹی کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا تھا اماں‘ اور جس نے مجھ کو دربدر کر دیا تھا۔ میں اسے زندہ دفن کر دوں گا ماں‘ میں ایسا انتقام لوں گا کہ دنیا یاد کرے گی۔“

وہ بڑے غور سے راجو کو دیکھ رہی تھی جو خوفزدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”ہاں .... ہاں .... یہ ہی تو ہے ....“ ماں دھیرے سے اس کے قریب بیٹھ گئی۔ ”یہ راجو ہے‘ بالے ... . یہ راجو ہے۔“ وہ ایک دم چیخ اٹھی‘ لگتا تھا جیسے اسے ایک دم ہوش آگیا ہو۔ وہ پلٹی۔ اس نے قریب پڑا پتھر اٹھایا اور اس سے پہلے کہ میں یا سلطان اسے پکڑتے‘ اس نے پتھر سے راجو کا منہ کچل دیا۔ راجو کی دلخراش چیخوں سے پورا غار چیخ اٹھا۔ میں نے اور سلطان نے اپنی پوری طاقت لگا دی تب اماں کو گھسیٹ کر دور لا سکے‘ نہ معلوم اس کمزور سی عورت میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی۔

راجو بری طرح زخمی ہو چکا تھا۔ اس کے ہونٹ پھٹ چکے تھے اور ان سے خون بہہ رہا تھا‘ ناک کے دونوں نتھنوں میں بھی خون بھر گیا تھا۔

”مار دے اسے .... مار دے ورنہ یہ صغرا کو اٹھا کر لے جائے گا۔ مار دے اسے!“ اماں مچل کر چیخی‘ وہ ہماری گرفت سے نکلنے کے لئے زور لگا رہی تھی۔

”اماں‘ صغرا مر چکی ہے۔ مر چکی ہے وہ‘ ایک ایسی آس کیوں لگائے بیٹھی ہے جسے کبھی پورا نہیں ہونا۔ اماں ہوش میں آ ....“ میں چیخا اور اس کے سینے سے لگ کر رو دیا۔

تب اسے سکتہ سا ہو گیا۔ وہ ایک دم نڈھال ہو گئی۔ اس نے اپنی بے نور اور ویران آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ ”وہ مر چکی ہے؟“ اس کی سرگوشی گونجی۔

”ہاں اماں وہ مر چکی ہے۔ وہ کبھی واپس نہیں آئے گی‘ اور .... سوہنی بھی مر چکی ہے‘ بابا بھی مر چکا ہے اماں .... بس تیرا یہ بدنصیب بیٹا زندہ ہے صرف اس لئے کہ ان کتوں سے اپنے باپ‘ اپنی بہن اور سوہنی کا انتقام لے سکے۔ اماں اگر تو ہوش میں نہ آئی .... تو میں کیا کروں گا‘ میرا تو اب تیرے سوا کوئی بھی نہیں ہے کوئی بھی نہیں اماں۔“

اس نے دھیرے سے میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ”تو بالا ہے نا .... تو میرا بیٹا ہے۔ تو تو زندہ ہے نا؟“

اور میں خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس نے پہلی بار مجھے مخاطب کیا تھا‘ زمانوں بعد میں نے اماں کے منہ سے اپنا نام سنا تھا‘ میں نے اسے خوب پیار کیا اس کے بکھرے ہوئے سفید بالوں کو سمیٹا اور اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں بھر کر دیکھتا رہا اس کے چہرے کی وہ نرماہٹ‘ وہ ممتا کی چمک ماند پڑ چکی تھی اور اس کی جگہ دکھوں کا گہرا سایہ تھا جس نے اس کے چہرے کو ہی نہیں بلکہ اس کے پورے جسم کو لپیٹ رکھا تھا۔ وہ بھی مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

اچانک اس کی نگاہوں میں پہچان کی روشنی پھیل گئی۔ "بالے!" اس کے لرزتے ہونٹوں سے سسکاری نکلی اور وہ چیخ مار کر مجھ سے لپٹ گئی۔ "بالے' بالے میں تجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی تھی بالے' میرا سب کچھ اجڑ گیا پتر............ سب کچھ ختم ہو گیا۔ تو کہاں چلا گیا تھا............ کیوں چھوڑ گیا تھا مجھے۔" وہ مسلسل دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی' میں نے اسے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی' یہ درد اس میں جانے کب سے بھرا تھا اس کا نکل جانا ہی بہتر تھا۔ وہ جانے کتنی دیر تک روتی رہی' اور اس کے بہتے ہوئے آنسو میرے وجود میں چنگاریاں بن کر گرتے محسوس ہوتے رہے۔

کافی دیر کے بعد اس کا جی ہلکا ہوا تو میں نے سلطان سے پوچھا کہ اب اس کا کیا پروگرام ہے۔ یہ سن کر اس نے کہا کہ میں اس کے بارے میں اماں سے مشورہ کروں۔ بات صحیح بھی تھی اب اماں سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کے قابل تھی۔ میں نے جب اسے اپنے پروگرام کے بارے میں بتایا تو اس نے مجھے چھوڑ کر کہیں بھی جانے سے انکار کر دیا' وہ مجھ سے جدا ہونے پر میرے ساتھ مرجانے کو ترجیح دیتی تھی۔ میں سنگین انجام کے بارے میں جانتے ہوئے بھی مجبور ہو گیا۔ اب دن چڑھ آیا تھا۔ سلطان نے ایک کونے میں بنے گڑھے میں لکڑیاں ڈال کر آگ جلائی اور کیتلی میں پانی رکھ دیا۔ پھر وہ کہیں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد دوبارہ غار میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں تین بڑے مگ تھے یہ مگ میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا اس وقت جب میں پہلی بار اسی غار میں راجہ وغیرہ سے ملا تھا۔

ہم نے چائے پی ساتھ پاپے کھائے جو سلطان غلام رسول کے گھر سے لایا تھا۔ اس دوران میں سوچتا رہا کہ اب میں چوہدری کو کس طرح حویلی سے باہر لاؤں۔ پہلے تو میرا خیال تھا کہ میں راجو کے بدن کے ٹکڑے کاٹ کر اسے بھیجوں اور اسے چوہے کے بل سے نکلنے پر مجبور کروں گا مگر یہ خطرناک ہو سکتا تھا۔ یہ کام میں سلطان سے نہیں کرانا چاہتا تھا یہ کام میں خود کرنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ بہت جلد انہیں راجو کے اغوا اور اس کے مکان پر ہونے والے قتل کا پتا چل جائے گا۔ میں چاہتا تھا کہ میں اس کی بے چینی اور اس کے کرب کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں مگر کیسے؟ میں کافی دیر تک یہی سوچتا رہا۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں ماں کی طرف پلٹا جو بڑے پیار سے مجھے تک رہی تھی۔

"اماں............ کیا تُو پہلی نگاہ میں مجھے پہچان گئی تھی؟"

"آں............ نہیں' اگر تُو مجھے نہیں بتاتا تو شاید............"

"کیوں............ مجھ میں ایسی کیا تبدیلی آئی ہے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"تُو............ تُو بہت صحت مند ہو گیا ہے پتر' لمبا چوڑا لگنے لگا ہے۔ پہلے تیرا چہرہ پتلا سا تھا مگر اب' اب چوڑا ہو گیا ہے پھر یہ تیری داڑھی............ اور حلیہ............ کپڑے............"

"گویا اگر میں گاؤں جاؤں تو لوگ مجھے بالے کی حیثیت سے نہیں پہچانیں گے؟"

"نہیں پترا نہیں تو گمان بھی نہ ہو گا کہ بالا دوبارہ دنیا میں آ سکتا ہے۔ چوہدری نے گاؤں والوں کو بتایا تھا کہ بالا پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔ حوالدار نے بھی چوہدری کو یہی بتایا تھا۔"

"اوہ یہ تو بہت اچھا ہوا۔"

"تو کیا چاہتا ہے بالے!" اس نے پُر تشویش انداز میں میری طرف دیکھا۔

"میں گاؤں جانا چاہتا ہوں' میں چوہدری کے کرب کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں اماں' میں اسے پاگل کتوں کی طرح اپنے بیٹے کی تلاش میں گھومتا دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں بالے............ نہیں وہ اگر پہچان گیا یا اسے شک ہو گیا تو............"

"نہیں اماں ایسا نہیں ہو گا۔" میں نے کھڑے ہوتے جواب دیا۔ "تُو کچھ دیر بعد دیکھنا مجھے پہچانے گی بھی نہیں۔" میں نے کہا اور اپنا تھیلا اٹھا کر غار سے باہر نکل آیا۔

اس تھیلے میں میں نے ایک پینٹ شرٹ اور سوئیٹر بھی رکھ لیا تھا جو اس وقت میرے کام آ سکتا تھا۔ یہ شہر کی نشانی تھی۔ میں نے کپڑے بدلے اور جب دوبارہ غار میں داخل ہوا تو ماں دیکھ کر مجھے اچھل پڑی۔

"بب............ بالے تُو تو کوئی افسر لگ رہا ہے۔"

"میں نے کہا تھا نا کہ............"

"مگر بالے' تیرا جانا خطرناک ہو سکتا ہے' تیرا اجنبی ہونا بھی انہیں شک میں ڈال سکتا ہے۔ خاص طور پر ان حالات میں کہ راجو کی عیاش گاہ پر اس وقت پانچ لاشیں پڑی ہیں جو کچھ دیر بعد دریافت ہو جائیں گی اور وہ لوگ گاؤں کی ناکہ بندی بھی کر سکتے ہیں۔ تُو اپنے اس پلان کو ذہن سے نکال دے۔ اس کو مار کر اس کی لاش بھی وہیں پھینک دے اور یہاں سے نکل چل ورنہ کسی مصیبت میں پھنس جائے گا۔" سلطان نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"سلطان! میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں خطرات سے کھیلنے جا رہا ہوں' تو اپنا راستہ لے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

اب بھی وقت ہے تُو اماں کو لے کر شہر چلا جا' میں اپنے سینے کی آگ بجھا کر وہاں پہنچ جاؤں گا۔" میں نے غصے میں جواب دیا۔

"بالے!" وہ غرایا۔ "اب میں اماں کا لحاظ بھی نہیں کروں گا جبڑا توڑ دوں گا تیرا۔ اسے بھول جا کہ میں تجھے یہاں اکیلا چھوڑ جاؤں گا یا تو تُو بھی میرے ساتھ شہر چلے گا یا پھر بھی تیرے ساتھ مروں گا سمجھا تُو؟"

"نہ پُتر ایسا نہ کر.........." اماں نے سلطان سے کہا اور پلٹ کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "بالے یہ تیرا یار ہے پُتر' اور میں تیری ماں ہوں ہم میں کوئی بھی تجھے تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ جیسا تیرا جی چاہے کر' میں تیرے ساتھ ہوں پُتر اللہ بیلی ہے اگر تُو واپس نہ آیا تو.......... تو میں اس کتے کی لاش گھسیٹتی ہوئی حویلی تک لے جاؤں گی۔ انتقام تو مجھے بھی لینا ہے چوہدری سے۔"

اماں کی بات سن کر میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ سلطان کچھ بڑبڑایا تو تھا مگر میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ بہرحال میں طے کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مجھے رات کا انتظار تھا۔ دن میں یہاں سے جانا اور پھر یہیں آنا دشوار تھا اس لئے میں اطمینان سے بیٹھ گیا۔ راجو یا تو بے ہوش تھا یا پھر خوف کی وجہ سے گم ضم ہو چکا تھا۔

سلطان جو سامان لایا تھا اس میں کدو کی بھاجی اور روٹیاں بھی تھیں۔ اماں نے بھاجی گرم کی اور ہم تینوں نے مل کر کھانا کھایا۔ اماں نے مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا تھا اور میں بے حد خوش تھا مجھے یقین نہیں تھا کہ اب ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ میں اماں کے ہاتھوں سے کھانا کھاؤں گا۔ اس کے دیئے ہوئے نوالے کے ساتھ مجھ میں اطمینان اور بے پایاں خوشی اتر رہی تھی مگر اس کے ساتھ نہ معلوم دل کے کسی گوشے میں یہ خوف بھی کلبلا رہا تھا کہ شاید اماں کے ہاتھوں سے یہ نوالے میرے آخری نوالے ہوں۔ میں جو کچھ کرنے کا عزم کئے ہوئے تھا اس کا انجام صرف اور صرف موت تھی۔ سلطان میری بات سمجھ نہیں رہا تھا' میں چاہتا تھا کہ میں ہر صورت میں اماں کو یہاں سے ہٹا دوں تاکہ موت کا یہ جال اسے اپنی لپیٹ میں نہ لے سکے مگر اماں اور سلطان کی ضد نے مجھے بے بس کر دیا تھا۔

دن عذاب بن کر گزرا۔ سرِ شام اماں کو نیند آ گئی' میں اسی پل کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے سلطان کو اشارہ کیا اور غار سے باہر نکل آیا۔ سلطان میرے پیچھے باہر آ گیا تو میں نے اسے بتایا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ میری پوری بات سن کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ "بالے.......... کیا.......... یہ تُو کر

سکے گا؟" اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"سلطان' میں اس سے بھی زیادہ کر سکتا ہوں' اگر تُو میری جگہ ہوتا اور وہ سب کچھ تیرے ساتھ ہوا ہوتا جو میرے ساتھ ہوا ہے تو تُو مجھ سے بڑا درندہ بن چکا ہوتا۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا بس تھوک نگل کر غار کی طرف پلٹ گیا۔ میں بھی دبے پاؤں اندر داخل ہوا' میں نہیں چاہتا تھا کہ اماں جاگ جائے' وہ عورت تھی اور عورت کا دل کمزور ہوتا ہے' ممکن ہے مجھے وہ سب نہ کرنے دیتی جو میں کرنے والا تھا۔ میں اور سلطان اس اندھیرے کونے کی طرف بڑھے۔ راجو ہوش میں تھا مگر بھوک پیاس اور زخموں کی وجہ سے بری طرح نڈھال تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں التجا لہرائی' لمحہ بھر کو میرا دل ڈولا' مجھ میں چھپی انسانیت نے پلکیں جھپکیں مگر میں نے فوراً ہی راجو کی دونوں کنپٹیاں اپنے انگوٹھے سے دبا دیں۔ ایسا کرنے سے پہلے میں نے اپنی آنکھیں موند لی تھیں۔ وہ بہت جلد بے ہوش ہو گیا۔ میں نے اسے پلٹ کر اس کے بندھے ہوئے ہاتھ کھولے' اس کی نبض چیک.......... کی جو ہلکی رفتار سے چل رہی تھی۔ پھر میں نے اپنے تھیلے میں سے تیز دھار والا چھُرا نکالا' جو میں اپنے ساتھ لایا تھا۔

سلطان خاموشی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں اس سے نگاہیں چرا رہا تھا۔ میں نے راجو کا وہ ہاتھ سامنے فرش پر رکھ دیا جس میں اس نے سونے کی موٹی سی انگوٹھی پہنی ہوئی تھی اور پھر سلطان کو اشارہ کیا' سلطان نے اپنے کاندھے سے چادر اتار کر اسے لپیٹا اور راجو کے منہ پر رکھ کر اس پہ اپنا ہاتھ جما دیا اور پھر.......... وہ لمحہ بھر کو تڑپا اور دوسرے ہی لمحے اس کی دو انگلیاں ہاتھ سے الگ ہو گئیں۔ میں پسینے میں نہا چکا تھا۔ میں نے جلدی سے اس کے ہاتھ اور کٹی ہوئی انگلیوں پر مٹی ڈال دی۔ سلطان نے فوراً ہی اپنی چادر سے ایک پٹی پھاڑ دی اور راجو کے زخمی ہاتھ پر کس کے باندھ دی۔

یقین کیجئے ایسا کرتے ہوئے میں اندر سے لرز گیا تھا مگر انتقام کا جذبہ بڑا خوفناک اور خونی ہوتا ہے یہ انسان کو پاگل کر دیتا ہے اور میں بھی پاگل ہو چکا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد میں نے اس کی دونوں انگلیوں کو ایک کپڑے میں لپیٹا' پھر پولتھین بیگ میں باندھا اور اپنی پینٹ کی جیب میں چھپا لیا۔ اماں ابھی تک بے خبر سوئی ہوئی تھی۔ سلطان کا چہرہ سپاٹ تھا۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اپنی چادر سے پسینے کو صاف کرنے لگا۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

اچانک سلطان اٹھا اس نے مگ میں پانی بھرا اور راجو کے خشک ہونٹوں پر ٹپکانے لگا مگر وہ اب بھی بے ہوش تھا۔ میں نے سلطان کو منع نہیں کیا مگر میں اٹھ کر غار سے باہر آ گیا۔

پرندے شور مچاتے ہوئے گھروں کو واپس آ رہے تھے۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ دور گاؤں میں جلنے والے چراغوں کی روشنی یہاں نظر آ رہی تھی۔ میرا سارا دھیان اس طرف تھا جہاں راجو کی عیاش گاہ تھی۔ میرا خیال تھا کہ اب تک وہاں ہونے والے قتل کی اطلاع پولیس کو ہو چکی ہو گی مگر وہاں مجھے ایسے کوئی آثار محسوس نہیں ہوئے شاید اس لئے کہ وہاں سے یہاں تک کافی فاصلہ تھا اور درمیان میں جھاڑیاں اور اونچے نیچے درخت بھی تھے اور اس کے بعد گنے کے کھیتوں کا سلسلہ بھی کافی طویل تھا۔ میں کچھ اور اندھیرے کا منتظر تھا اور میں اس طرف سے گاؤں میں داخل ہونا چاہتا تھا جس طرف نہر تھی اور نہر کی دوسری سمت تقریباً بیس کلومیٹر پر چک نمبر ستاون تھا۔ اس سمت سے جانے میں یہ فائدہ تھا کہ اگر کوئی دیکھ بھی لیتا تو یہی سمجھتا کہ میں چک نمبر ستاون سے آ رہا ہوں کیونکہ نہر کے ساتھ ایک کچی سڑک بھی تھی جہاں سے لاریاں گزرتی تھیں جو چک ستاون سے آتی تھیں۔

میں باہر ہی ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ تقریباً گھنٹے بعد ہی ملگجا اندھیرا پھیل گیا۔ تب میں نے اندر جا کر سلطان کو بتایا کہ میں جا رہا ہوں پھر اس کا جواب سنے بغیر بڑی احتیاط سے پہاڑی سے اترنے لگا۔ پون گھنٹے بعد ہی میں شہر کے پاس والی سڑک پر پہنچ گیا۔ میں نے یہاں تک پہنچنے کے لئے وہ راستہ اختیار کیا تھا جہاں راستے میں کہیں کوئی پن چکی یا کھیت نہیں آتا تھا ورنہ میں کسی کی نظر میں آ سکتا تھا۔ اب تک مجھے راستے میں کوئی نہیں ملا تھا جس وجہ سے میں کافی پُر اعتماد ہو کر گاؤں میں داخل ہوا۔ میں نے اپنی چال ڈھال کو بالکل بدل لیا تھا۔ میں کسی ایسے اجنبی کا کردار ادا کر رہا تھا جو پہلی بار گاؤں میں آیا ہو۔ آتے ہی میں نے اپنا تھیلا بھی کندھے پر ڈال لیا تھا جس میں صرف ایک جوڑا کپڑوں کا تھا اور ایک جوڑی چپل تھے۔ ٹوتھ برش اور پیسٹ تھا۔

پندرہ بیس منٹ بعد ہی میں ایک ہوٹل پر پہنچ گیا۔ یہ ہوٹل پہلے کریم داد کا تھا جسے میں چاچا کریم کہا کرتا تھا مگر اس وقت چاچا کریم داد کی جگہ ایک اور موٹا سا شخص بیٹھا تھا جو میرے لئے اجنبی تھا اور یہ میرے حق میں بہتر تھا۔ ہوٹل میں کافی رش تھا۔ تھکے ماندے لوگ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ کچھ لوگ حقہ پی رہے تھے اور کچھ چائے اور کچھ لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ میں نے دور ہی سے محسوس کر لیا تھا کہ لوگ بڑے خوش و خروش باتیں کر

رہے ہیں۔ میں ایک ایسے بینچ پر جا بیٹھا جس کے قریب ہی ایک پلنگ پر ماما حسین اور ولی داد بیٹھے تھے۔ ولی داد' کریم چاچا کا بیٹا تھا اور ماما حسین چوہدری کا خاص آدمی تھا اور ان کے گرد بہت سے لوگ جمع تھے جو خاموشی سے ماما حسین کی باتیں سن رہے تھے۔ قریب جا کر پتا چلا کہ راجو کے اغوا اور اس کے ساتھیوں کے قتل کی اطلاع پھیل چکی ہے پولیس نے لاشیں اٹھا لی ہیں اور راجو کے اغوا کا ذمہ دار راجہ کو ٹھہرایا جا رہا ہے جو اب سے پہلے بھی اس گاؤں میں ڈاکے کی غرض سے آیا تھا اور پولیس کے بروقت اقدام کی وجہ سے اسے بھاگنا پڑا تھا' لوگ بڑے جوش و خروش سے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ وہیں سے پتا چلا کہ چوہدری تو جوان بیٹے کے اغوا کی خبر سن کر بستر سے لگ گیا ہے۔ حویلی میں کہرام مچا ہوا ہے اور پولیس بڑی شدت سے ڈاکوؤں کو کچل دینے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔

غلام رسول سپاہی اور اس کی بیوی کی وہاں موجودگی اور قتل کی وجہ سے لوگوں میں غصہ بھی پایا جا رہا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ سکینہ کو راجو اور اس کے ساتھی اٹھا کر لے گئے اور بعد میں غلام رسول نے ان سب کو مار دیا مگر راجو کو کون لے گیا یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بہرحال وہاں جب تک میں کھانا کھاتا اور چائے پیتا رہا۔ مجھے تمام حالات کا پتا چلتا رہا۔ میں نے وہاں سے اپنے لئے سگریٹ خریدے پھر بازار کی طرف چل دیا۔ میں نے بازار سے کھانے پینے کی کافی چیزیں خریدیں' مزید سگریٹ خریدے' چائے کی پتی اور خشک دودھ بھی لیا پھر میں گھومتا پھرتا حویلی کی طرف دیا۔ حویلی کے باہر کافی لوگ جمع تھے۔ چند پولیس کے جوان بھی نظر آ رہے تھے۔ میں قریبی مسجد میں چلا گیا۔ جہاں میں نے نماز پڑھی' خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور باہر چلا آیا۔ مسجد کے دروازے پر ہی مجھے بِلو مل گیا بِلو چوہدری کا خدمت گار تھا جو ہر لمحہ اس کے ساتھ ساتھ رہتا تھا' چوہدری کا حقہ بھرنا اور اسے ساتھ ساتھ لئے پھرنا اس کا کام تھا۔ میرے کام کے لئے اس سے بہتر کوئی نہیں تھا۔ اس لئے میں نے اسے روک کر پوچھا کہ یہاں کیا ہو گیا ہے اور حویلی کے باہر اتنے لوگ کیوں جمع ہیں۔ اس سے باتیں کرنے کا ایک مقصد بھی یہ تھا کہ وہ مجھے پہچانتا ہے یا نہیں۔

اس نے مجھے بالکل نہیں پہچانا بلکہ مجھے بابو جی کہہ کر مخاطب کرتا رہا اور اس نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ کیا ہو گیا ہے۔ ”اوہ تو اس کا مطلب ہے کہ چوہدری صاحب سے ملنا مشکل ہے؟“ میں نے بڑے شائستہ انداز میں کہا۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

"ہاں جی، وہ تو لگتا ہے بس اب اٹھ نہیں پائیں گے۔ دھلے ہوئے کپڑے کی طرح ہوگئے ہیں وہ، ڈاکٹر بیٹھا ہے ان کے کمرے میں اور کسی کو نہیں ملنے دیتا۔"

"اوہ یہ تو بہت غلط ہوگیا۔ میں تو شہر سے ان کے ایک دوست کا خط لایا تھا ان کے لئے .... خیر اب کیا ہو سکتا ہے!"

"نہیں جی آپ خط مجھے دے دیں میں موقع دیکھ کر دے دوں گا۔"

"اگر مجھے کاغذ اور پنسل مل جائے تو .... یہ لو یہ پیسے لے کر کہیں سے مجھے کاغذ اور پنسل لا دو۔" میں نے سو کا نوٹ نکال کر اسے دیا۔ "اور ہاں باقی پیسے تم رکھ لینا۔"

میرے دوسرے جملے نے اس میں بجلی بھر دی۔ اس کی باچھیں کھل گئیں اور وہ سر ہلا کر چھلاوے کی طرح غائب ہوگیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ واپس آئے گا۔ وہ بہت جلد واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں دو تین کاغذ اور پنسل تھی۔ میں مسجد کے باہر لگے پول کے نیچے بیٹھ گیا۔ میں نے چوہدری کو لکھا کہ جس طرح راجو کی یہ دو انگلیاں اس تک پہنچی ہیں انشاء اللہ اس کا بیٹا ٹکڑوں کی شکل میں اسے پورا واپس مل جائے گا۔ نیچے میں نے اپنا نام نہیں لکھا تھا بلکہ لکھ دیا تھا کہ تمہارا پرانا نمک خوار جسے تم نے خود نمک حرام بننے پر مجبور کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اگر عقل مند ہوگا تو سمجھ جائے گا کہ وہ نمک حرام کون ہے۔ میں نے وہ خط اسی پیکٹ میں رکھا جس میں راجو کی کٹی ہوئی انگلیاں تھیں اور ایک انگلی میں اس کی انگوٹھی بھی تھی تاکہ اسے بیٹے کی انگلیوں کو پہچاننے میں دشواری نہ ہو۔

میں نے وہ پولتھین بیگ اچھی طرح لپیٹا، اس پر ربر بیلٹ چڑھائی اور اسے بِلو کے حوالے کر دیا۔ وہ کسی سعادت مند بچے کی طرح میرے سامنے بیٹھا تھا میں نے اسے سگریٹ دی جسے اس نے تھوڑی سی پس و پیش کے بعد لے لیا پھر میں نے جیب سے پچاس کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"جی بِلو جی۔" اس نے پچاس کے نوٹ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بِلو .... دیکھو یہ جو پیکٹ ہے نا اس میں چوہدری صاحب کے لئے بہت خاص چیز ہے۔ ان کے دوست نے شہر سے بھیجی ہے اور مجھ سے کہا تھا کہ چوہدری کو اکیلے میں دینا۔ اب میں تو ان سے مل نہیں سکتا، مجھے شہر واپس جانا ہے، آخری لاری سے میں واپس لاہور جاؤں گا۔ تم مجھے بہت کام کے آدمی لگتے ہو، تم اسے اپنے پاس چھپا لو اور کسی وقت چپکے سے انہیں دے دینا کہ شہر سے کوئی آدمی لایا تھا۔

دیکھ میں تم پر بھروسا کر رہا ہوں دو چار روز کے بعد میں واپس آؤں گا۔ ٹھیک ہے نا .... اور ہاں تمہیں شہر سے کوئی چیز چاہئے ہو تو بتا دو .... تم اچھے آدمی ہو تمہارے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لاؤں گا۔"

میری باتوں نے اس کا نقشہ بدل دیا۔ وہ خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔ پچاس کا نوٹ لیتے ہوئے تو اس نے میرا ہاتھ چوم لیا۔ میں جانتا تھا کہ چوہدری اپنے غلاموں کو پیٹ بھر کر روٹی بھی نہیں دیتا ہے تبھی وہ اتنے بہت سے پیسے پا کر بے حد خوش تھا۔

"آپ فکر نہ کریں باؤ جی میں ایسے دوں گا کہ چوہدری کے فرشتوں کو بھی پتا نہیں چلے گا، وہ .... باؤ جی اگلے ماہ میری سگائی ہے، ریشم کا کپڑا لا دو تو دعائیں دوں گا .... بالوں میں لگانے والا پھول بھی لانا، جیسا وہ .... صبیحہ فلموں میں لگاتی ہے نا ویسا، رانی کو بہت پسند ہے ...." اس نے شرماتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے لا دوں گا، بس تم خیال رکھنا، کسی اور کے ہاتھ نہ لگے ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں جی فکر ہی نہ کرو۔" اس نے تھیلے کے پیکٹ کو اپنے کرتے کے نیچے صدری کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا اور میں اس سے اجازت لے کر چل پڑا پھر میں گلیوں گلیوں گھومتا ہوا، چھپتا چھپاتا گنے کے کھیتوں کے کناروں سے ہوتا ہوا پہاڑی کی جانب چل پڑا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد میں اسی غار تک پہنچ گیا اماں اور سلطان میرا شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ راجو کو نہ صرف یہ کہ ہوش آچکا تھا بلکہ اسے بھی پتا چل چکا تھا کہ وہ اپنی دو انگلیوں سے محروم ہو چکا ہے اور وہ اس وقت بلک بلک کر رو رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے چیخنا شروع کر دیا۔

"مار دو مجھے .... گولی مار دو مگر یوں تڑپا تڑپا کر تو نہ مارو ...."

"گولی مار دوں .... یہ دو انگلیاں تو میں نے اس جرم میں کاٹی ہیں چھوٹے چوہدری کہ تم نے اور تمہارے باپ نے مجھ پر جھوٹی چوری کا الزام لگایا تھا۔ ابھی تو میں اپنے اوپر تشدد کا بدلہ لوں گا، پھر .... صغرا کو اٹھا لے جانے کا، میری ماں اور میرے باپ کو دھمکانے کا، پھر صغرا کے پاکیزہ بدن کو اپنے ناپاک ہاتھوں سے چھونے کا، پھر اسے گولی مارنے کا، پھر میرے باپ کو قتل کرنے کا، ماں کو رسیوں سے جکڑنے کا، صغرا کی لاش کو نکالنے، اسے بازار میں پھرانے،

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

اس کی بے حرمتی کرنے کا اور ماں کو پاگل کرنے کا بھی اور ہاں............ مجھے دربدر کی ٹھوکریں کھلانے کا بدلہ' غلام رسول کے بھائی بھاوج اور پھر سکینہ کو اٹھانے کا اور............ اور سوہنی کو برباد کرنے کا اسے ہیروئن جیسے نشے کی عادت ڈالنے کا' اس کی موت کا............ اور............ اور............ سوچ راجو ابھی تیرے بدن کے کتنے ٹکڑے ہونے باقی ہیں تیری دو انگلیاں اس وقت تیرے باپ کے ہاتھ میں ہوں گی اسے تجھ سے بہت پیار تھا نا' اسی لئے میں نے اسے تیری انگلیاں بھجوا دی ہیں راجو' اس وقت وہ بہت خوش ہو گا چوم رہا ہو گا تیری ان خون آلود انگلیوں کو............ چوم رہا ہو گا۔" یہ کہتے کہتے میرے منہ سے ایک بھیانک قہقہہ ابل پڑا جو خود مجھے بھی بڑا خوفناک اور اجنبی لگا' یوں جیسے میں' میں نہ رہا ہوں بلکہ کسی خونخوار درندے میں بدل گیا ہوں۔

اماں اور سلطان مجھے حیرت سے تک رہے تھے۔ راجو خوف سے چپ ہو گیا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کا چہرہ بڑا خوفناک لگ رہا تھا' شاید مجھ سے بھی زیادہ' خوف نے اس کے چہرے کے نقوش بدل دیئے تھے۔

"بالے............ بالے............ پانی پی لے............ خود کو سنبھال بالے............"

سلطان نے میرے قریب آ کر سرگوشی کی اور پانی کا مگ میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں نے ایک ہی گھونٹ میں مگ خالی کر دیا اور نڈھال سا گھاس کے بستر پر گر گیا۔ اماں میرے چہرے سے پسینا پونچھنے لگی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے شاید وہ بھی اپنے بیٹے کی اس درندگی پر خوفزدہ تھی۔ میرے اندر ایک جنگ جاری تھی۔ میرا ضمیر مجھے کچوکے لگا رہا تھا مگر انتقام کے شعلے لپک لپک کر میرے وجود کو چاٹ رہے تھے۔

میں جانے کتنی دیر تک یونہی پڑا رہا۔ راجو کی سسکیاں غار میں گونج رہی تھیں' وہ بری طرح کراہ رہا تھا اور سلطان ایک کونے میں خاموش بیٹھا مجھے تک رہا تھا۔

"اماں............ تم چلو' میں تمہیں چک نمبر ستاون چھوڑ آتا ہوں۔" اچانک اس نے کہا۔

"نہیں سلطان............ میں جانتی ہوں تو کس خوف کی وجہ سے یہ کہہ رہا ہے پتر............ بالا میرا آخری سہارا ہے اس کے بغیر تو میں جی بھی نہ سکوں گی' اور............ اور مجھے معلوم ہے کہ اب کیا ہو گا۔ میں یہیں اس کے پاس مرنا چاہتی ہوں پتر............ مگر اسے چھوڑ

کر کہیں نہیں جاؤں گی۔"

"اماں............ سلطان ٹھیک کہتا ہے' تو نہیں ہو گی تو میں آسانی سے فرار ہو کر تجھ تک پہنچ سکتا ہوں ورنہ تیری موجودگی میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دے گی۔" میں نے اماں کو سمجھایا۔

"نہیں بالے............ میں نہیں جاؤں گی' میں اب ایک پل کو تجھے نہیں چھوڑوں گی بالے' تو اپنی ہی طرح میری موت کی پروا بھی نہ کر بالے' ہم مر گئے تو بھی یہ سکون لے کر مریں گے کہ ہم نے انسانوں کو درندوں سے بچا لیا ہے۔ وہ میرا گاؤں ہے بالے' میرے لوگ ہیں اور ان کتوں نے میرے لوگوں پر بڑے ظلم کئے ہیں' انہیں مار دینا ثواب ہے اور یہ ثواب میں ضرور کماؤں گی خواہ اس میں میری جان ہی چلی جائے۔"

اس کا انداز فیصلہ کن تھا اس لئے بحث بیکار تھی' وہ ٹھیک ہی کہتی تھی میرے بعد وہ تنہا کیسے جئے گی۔ "تجھے بھوک لگی ہے پتر؟" اماں نے میری پیشانی چومتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں اماں............!" میں نے صرف اس لئے کہا کہ اس طرح اماں بھی کھانا کھا لے گی۔ میری بات سن کر اماں نے میرا لایا ہوا سامان نکالا۔ کچھ دیر بعد ہم کھانا کھا رہے تھے۔

اب اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا میں کھانا کھا کر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ جب چوہدری کو راجو کی انگلیاں ملی ہوں گی تو کیسا کہرام مچا ہو گا۔ یہ خیال میرے لئے بڑا لذت آمیز تھا۔ بہرحال مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ پولیس راجہ کے شبے میں یہاں تک نہ پہنچ جائے۔ سلطان نے غلام رسول کی پستول لے لی تھی اس لئے اب میرے اور اس کے دونوں کے پاس ہتھیار تھے میں نے اپنی پستول نکال کر چیک کی۔ سلطان نے بتایا کہ غلام رسول کی پستول میں صرف ایک گولی ہے جبکہ میرے پاس کافی گولیاں تھیں۔

اماں نے راجو کو بھی کھانا کھلا دیا۔ اس کے دونوں ہاتھ کھول دیئے تھے مگر پاؤں اسی طرح بندھے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ تو زخمی تھا اس نے کسی نہ کسی طرح کھانا کھا لیا ظاہر ہے اسے سارا دن ہو گیا تھا۔ وہ بھوک اور پیاس سے پاگل ہو رہا تھا میں نے اماں کے معاملے میں دخل نہیں دیا حالانکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے کچھ کھانے کو دوں

اندر باہر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا البتہ کبھی کبھی راجو کے کراہنے کی آواز گونج اٹھتی تھی۔ اچانک اماں نے سوہنی اور ماسی میراں کے بارے میں پوچھ لیا اور وہ جاننا چاہتی تھی کہ میں

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

اتنے عرصے کہاں رہا۔ میں نے دھیرے دھیرے اسے تمام داستان سنا دی۔ سوہنی کے بارے میں سن کر اس کی آنکھوں میں نفرت کے شعلے نکلتے محسوس ہوئے۔ "اسے .... اسے مار دے "ہاں' ماردوں گا اماں' مگر ایک دم نہیں.......... آہستہ آہستہ.........." بالے اس حرامزادے کو جان سے مار دے۔" وہ چیخ اٹھی۔

"ہاں' ماروں گا اماں' مگر ایک دم نہیں.......... آہستہ آہستہ.........."

"تُو نے .... تُو نے ٹھیک کیا ہے اس کے ساتھ .... ورنہ میں تو سوچ رہی تھی کہ تُو ظالم ہو گیا ہے۔ ٹھیک کیا ہے تُو نے اب میں اس کے ٹکڑے کروں گی۔" وہ راجو کی طرف لپکنے لگی۔

میں نے اور سلطان نے اسے پکڑ لیا۔ "اماں.......... صبر کرو۔" ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ باہر سے آہٹ آئی تھی یوں جیسے کوئی کسی چیز سے ٹکرایا ہو۔ آواز اتنی واضح تھی کہ میرے علاوہ سلطان اور اماں بھی اچھل کر کھڑے ہو گئے تھے۔ سلطان نے ریوالور کا رخ غار کے دہانے کی طرف کر دیا۔ میں نے بھی اپنا پستول نکال لیا اور دبے پاؤں غار کے دہانے کی طرف سرکنے لگا۔

باہر نکلتے ہی ہمیں گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ میں چھلانگ لگا کر ایک بڑے پتھر کی آڑ میں ہو گیا۔ اسی وقت گولی چلی اور میرے بہت قریب سے سنسناتی ہوئی نکل گئی۔ اس وقت تک سلطان بھی پوزیشن لے چکا تھا۔ اماں گھبرا کر باہر نکلی تو مجھے چیخ کر اسے اندر جانے کو کہنا پڑا جس کے فوراً بعد ہی دوسری گولی چلی' میری آواز سے انہوں نے سمت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اماں اندر جانے کی بجائے چیختی ہوئی میرے قریب آ گئی۔

تم چاروں طرف سے گھیر لئے گئے ہو' خود کو پولیس کے حوالے کر دو ورنہ ...." کافی فاصلے سے کسی کے چیخنے کی آواز آئی۔

اور مجھے .... یوں لگا جیسے میں ہار گیا ہوں' جیسے میرے بدن سے میری روح دھیرے دھیرے نکل رہی ہو۔ میں گرفتار ہونے یا مرنے سے نہیں ڈرتا تھا بلکہ مجھے دکھ اس بات کا تھا کہ میں چوہدری سے بدلہ نہیں لے سکا۔ بہرحال میں نے خود کو سنبھالا۔

"کسی نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو میں راجو کو جان سے مار دوں گا اگر راجو کی جان عزیز ہے تو چوہدری کو میرے پاس بھیجو۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔

"تم کسی طرح بھی بچ نہیں سکتے' تم جو کوئی بھی ہو ہاتھ اٹھا کر سامنے آ جاؤ۔" جواباً کہا گیا۔

"میں جو کوئی نہیں .... بالا ہوں وہی بالا جس پر چوہدری نے چوری کا جھوٹا مقدمہ بنایا تھا' وہی بالا جس کی بہن کو پہلے اغوا کیا گیا پھر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا' وہی بالا جس کے باپ کو قتل کر دیا گیا۔ میں مرنے یا گرفتار ہونے سے نہیں ڈرتا انسپکٹر' مگر میں مرنے سے پہلے راجو کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ اگر اس کی زندگی چاہتے ہو تو اس کے باپ کو یہاں بھیجو' وہ مجھ سے اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگے' میری ماں کے قدموں میں گر کر معافی مانگے تب میں راجو کو بھی چھوڑ دوں گا اور خود کو بھی پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

"بالے .... تم ایسا نہیں کرو گے' میں انسپکٹر قادر ہوں .... تم جانتے ہو مجھے .... خود کو ہمارے حوالے کر دو' میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں رعایت دوں گا۔"

"مجھے چوہدری کے سوا کچھ نہیں چاہئے انسپکٹر اور مت بھولو کہ میرے پاس مہینے بھر کا راشن اور اتنا ہی اسلحہ موجود ہے' میں مرتے دم تک لڑوں گا مگر پھر تمہیں راجو زندہ نہ مل سکے گا۔" میں نے جھوٹ بولا۔ نہ میرے پاس اتنا راشن تھا' نہ اسلحہ اور سلطان کی طرف سے مجھے بے حد فکر تھی کیونکہ اس کے پستول میں صرف ایک گولی تھی۔

"نہیں .... نہیں بالے پُتر مجھے معاف کر دے پُتر.........." اچانک چوہدری کی آواز آئی۔ "اسے چھوڑ دے بالے' ورنہ اس کی ماں اس کے غم میں مر جائے گی۔"

"میرے سامنے آؤ چوہدری ...." میں نے چیخ کر کہا۔ مجھے چوہدری کی آواز سن کر بے پایاں خوشی ہوئی تھی۔ مجھے قطعی امید نہ تھی کہ وہ یہاں ہو گا۔

کچھ دیر کو سناٹا چھا گیا۔ میں نے اماں کو اندر جانے کو کہا اور سمجھایا کہ وہ راجو کا خیال رکھے بلکہ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دے اور اس کے ہاتھوں پر بندھی پٹی کو چیک کرے' ایسا نہ ہو کہ وہ خود کو آزاد کرا لے' یقیناً پولیس کی موجودگی سے اس کے حوصلے بلند ہو گئے ہوں گے۔ شکر ہے کہ اماں کی سمجھ میں بات آ گئی اور وہ جھکی جھکی دوبارہ غار میں داخل ہو گئی۔ سناٹے میں مجھے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ لوگ دائرہ تنگ کر رہے ہیں۔ اب میرا گرفتار ہونا یا مرجانا یقینی ہو گیا تھا۔ اس لئے میں گھٹنوں کے بل چلتا ہوا غار میں داخل ہوا۔ میں نے راجو کو بڑی بے دردی سے گھسیٹا اور اسے اسی طرح گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اس لئے وہ غوں غاں کی آوازیں نکالنے کے سوا کچھ

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

نہ کر سکا۔ میں اسے لئے ہوئے پھر اسی پتھر کے پیچھے آ چھپا۔ اماں بھی میرے ساتھ ہی تھی جبکہ سلطان مجھ سے کچھ فاصلے پر پتھروں اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپا بیٹھا تھا اور اس کی نگاہیں اس سمت جمی ہوئی تھیں جہاں کچھ دیر پہلے اس انسپکٹر کی آواز آئی تھی۔

"چوہدری میں تین تک گنوں گا اور پھر راجو کو گولی مار دوں گا۔" میں نے چیخ کر کہا مگر کوئی جواب نہ ملا تو مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ "ایک!" میں نے بلند آواز میں کہا اور راجو کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔ کپڑا منہ سے نکالتے ہی وہ چیخ اٹھا اور میں یہی چاہتا تھا۔

"بابا.......... بابا مجھے بچالو۔"

"دو..........!"

"نہیں .... نہیں بالے.......... راجو.........." چوہدری کے چیخنے کی آواز آئی اور میں چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد چوہدری گرتے پڑتے میرے سامنے آ گیا۔ "بالے .... اسے مت مارنا.......... میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں بالے ...." وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ ہمارے اور چوہدری کے درمیان تقریباً بیس پچیس قدم کا فاصلہ تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ چوہدری کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی تھی۔ اس کے سر پر نہ اونچا شملہ تھا' نہ چہرے پر دبدبہ' نہ مونچھیں اونچی تھیں نہ آنکھوں میں رعونت تھی۔ میں خوش تھا اسے یوں اپنے سامنے بیٹھا دیکھ کر' مگر میری خوشی اس وقت ختم ہو گئی جب اس کے پیچھے ہی انسپکٹر ریوالور تانے آ کھڑا ہوا۔

"خبردار انسپکٹر!" میں نے فوراً راجو کی کنپٹی پر پستول کی نال رکھ دی۔ "اگر قدم آگے بڑھایا تو.......... اپنے ساتھیوں سے کہو کہ وہ دور چلے جائیں۔"

"نہیں انسپکٹر نہیں .... چلے جاؤ تم لوگ میں .... میں.......... میں خود بالے کو منالوں گا۔ یہ بہت اچھا ہے انسپکٹر۔" چوہدری نے مجھے مکھن لگانے کی کوشش کی اس کا خیال تھا کہ میں اس کی باتوں میں آ جاؤں گا۔ اس نے مجھے زندگی کے علاوہ دولت کا بھی لالچ دیا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے سزا سے بچالے گا۔ مجھے اور میری ماں کو دنیا کی ہر چیز دے گا تاکہ میں سکھ کی زندگی گزار سکوں۔

"بالے ...." اچانک سلطان چیخا اور ساتھ ہی اس نے گولی چلا دی۔

میں اچھل پڑا اور اسی وقت میری پشت پر کسی کے چیخنے کی اور پھر کسی کے گرنے کی آواز آئی۔ غالباً وہ کوئی سپاہی تھا جو پشت سے مجھ پر وار کرنا چاہتا تھا۔ وہ شاید مرا نہیں تھا اس لئے کہ دوسری گولی چلنے کی آواز کے ساتھ ہی اماں کی دلخراش چیخ گونجی اور میرے وجود میں انگارے بھر گئے۔ میں نے اماں کے سینے سے ابلتے ہوا خون دیکھا اور پاگل ہو گیا۔ پھر میں نے اندھا دھند گولیاں چلانا شروع کر دیں۔ میرے پستول کی پہلی گولی راجو کی کھوپڑی میں اور دوسری چوہدری کے سینے میں اتر گئی تھی پھر مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوا؟ سلطان کب مر گیا اور میں کیسے گرفتار ہو گیا۔ بس اتنا یاد ہے کہ اچانک قیامت سی آ گئی تھی۔ پورا جنگل گولیوں کی آوازوں سے گونج اٹھا تھا اور بس..........

جب مجھے ہوش آیا تو کچھ بھی نہ تھا۔ نہ ماں تھی اور نہ سلطان' میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں' میں لاک اَپ میں بند تھا اور تھانے میں افراتفری مچی ہوئی تھی مگر میں مطمئن تھا۔ میں نے اپنا بدلہ لے لیا تھا اب مجھے کسی بات کی پروا نہیں تھی' میرے زندہ رہنے کے لئے تو اب کچھ بچا بھی نہ تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ میں اس وقت خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ آپ کو شاید یہ سن کر حیرت ہو کہ میں لاک اَپ میں ٹھنڈے فرش پر لیٹ کر ایسا بے سُدھ سویا کہ مجھے گھنٹوں پتا بھی نہ چلا۔

بس مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ اس بار میرے قریب کوئی نہ آیا۔ نہ کسی نے مجھ پر تشدد کرنے کی کوشش کی۔ وہ سب مجھ سے بے حد خوفزدہ تھے۔ مجھے اگلے روز ہی کوٹ لکھپت جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ راجو اور چوہدری کے قتل کے علاوہ مجھ پر غلام رسول' اس کی بیوی اور راجو کے تین ساتھیوں کے قتل کے الزامات بھی عائد کئے گئے' میں نے کسی بات سے انکار نہیں کیا' اس لئے کہ میں اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ میں مرنا چاہتا تھا اور بس۔

میں جانتا ہوں کہ مجھے پھانسی کی سزا ہو گی اور مجھے زندہ رہنا ہی کب ہے' کون ہے جس کے لئے زندگی کی تمنا کروں۔ بس ایک اطمینان سا ہے کہ اندھی رات کا یہ خوفناک سفر ختم ہونے ہی والا ہے۔ ہاں کبھی کبھی' جب میرے ساتھیوں کی ملاقاتیں آتی ہیں تو مجھے بہت سے لوگ یاد آتے ہیں۔

ابھی کچھ دیر پہلے رند نے مجھ سے پوچھا تھا کہ یار تیری نہیں آتی تو میں ہنس دیا تھا۔

COURTESY WWW.PDFBOOKSFREE.PK

”میرا کوئی نہیں ہے دوست.......... ملاقاتیں تو ان کی آتی ہیں جن کا کوئی ہوتا ہے۔“

”چار سو سنتالیس تمہاری ملاقات آئی ہے۔“ یہ آواز میرے لئے کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔

”میری..........؟“ میں نے حیرت سے سپاہی سے پوچھا۔ رند نے مجھے حیرت سے دیکھا۔

”ہاں..........“ وہ جواب دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

ہم سب ایک قطار کی شکل میں اس پنجرے نما کمرے میں پہنچ گئے جسے ملاقات کا کمرا کہا جاتا تھا۔ میں حیران تھا کہ مجھ سے ملنے کون آیا ہے' میرا تو کوئی بھی نہیں بچا اور پھر میں باریک جالی کے دوسری طرف فاریہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں واپس پلٹ آیا۔ اب اس سے مل کر کیا کروں گا۔ اس کے چہرے پر میں نے جس کیفیت کو محسوس کیا ہے اگر یہ کیفیت پہلے محسوس کر لیتا تو شاید..........

وہ جانے کس دل سے واپس گئی ہوگی۔ جانے اس نے کیا کیا سوچا ہوگا۔ جانے وہ کتنی روئی ہوگی مگر میں بھلا کیا کر سکتا ہوں۔ ایک ایسا شخص جو خود اپنی موت کا منتظر ہو بھلا دوسرے کے لئے کیا کر سکتا ہے' میں اس سے مل کر کیا کہتا' کیا کرتا..........؟

اب میں ہوں اور یہ کال کوٹھری.......... جہاں ہر لمحہ' ہر پل موت کی چاپ گونجتی رہتی ہے' موت دھیرے دھیرے میری طرف بڑھ رہی ہے۔ ممکن ہے جب آپ میری لکھی ہوئی یہ داستان پڑھ رہے ہوں تب تک میں اپنا یہ اندھا سفر طے کر چکا ہوں۔ میرے لئے مغفرت کی دعا ضرور کیجئے گا' خدا کی قسم میں برا نہیں تھا' اب بھی نہیں ہوں مگر.......... مجھے قاتل بنا دیا گیا۔ جانے اور کتنے لوگ ہوں گے جنہیں چوہدریوں اور وڈیروں نے قاتل اور لٹیرا بنایا ہوگا۔

کاش ایسا نہ ہوا کرے.......... کاش ایک انسان دوسرے انسان کی معصومیت کو قتل کر کے اسے درندہ نہ بنایا کرے' اگر میری یہ تمنا یہ دعا پوری ہو گئی تو میں سمجھوں گا کہ میری بہن کا' میرے باپ کا' میری ماں اور دوسرے دوست سلطان کا خون رائیگاں نہیں گیا۔ کاش مجھے موت سے پہلے یہ مژدہ سنا دیا جائے کہ ہمارے معاشرے کا وہ فرسودہ اور بے رحمانہ نظام ختم ہو گیا۔ کاش!“

=======☆ختم شد☆=======